سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

سوانح ــ افکار ــ تحریک

ابوآلافاق ایم۔ اے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
لاہور ـــ ڈھاکہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

سوانح ۔ افکار ۔ تحریک

ابوالآفاق ۔ ایم ۔ اے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

۱۶۔بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

طابع : اخلاق حسین، ڈائرکٹر

ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور

مطبع : کنول آرٹ پریس، لاہور

اشاعت :

پہلی جولائی ۱۹۷۱ء ۲۰۰۰

قیمت

اعلیٰ ایڈیشن ۱۲/- } ۱۳/۲۵ روپے
پلاسٹک کور ۱/۲۵

فہرست ابواب

باب ۱	مولانا مودودی	۱۹
باب ۲	ابوالاعلیٰ	۴۵
باب ۳	ایڈیٹر	۶۷
باب ۴	الجہاد فی الاسلام	۸۹
باب ۵	ترجمان القرآن	۱۰۵
باب ۶	کانگرس اور مسئلہ قومیت	۱۲۳
باب ۷	دارالاسلام	۱۴۳
باب ۸	ادارۂ دارالاسلام	۱۶۳
باب ۹	پروفیسر	۱۷۷
باب ۱۰	تجدید و احیائے دین	۱۹۵
باب ۱۱	جماعتِ اسلامی (۱)	۲۱۳
باب ۱۲	جماعتِ اسلامی (۲)	۲۳۱
باب ۱۳	قافلۂ راہِ حق	۲۴۷
باب ۱۴	مخالفت کا آغاز	۲۶۹
باب ۱۵	تفہیم القرآن	۲۸۷
باب ۱۶	کُل ہند اجتماع	۳۰۱

باب ۱۷	پاکستان	۳۱۷
باب ۱۸	ہجرت	۳۳۵
باب ۱۹	مطالبہ نظامِ اسلامی	۳۵۱
باب ۲۰	طوفان کے آثار	۳۶۷
باب ۲۱	سنٹرل جیل ملتان	۳۸۳
باب ۲۲	قراردادِ مقاصد	۳۹۹
باب ۲۳	سُود	۴۱۳
باب ۲۴	اجتماع علمائے امت	۴۲۷
باب ۲۵	انتخابات	۴۴۵
باب ۲۶	مطالبہ دستورِ اسلامی	۴۵۹

فہرست

سخنے چند ۱۴

حصہ اول :- دعوت و تبلیغ ۱۷

باب ۱ :- مولانا مودودی ۱۹

مولانا مودودی کا قصور ۲۳

سزائے موت ۲۷

سوئے دار ۳۲

میں رحم کی درخواست نہیں کروں گا ۳۷

روشنی کا مینار ۴۱

باب ۲ :- ابُوالاعلیٰ ۴۵

آباؤ اجداد ۴۵

ابُوالاعلیٰ ۴۹

بچپن ۵۲
ابتدائی تعلیم ۵۵
والد صاحب کی رحلت ۶۰
محنت اور ذاتی مطالعہ ۶۲

باب ۳:- ایڈیٹر ۶۷
تحریکِ خلافت ۶۷
ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی ۷۲
ہجرت کی تحریک ۷۶
الجمعیتہ کے ایڈیٹر ۷۸
ترجمہ و تالیف کا کام ۸۳
"میرا جذبہ ناکام نہ جائے گا" ۸۶

باب ۴:- الجہاد فی الاسلام ۸۹
پس منظر ۸۹
جہادِ اسلامی کی حقیقت ۹۳
سیّد مودودی کا اوّلیں شاہکار ۹۸

باب ۵:- ترجمان القرآن ۱۰۵
تحریک مجاہدین ۱۰۵
المیۂ بالاکوٹ ۱۰۸
ترجمان القرآن ۱۱۱
رسالہ نہیں، مشن اور پیغام ہے ۱۱۴

یہ تحریک اسلامی کے ارتقا کی داستان ہے ۱۱۷

باب ۶ :- کانگریس اور مسئلہ قومیت ۱۲۳

سلسلہ "سیاسی کشمکش" کا پس منظر ۱۲۳

کانگریس کی حقیقت ۱۲۶

آزادیٔ ہند اور مسلمان ۱۲۹

مسئلۂ قومیت ۱۳۴

فتنۂ قومیت ۱۳۶

ردِّ عمل ۱۳۹

باب ۷ :- دارالاسلام ۱۴۳

رسالہ دینیات ۱۴۳

خانگی زندگی ۱۴۶

پانچ دریاؤں کی سرزمین نے پکارا ۱۴۷

علامہ اقبالؒ اور سید مودودی ۱۵۰

دارالاسلام کا تخیل ۱۵۳

دارالاسلام ۱۵۷

باب ۸ :- ادارۂ دارالاسلام ۱۶۳

دارالاسلام کی بستی ۱۶۳

خطبات ۱۶۷

دارالاسلام کی یادیں ۱۶۸

ادارۂ دارالاسلام ۱۷۲

باب ۹:- پروفیسر ۱۷۷

سیّد مودودی اور علمائے کرام ۱۷۷

لاؤڈ سپیکر کے بارے میں فتویٰ ۱۸۰

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کردیا میرا ۱۸۵

پروفیسر ۱۹۰

باب ۱۰:- تجدید و احیائے دین ۱۹۵

کارِ تجدید کی نوعیت ۱۹۵

مجددِ کامل کا کام ۱۹۸

کیا سیّد مودودی امام مہدی ہیں؟ ۲۰۱

تاریخ تجدید کا تنقیدی مطالعہ ۲۰۶

حصّہ دوم :- تنظیم اور ہجرت ۲۱۱

باب ۱۱:- جماعت اسلامی (۱) ۲۱۳

آوازِ رحیلِ کارواں ۲۱۳

۲۵ اگست ۱۹۴۱ء - لاہور ۲۱۷

جماعت اسلامی ملّت سے الگ فرقہ نہیں ہے ۲۲۰

ایک دلچسپ بحث ۲۲۳

طریق کار ۲۲۵

رسم تجدید ایمان ۲۲۷

باب ۱۲:- جماعت اسلامی (۲) ۲۳۱

زمانہ اپنے براہیم کی تلاش میں ہے ۲۳۱

امیر جماعت کی حیثیت سے پہلا خطاب ۲۳۵

آئندہ لائحۂ عمل ۲۳۸

جماعت اسلامی کا مزاج ۲۴۰

جماعت اسلامی کی قوت ۲۴۲

باب ۱۳:- قافلۂ راہِ حق ۲۴۷

آغازِ کار ۲۴۷

تنظیم و تربیت ۲۴۹

چودھری علی احمد خاں ۲۵۳

بہترین کارکن ۲۵۵

مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کا بانی ۲۵۸

قافلۂ راہِ حق ۲۶۰

جنگِ عظیم دوم ۲۶۲

اداریہ جو سنسر کی نذر ہو گیا ۲۶۵

باب ۱۴:- مخالفت کا آغاز ۲۶۹

پیر دار الاسلام ۲۶۹

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی آمد ۲۷۱

شکوک و شبہات ۲۷۳

سیّد صاحب کا تاریخی خط ۲۷۶

پہلا بحران ختم ہوا ۲۷۹

مخالفت کا آغاز ۲۸۱

بہتان ۲۸۴

باب ۱۵:- تفہیم القرآن ۲۸۷

آئندہ نسل کا حق ۲۸۷

قرآن فہمی کے اصول ۲۹۱

اس صدی کی ایک عظیم تصنیف ۲۹۵

باب ۱۶:- کُل ہند اجتماع ۳۰۱

دارالاسلام ۳۰۱

میاں طفیل محمد صاحب ۳۰۴

تعلیمات ۳۰۶

ایک اہم استفتاء ۳۱۰

کُل ہند اجتماع ۳۱۲

باب ۱۷:- پاکستان ۳۱۷

قرارداد پاکستان ۳۱۷

سیّد مودودی اور نظریہ پاکستان ۳۲۰

اعلانِ پاکستان ۳۲۴

حلقہ وار اجتماعات ۳۲۹

باب ۱۸:- ہجرت ۳۳۵

فسادات ۳۳۵
دارالاسلام کیمپ ۳۳۸
ہجرت ۳۴۱
مرکز ۳۴۶

حصہ سوم: آزمائش کا مرحلہ ۳۵۱

باب ۱۹: مطالبہ نظامِ اسلامی ۳۵۱
فیصلہ کن اقدام ۳۵۵
اسلامی قانون اور اس کا نفاذ ۳۶۰
مطالبہ نظامِ اسلامی ۳۶۳
شاہ ضرب ۳۶۷

باب ۲۰: طوفان کے آثار ۳۶۷
جھوٹے بہتان ۳۶۷
جہادِ کشمیر کا مسئلہ ۳۷۱
طوفان کے آثار ۳۷۴
مولانا معین الدین صاحب ۳۷۷

باب ۲۱: سنٹرل جیل ملتان ۳۸۳
قائدِ اعظم کی رحلت ۳۸۳
سقوطِ حیدر آباد دکن ۳۸۵

گرفتاری ۳۹۰
سنٹرل جیل ملتان ۳۹۳

باب ۲۲: قراردادِ مقاصد ۳۹۹
چار نکاتی مطالبہ ۳۹۹
قراردادِ مقاصد ۴۰۲
اہم نقطہ انقلاب ۴۰۶
توسیع نظر بندی ۴۱۰

باب ۲۳: سُود ۴۱۳
حکومت کو چیلنج ۴۱۳
جیل کے لیل و نہار ۴۱۵
سُود کے بارے میں اسلامی احکام ۴۱۸
اصلاح کی کوشش ۴۱۹
سود کے بغیر بنک کاری ۴۲۱
رہائی ۴۲۵

باب ۲۴: اجتماع علمائے امت ۴۲۷
بنیادی اصولوں کی رپورٹ ۴۲۷
دستوری سفارشات پر تنقید ۴۳۰
انتخابات میں نیا تصور ۴۳۳
موسمِ انتخابات کے معترضین ۴۳۷
علمائے اُمت کا اجتماع ۴۴۰

باب ۲۵ : انتخابات ۴۴۵

منشور جماعت اسلامی ۴۴۵

انتخابی جلسے ۴۴۷

انتخاباتِ پنجاب ۴۴۹

انتخاباتِ سرحد ۴۵۲

کہ یک زبان ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف ۴۵۴

باب ۲۶ : مطالبۂ دستورِ اسلامی ۴۵۹

اجتماع کراچی ۴۵۹

ہدایات ۴۶۲

لادینی دستور کی کوشش ۴۶۵

مطالبۂ دستورِ اسلامی ۴۷۰

۲۱ نومبر کا مظاہرۂ کراچی ۴۷۳

گرفتاری ۴۷۶

کتابیات ۴۸۰

سخنے چند

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، عالمِ اسلام کی اُن چند نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے افکار، نظریات اور سیرت و کردار سے کروڑوں افراد کو متاثر کیا ہے اور ان کے ذہنوں اور زندگیوں میں حقیقتاً انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے اسلام کو ایک علمی اور عملی تحریک کے طور پر جس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے اس کی وجہ سے آپکو عالمِ اسلام میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ بلا مبالغہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں سب آپ کو اپنا محبوب و محترم راہنما سمجھتے ہیں۔ ہر شخص خواہ موافق ہو یا مخالف، ایسی جامع اور محبوب شخصیت کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے، اس کی سیرت و کردار سے واقف ہونے اور اس کے افکار و نظریات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے مشتاق ہے۔ اس ہی ضرورت کے پیش نظر متعدد حضرات نے مولانا محترم کے حالاتِ زندگی پر مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ کسی نے صرف تعارف کو لیا، کسی نے صرف اپنے جذباتِ عقیدت کا اظہار کیا، کسی نے صرف آپ کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا، کسی نے اپنے بغض و عناد کا مظاہرہ کیا اور کسی نے صرف آپ کے مختصر حالاتِ زندگی کو پیش کیا ہے، لیکن ابھی تک ایسی کوئی جامع کتاب سامنے نہیں آئی ہے جس میں آپ کے افکار و نظریات، آپ کی علمی اور نجی زندگی، آپ کی عملی جدّ و جہد اور برپا کردہ تحریک کا بھرپور نقشہ پیش کیا گیا۔

مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے محترم دوست ابوالآفاق صاحب اس طرف متوجہ ہوئے اور نہایت تلاش و تحقیق کے بعد مولانا محترم کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ایک نہایت جامع اور بلند پایہ کتاب پیش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مستند کتاب ثابت ہو گی۔

یہ کتاب مولانا محترم کی پیدائش سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ضخامت موجودہ صفحات سے زائد کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اس لیے اس کتاب کو دو حصّوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ اگلے سالوں کے واقعات دوسرے حصّے میں پیش کیے جائیں گے۔ چونکہ مسوّدہ کی ترتیب و تالیف ابھی جاری ہے اس لیے ہم ممنون ہوں گے کہ جو حضرات مولانا محترم سے متعلق مستند مواد یا معلومات رکھتے ہوں وہ براہِ راست ناشر کو بھیج دیں تاکہ اگلے حصّے کی تالیف میں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

جس طرح ہمیں یہ سعادت حاصل ہے کہ مولانا محترم کی جملہ تالیفات ہم نے شائع کی ہیں اسی طرح ہمیں یہ سعادت بھی حاصل ہو رہی ہے کہ ہم آپ کے حالاتِ زندگی شائع کریں۔ ہم اپنی روایات و معیار کے مطابق اس کو نفیس طباعت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے اور اس کی اشاعت میں حسبِ سابق ہم سے تعاون فرمائیں گے۔

لاہور۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ
مطابق ۱۴ جون ۱۹۷۱ء

اخلاق حسین
ڈائرکٹر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں، بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشاں

یہ رازِ کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

فطرت کا سرودِ ازلی، اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا، صفتِ سورۂ رحمان

اقبالؔ رح

حصّہ اوّل

دعوت و تبلیغ

اُس کا مقامِ بلند، اُس کا خیالِ عظیم
اُس کا سُرور، اُس کا شوق، اُس کا نیاز، اُس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دلِ بے نیاز

اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب، اُس کی نِگاہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جُستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دِل و پاک باز

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خُدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عِشق کا حاصِل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

اقبالؒ

باب ۱

مولانا مودودی

مشرق سے ستارۂ سحر نمودار ہو رہا ہے!

چاروں طرف ایک گہرا سکوت طاری ہے پوری فضا خاموش ہے۔ لوگ اپنے اپنے بسترِ استراحت میں محوِ خواب ہیں۔ وہ گہری نیند میں ہیں کہ چوکیدار کی کبھی کبھار بلند ہونے والی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ رات کی خنکی اور بھی بڑھ گئی ہے اس لیے وہ نرم بستروں میں مدہوش پڑے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ ۲۸ مارچ ۵۳ء کے طلوعِ خورشید سے پہلے پہلے رات کے اس آخری حصے میں کون سا اہم واقعہ ہونے والا ہے۔ لیکن آسمان پہ ستاروں کو شاید معلوم تھا کیونکہ وہ بیقراری سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو یہی لگتا کہ وہ جھلملا رہے ہیں۔

لاہور کی فیروز پور روڈ نامی چوڑی سڑک کے اچھرہ موڑ کے پاس ایک جیپ مشرقی سمت کی گلی میں مڑی تو اس نے اپنے سامنے روشنی میں دیکھا کہ ذیلدار پارک کی کشادہ گلی خالی پڑی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ساری جیپ گاڑیاں اور ٹرک ہو لیے۔ تھوڑی دور آگے جا کر ایک کوٹھی کے سامنے پہلی جیپ رک گئی اس میں سے ایک افسر باہر نکلا۔ اس نے

اشارے سے باقی ٹرکوں اور جیپوں کو کوٹھی کے اردگرد پھیل جانے اور حسبِ پروگرام پوزیشن سنبھال لینے کا حکم دیا۔ اس افسر نے دیکھا کہ کوٹھی کا لان اور سبزہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ہر طرف خاموشی کا راج تھا کوٹھی کے دائیں جانب کے بغلی کمرے میں یحییٰ صاحب اور فقیر حسین صاحب لحاف لیے ہوئے محوِ خواب تھے۔ لیکن اب فوجی ٹرکوں اور جیپوں کے شور سے ان کی آنکھ کھل چکی تھی انہوں نے اٹھ کر برآمدے کا بلب روشن کیا پھر مڑ کر باہر ایک ایسا منظر دیکھا جس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

یحییٰ صاحب نے دیکھا کہ کوٹھی کے تین جانب فوجی ٹرک مولانا مودودی کی کوٹھی کو گھیرے ہوئے ہیں ان میں فوجی جیپیں بھی ہیں۔ کچھ فوجیوں نے سنگین چڑھائی ہوئی رائفلیں سنبھال رکھی ہیں اور وہ کوٹھی کے گرد اگرد مستعد کھڑے ہیں۔ اتنے میں سی آئی ڈی اور فوج کے کچھ افسران ہاتھوں میں کچھ کاغذات لیے کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔ اس وقت اور اس انداز میں خفیہ پولیس اور فوج کے گھیرے سے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کسی خطرناک مجرم کو اس کی کمین گاہ سے گرفتار کرنے آئے ہیں جس سے مسلح مقابلے کی امید ہے۔ شاید اس کے ساتھی بھی جواب میں رائفلیں تھام لیں یا گولہ بارود کا استعمال کریں۔ لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں وہ جس پنچھی کو گرفتار کرنے آئے ہیں اسے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ وہ راہِ حق کی جس فضا میں پرواز کرتا ہے اس میں مخالفتیں، کفر کے فتوے، زنجیریں اور ہتھکڑیاں، قید و بند اور ظلم و جبر تو ہوتا ہی ہے کبھی کبھی پھانسی کے تختے بھی ان کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

ان افسروں نے یحییٰ صاحب سے پوچھا کہ مولانا مودودی موجود ہیں؟ ابھی انہوں نے اثبات میں جواب دیا تھا اور ان کے دل میں بے شمار وسوسے کروٹیں لینے لگے تھے کہ دروازے کے اندر کی طرف سے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ افسران اس لمحے کے لیے تیار ہو رہے تھے جس کے ردِ عمل کو جاننے کے لیے وہ بے چین ہو رہے تھے۔ کیا ملزم مدافعت کرے گا؟ کیا تھوڑی دیر بعد خون خرابہ ہو گا؟ کیا انہیں گرفتاری عمل میں لانے کے لیے فوجی طاقت کو حرکت میں لانا ہو گا؟ یحییٰ صاحب اور فقیر حسین صاحب پریشان صورت کھڑے تھے کوٹھی کے اردگرد

کھڑی ہوئی جیپوں میں موجود اور گھیرا ڈالے ہوئے مستعد فوجیوں کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ دیکھیں یہاں سے کون نمودار ہوتا ہے جہاں ان کے افسروں کی نگاہیں مرکوز ہیں پھر دروازہ کھُل گیا اور ایک شخص نمودار ہوا۔

یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے!

جنہیں عرفِ عام میں مولانا مودودی کہا جاتا ہے جو اسلام کے مذہبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں پر ۷۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں جو قرآن، حدیث، فقہ کے ساتھ ساتھ عمرانی مسائل، فلسفہ، معاشیات اور علم سیاسیات کے ایک متبحر عالم ہیں۔ جنہوں نے اپنی دلآویز شخصیت، دل نشین طرزِ انشا اور دلکش اسلوبِ تحریر سے مسلمانوں کو بھُولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو اپنی حرارتِ ایمانی سے گرما دیا ہے اور ان کے دلوں میں واضح اسلامی نصب العین ——— عملاً حکومتِ الٰہیہ اصلاً رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی ——— کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ ان کے افکار نے پاکستان ہندوستان اور عالمِ اسلام کے کروڑوں لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا ہے جن کے پُرزور دلائل کے سامنے تہذیبِ حاضر کے افکار کی سربفلک عمارت زمین بوس ہوتی نظر آتی ہے اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ایمان راسخ ہو رہا ہے جن کے افکار کا اثر زندگی اور ادب کے ہر شعبے میں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے جدید انداز کی ایک سائنٹفک مذہبی اور سیاسی جماعت بنا کر اسے ایسا عمدہ ڈسپلن دیا ہے کہ جس سے ایک عام مسلمان کو اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی اُمید بندھتی ہے اور جسے مخالفین بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہمیشہ ہی تلملاتے دیکھے گئے ہیں۔ اور جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے دلوں کی سب سے بڑی خواہش یعنی اتحادِ عالمِ اسلامی کی واحد مؤثر شخصیت ہیں۔

فوجی افسر نے اخلاقاً سلام میں پہل کی اور اس وقت دوسرے افسر نے بات چھیڑی۔ معذرت چاہتے ہوئے اس نے بتایا کہ مولانا کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا جا رہا ہے اور اب وہ زیرِ حراست ہیں۔ مولانا نے یہ سُن کر صرف اتنا کہا ——— "اچھا" اس اطمینانِ قلب کے ساتھ جس کی ان افسروں کو توقع نہیں تھی۔ انہیں تو خیال تھا کہ ملزم یکدم قفس میں

جکڑ لیا جاتے گا تو پھڑ پھڑائے گا اور تلملائے گا۔ مولانا نے کہا کہ اگر وہ تھوڑا سا وقت دیں تو وہ تیار ہو لیں۔ افسرِ اعلیٰ نے ایک لمحہ توقف کیا، سوچا اور پھر اجازت دے دی۔ لیکن ساتھ ہی پولیس افسر نے مولانا کو وارنٹ دکھائے کہ وہ ان کے گھر کی اور مرکزی جماعت اسلامی کے دفتر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ مولانا نے فقیر حسین صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اس کام میں مدد دیں گے اور خود اندر چلے گئے۔

پولیس اور سی آئی ڈی گھر اور دفتر کی تلاشی میں مصروف ہو گئی۔ دفتر میں سے انہوں نے جماعت اسلامی کی خصوصی فائلیں، حسابات کی رسید بکیں اور رجسٹر، مرکزی شوریٰ کے اجلاسوں کی کارروائی کا رجسٹر اور دوسرے بہت سے کاغذات اکٹھے کر کے ڈھیر لگا لیا۔ بیت المال کے دس ہزار تین سو روپے قبضے میں کیے، فوجی افسر اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھے دیکھتے رہے۔ پونے چار بجے صبح تک یہ تلاشی کا کام جاری رہا۔ اتنے میں مولانا مودودی بھی تیار ہو کر باہر تشریف لے آئے، آپ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اونچی باڑ والی مخصوص قراقلی ٹوپی پہنی ہوئی ہے، وہ سفید تنگ پاجامے اور شیروانی میں ملبوس ہیں۔ ان کا دوہرا جسم ان کے میانہ قد کو چھپاتے ہوتے ہے۔ موٹے موٹے خدوخال، سرخ و سپید گوری رنگت اور کشادہ گول چہرے پر کھلی پیشانی ان کی ذہانت و شرافت، وسیع ظرفی اور حسن خلق کی غمازی کر رہی ہے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی سفید بُرّاق داڑھی ان کے چہرے کو نورانی بنا رہی ہے۔ ٹوپی کے نیچے کالے بالوں کی بھیگی ہوئی لٹیں بتا رہی ہیں کہ وہ ابھی غسل کر کے آئے ہیں گویا کسی سفر کے لیے تیار ہو کر نکلے ہیں۔

آتے ہی انہوں نے کہا کہ مَیں تیار ہوں —— ان کا مطمئن اور شگفتہ چہرہ مردِ مومن کی عملی تفسیر تھا۔ سی آئی ڈی نے تلاشی کے مالِ غنیمت کو اپنے ساتھ رکھا۔ مولانا بھی جیپ میں سوار ہو گئے۔ ان کے بچے اور ساتھی انہیں ایک نئی منزل کی طرف جاتے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مولانا کو لے کر یہ قافلہ روانہ ہوا تو سپیدۂ سحر صاف ہونے لگا، آسمان پہ ابھی بہت سے ستارے جھلملا رہے تھے، ان کے ہلتے ہوتے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ ایک ستارے نے قریب والے ستارے سے

آہستہ سے کہا "حق و باطل کی آویزش میں ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ دیکھو! یہ مردِ حق آگاہ کتنی فراخ حوصلگی سے سوئے دار بڑھ رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا "صیادوں کی یہ خام خیالی ہے کہ وہ اس عظیم المرتبت انسان کو اس کے نصب العین سے ڈگمگا سکتے ہیں" ـــــــ لیکن ذرا دور چمکنے والے ستارے نے بڑے پتے کی بات کہی "ابتلاء و آزمائش ہی کی بھٹی بتلا سکتی ہے کہ علمائے حق کون ہیں اور پھر دار و رسن تو عظمت کی سیڑھیاں ہیں، اس کے صیاد نہیں جانتے کہ وہ مودودی کو ایک تاریخ ساز شخصیت بنانے کے لیے لے جا رہے ہیں"۔

مولانا مودودی کا قصور

مولانا مودودی کو کس قصور کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اس سے اربابِ اقتدار کا پورا طائفہ واقف تھا۔ اسی شخص نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ ملک کا دستور اسلامی بناؤ پھر اس تحریک کو لے کر اس نے پاکستان کے بچے بچے کو یہ شعور دے دیا کہ ملک و قوم کے لیے دستور ایک سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مطابق قوانین، نظامِ تعلیم، معاشرت، معیشت اور سیاست کی ڈگر متعین ہوتی ہے۔ اس شخص نے اہلِ علم حضرات سے منوا لیا کہ قرآن اور حدیث میں سے ایک جدید اسلامی ریاست کے دستور کے لیے رہنما اصول حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پھر اس شخص نے جماعتِ اسلامی کی تنظیم کے زور سے اس مطالبے کو ملک گیر بنا دیا حتیٰ کہ اربابِ اقتدار کو قراردادِ مقاصد پاس کرتے ہی بنی۔ اس سے بھی بڑھ کر شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث غرض ہر مذہبی مکتبِ خیال کے جیّد علماء کو اس شخص نے اسلامی دستور کے بائیس بنیادی نکات پر جمع کر دیا تھا اور اب وہ اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اسلامی دستور میں اس مختصر مغرب زدہ عیاش اور راگ و رنگ کے دلدادہ طبقے کو اپنی موت نظر آتی تھی، جو انگریز کے چلے جانے کے بعد پاکستان میں برسرِ اقتدار آگیا تھا اور اب اس قومی امانت کو آمریت میں بدل رہا تھا اُن کے راستے میں مودودی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ چنانچہ تحریک ختمِ نبوت کے بہانے "ختمِ مودودی" کا تہیہ کر لیا گیا۔

حکومت کسی طرح سید مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی پر یہ الزام لگانا چاہتی

تھی کہ انہیں کسی بیرونی ملک سے روپیہ ملتا ہے۔ شاہی قلعہ لاہور میں جہاں اکثر اسیرانِ مارشل لاء کو رکھا گیا، چراغ دین صاحب سے مولانا مودودی کے ذاتی حسابات معلوم کیے گئے۔ حسابات بالکل ٹھیک نکلے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو بھی قلعہ لاہور میں لایا گیا ان سے جماعت کی تنظیم اور پھر ختم نبوت کی تحریکِ راست اقدام کے بارے میں جماعت کی پالیسی جاننے کے لیے سوالات کیے گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ جماعت اِسلامی کو کس ملک سے مدد ملتی ہے۔ انہوں نے سختی سے اس الزام کا انکار کیا تو افسروں نے اسی سوال کو بار بار بدل کر مختلف طریقوں سے پوچھا۔ آخر اصلاحی صاحب نے ڈانٹ پلائی کہ یہ فضول اور لغو سوال ہے۔ پھر جب سیّد مودودی صاحب کو اسی قلعہ لاہور میں لایا گیا اور ان سے یہی سوال کیا گیا کہ آپ کو کس ملک سے امداد ملتی ہے تو انہوں نے نرمی سے جواب دیا کہ انہیں کسی بیرونی ملک سے امداد نہیں ملتی یہ سوال پوچھ پوچھ کر انہیں زچ کر دیا گیا۔ لیکن وہ اس تکرار سے نہ تو چڑ سکے، نہ پریشان ہوئے اور نرمی سے جواب دیتے رہے۔ ایک طرف اصلاحی صاحب کے جواب میں جلال کی انتہا اور دوسری طرف سیّد مودودی صاحب کے جواب میں جمال کا کمال دیکھ کر تحقیقاتی افسروں کو بھی شک ہو گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ بالآخر انہوں نے نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کا پروگرام بنایا[1]

سیّد مودودی صاحب کو میانوالی جیل میں قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا، مسلسل تین ہفتوں تک انہیں کسی انسان سے نہ ملنے دیا گیا۔ روشنی کی ایک کرن بھی ان کے زندان میں نہ گئی، اتنی ذہنی اذیت دینے کے بعد یک دم ایک رات کو انہیں باہر نکالا، میز پر انواع و اقسام کے لذیذ مرغن کھانے چُن دیئے گئے، انہیں مجبور کر کے زیادہ سے زیادہ کھلانے کی کوشش کی انہیں شاید یہ خیال تھا کہ یہ بھی روایتی مولوی کی طرح اچھے کھانے پر ٹوٹ پڑے گا۔ جس سے اس کی طبیعت بوجھل ہو جائے گی تو ساری چستی کافور ہو جائے گی۔ پھر سید مودودی کی آنکھوں کے سامنے تیز روشنی جلائی گئی تاکہ آنکھیں چندھیا جائیں اور ذہن شل ہو جائے۔ اب ایک

---

[1] چراغ راہ احتجاج نمبر۔ اکتوبر ۵۳ء ص ۹

افسر نے ادھر سے سید صاحب سے سوال کیا! ابھی انہوں نے جواب دینا شروع کیا ہی تھا کہ تڑاخ سے دوسرے افسر نے اپنا سوال داغ دیا کہ آپ اتنے ٹھاٹھ دار اجتماعات کیسے کر لیتے ہیں؟ ابھی وہ سوال ختم بھی نہیں کر سکا تھا کہ تیسرے نے کہا مولانا آپ کو امریکہ سے روپیہ ملتا ہے نا؟ لیکن ان کی طبیعت میں وہی سکون تھا۔ انہوں نے اس اعصاب شکن ماحول سے قطعی اثر نہ لیتے ہوئے اور مرعوب ہوئے بغیر تمام سوالوں کا پورے سکون سے جواب دیا۔ یوں اس بحرانی موقعے پر بھی یہ لوگ انہیں ڈگمگا نہ سکے اور سیّد مودودی صاحب اعصابی جنگ میں فتح مند اور مظفر و کامران نکلے[۱]

یہ مکروہ الزام اس کے بعد کی حکومتیں بھی سیّد مودودی صاحب پر لگاتی رہیں مخالفین نے جب کبھی جماعت اسلامی پر کیچڑ اُچھالنی چاہی تو وہ یہ بے بنیاد الزام لگاتے ہوئے کبھی باک محسوس نہیں کرتے کہ ثبوت کے بغیر دعویٰ کرنا اسلامی قانون تو کیا دنیا کے ہر قانون میں غلط ہے۔ خیر وہ بیچارے تو ناقص المعلومات ہیں۔ حکومت کے ہاتھ میں تو جماعت کے حسابات اور پورا ریکارڈ موجود تھا، پھر اس کی خفیہ پولیس جماعت کے اراکین اور اس کے ہمدرد، طلباء، وکیل اور تاجروں کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔ بنکوں پر حکومت کی پوری گرفت تھی۔ اگر جماعت اسلامی کو غیر ملکی حکومتوں سے روپیہ ملتا ہوتا تو سب سے پہلے حکومت کو اس کا علم ہوتا۔

دراصل جماعت اسلامی سے حسد میں مبتلا لوگ، جب جماعت اسلامی کے عظیم الشان اجتماعات دیکھتے ہیں، اتنا زبردست لٹریچر ہر ہاتھ میں پہنچتے ہوئے پاتے ہیں۔ جلسے، جلوس، تقریبات، نئی نئی مہمیں، تربیت گاہیں، دفتروں اور اس کے عملے، استقبالیے اور عوامی خطابات دیکھتے ہیں جن میں عربی مدرسوں کی سالانہ کانفرنسوں کے برعکس چندے کی ایک اپیل بھی نہیں کی جاتی، تو وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ ان سب باتوں کے لیے تو بلا مبالغہ لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ یہ روپیہ جماعت اسلامی سے منسلک غریب اور متوسط غریب طبقے کے لوگ تو دے نہیں سکتے ضرور دال میں کالا ہے۔

---

[۱] چراغ راہ احتجاج نمبر۔ اکتوبر ۵۳ء

لیکن جو لوگ جماعت کو بہت قریب سے جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ جماعت کے نہ صرف سوا دو ہزار ارکان بلکہ نصف لاکھ کے لگ بھگ متفقین اور متاثرین بھی جماعت اسلامی کو باقاعدہ اعانت دیتے ہیں۔ ارکان اپنی پوری زکوٰۃ اور عشر کی رقم جماعت کو دیتے ہیں بلکہ صدقات بھی دیتے ہیں، ہنگامی حالات میں مزید مالی مدد دیتے ہیں۔ دوسری بات جو لوگ ہمارے موجودہ معاشرتی نظام میں نہیں سمجھ سکتے وہ جماعت سے وابستہ لوگوں کی دیانت و راست بازی ہے۔ جماعت کا بیشتر کام لوگ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ اکثر اپنے حلقے کے کام کے اخراجات بھی ہر شخص خود ادا کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکتوبر ۵۰ء میں ملتان میں منعقد ہونے والے ایک عظیم الشان جلسے کے بارے میں سرکاری پارٹی کے ایک رہنما کا خیال تھا کہ اس پر ۸۰ ہزار سے لے کر ایک لاکھ روپے تک خرچ آیا ہوگا حالانکہ جماعت اسلامی کا اس پر پانچ ہزار روپیہ سے بھی کم خرچ آیا تھا۔ تیسری چیز ایک تحریک اور ایک مقصد کیساتھ ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہے جو انسان کو ایثار اور قربانی پہ آمادہ کرتا ہے اور اس بات کو تو جماعت اسلامی کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگوں کو سید مودودی ماں سے بڑھ کر جماعت اسلامی اور ان سے بھی بڑھ کر اسلام اور خدا کے ساتھ جو فدا کارانہ وابستگی ہے ایسی گہری وابستگی اس برعظیم میں شاید ہی کوئی تحریک اپنے پیروکاروں میں پیدا کر سکی ہو۔

۲ رمئی ۵۲ء کو کراچی سے ایک طیارے نے لاہور کی جانب پرواز کی۔ اس میں گورنر جنرل پاکستان غلام محمد صاحب تھے۔ اسی روز دوپہر ریڈیو نے اعلان کیا کہ مولانا مودودی پر سیفٹی ایکٹ کے بجائے مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ دوسری صبح گورنر جنرل کراچی پرواز کر گئے (پھر مقدمے کے دوران گورنر ہاؤس لاہور میں رونق افروز رہے تاکہ پورا ڈرامہ اپنی ہدایت کاری کے تحت مکمل کروائیں) سید مودودی پر مقدمہ یہ قائم کیا گیا تھا کہ انہوں نے اخبارات کو دو بیانات دیئے تھے جو حکومت کیخلاف تھے دوسرے انہوں نے "قادیانی مسئلہ" نامی کتابچہ لکھا ہے۔ یہ دونوں کام چونکہ مارشل لاء لگنے سے پہلے ہوئے تھے اس لیے ایک نیا مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۲۴ بنایا گیا جس کی رو

سے فوجی عدالتوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ مارشل لاء لگنے سے پہلے کے جرائم کی سماعت بھی کر سکتی ہیں ـــــ گویا باہر کے ملکوں سے روپیہ لینے کا الزام تو ہم نے بہتان گھڑا ہے جسے ثابت نہیں کر سکتے اور تمہیں ختم کرنے کا بہانہ بھی چاہیئے اس لیے چلو تمہیں اسی بات پر پکڑ لیتے ہیں کہ تم نے بیان کیوں دیئے اور کتابچہ کیوں لکھا اور اسی پر اپنی مرضی کی سزا بھی دیں گے۔

کیا یہ وہی بھیڑیئے اور میمنے والی کہانی نہیں ہے؟

سزائے موت

اعصابی جنگ والی رات سے اگلی صبح سید صاحب کو شاہی قلعہ لاہور سے سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا اور انہیں تازہ فردِ جرم دے دی گئی۔ انہوں نے قریباً بیس صفحات پر مشتمل بیان دوپہر تک میاں طفیل محمد صاحب کو لکھوا دیا جس کا سرِ آغاز یوں ہے:

"۲۷ اور ۲۸ مارچ کی درمیانی شب کو میرے مکان پر اچانک چھاپہ مارا گیا اور نہ صرف مجھے گرفتار کیا گیا، بلکہ پولیس نے میرے مکان کی اور جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر کی پوری تلاشی لینے کے بعد میرے ذاتی حسابات اور جماعت کے حسابات کے تمام رجسٹروں پر اور میرے اور جماعت کے دوسرے کاغذات پر قبضہ کر لیا۔ نیز جماعت کے خزانے کی پوری رقم بھی اپنی تحویل میں لے لی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شہر لاہور میں جماعت اسلامی کے بارہ ذمہ دار کارکنوں کو بھی اس رات گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد ایک مہینہ چھ دن تک جماعت کے حسابات اور دوسرے ریکارڈ کو خوب اچھی طرح خوردبین لگا لگا کر دیکھا گیا اور مجھ پر اور جماعت کے دوسرے بہت سے کارکنوں پر قلعہ لاہور میں لمبا چوڑا ـــــ (Interogation) ہوتا رہا۔ جس کے سوالات کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ تحقیقات اس بات کی کی جا رہی ہے کہ جماعت کے فنڈز کہاں سے فراہم ہوتے ہیں اور بیرونی حکومتوں سے تو جماعت کا تعلق نہیں ہے۔ یہ سب

کچھ ہو جانے کے بعد اب اس معزز عدالت کے سامنے دو مقدمے میرے خلاف پیش کیے گئے ہیں جن میں ایک "قادیانی مسئلہ" کی اشاعت کے متعلق اور دوسرا میرے ان بیانات کے متعلق ہے جو آخر فروری اور ۷ مارچ کے درمیان مَیں نے پریس کو دیئے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دراصل مقصد تو مجھ پر اور جماعت اسلامی پر کچھ دوسرے ہی سنگین الزامات لگانا تھا مگر جب کہیں سے کوئی چیز ایسی ہاتھ نہ آئی جس پر گرفت کی جا سکتی تو اب مجبوراً یہ دو مقدمے بنا کر پیش کیے جا رہے ہیں ورنہ ظاہر ہے اگر میرے گناہ وہی دو تھے جو اب پیش کیے جا رہے ہیں تو ان میں سے کسی کے لیے بھی جماعت کے حسابات اور دوسرے ریکارڈ اور جماعت کے خزانہ پر قبضہ کرنے کی حاجت نہیں تھی۔"[۱]

مولانا مودودی صاحب نے یہ بیان مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو دیکھنے کے لیے دیا۔ ان کا کہنا ہے:

"میں نے نماز کے بعد اسے پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ مولانا مودودی کے صبر و ضبط اور سکون و اطمینان کا جب بھی مَیں نے کوئی اندازہ لگایا تو وہ ہمیشہ اس سے کچھ زائد نکلے۔ خود اس بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مصنف ابھی ابھی ایک طویل قیدِ تنہائی سے نکلا ہے اور گزشتہ رات ہی کو اسے ایک سخت قسم کی اعصابی جنگ سے سابقہ پیش آ چکا ہے۔ نہ غصہ نہ جھنجھلاہٹ، نہ سختی نہ درشتی بلکہ اس کی بجائے وہی باوقار انداز، سنجیدہ طرزِ بیان، ٹھوس دلائل اور ٹھنڈا طریقِ استدلال۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیل کی چار دیواری میں نہیں بلکہ اپنی لائبریری کی پُر سکون فضا میں بیٹھ کر یہ بیان لکھا ہے۔ شاید یہ اسی تاثیر کا نتیجہ تھا کہ جب مَیں باہر جانے سے قبل مولانا سے رخصت ہونے اور ان کا تحریری بیان واپس کرنے کے لیے ان کے پاس گیا تو معانقہ کے

---

[۱] مقدمہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: ص ۲۲

ساتھ میں نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو چوم لیا جن میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی مدد سے اظہارِ حق کی کیسی قدرت ودیعت فرمائی تھی۔ اللھم زد فزد۔"[1]

۸ مئی ۵۳ء کو لاہور سنٹرل جیل کے ایک خاص حصے میں سید مودودی صاحب کا مقدمہ شروع ہوا۔ اب اس سنٹرل جیل کی جگہ ایک نئی نواحی بستی بنائی گئی ہے۔ اس میں سُرخ اینٹوں کا ایک ہال تھا جسے تقسیم ملک سے پہلے بھگت سنگھ کے مشہور مقدمہ بغاوت کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا جس نے پنجاب اسمبلی ہاؤس میں بم پھینک کر شہرت حاصل کی تھی۔ اسی ہال میں سید مودودی کا مقدمہ پیش ہوا۔ روزانہ ہال کے باہر جماعت اسلامی اور عام پبلک کے بہت سے لوگ اس تاریخی مقدمہ کی رُوداد سُننے آتے۔ تین اعلیٰ فوجی افسر اپنی خاکی رنگ کی کلف دار وردیوں میں ملبوس ججوں کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ججوں کے چہرے جذبات سے عاری تھے۔ گویا انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ فیصلہ جس کی طرف وہ ہمیشہ منسوب کیے جائیں گے اس کا آئندہ تاریخ میں کیا مقام و اثر ہوگا یا شاید ان کی عدم دلچسپی کا باعث یہ احساس ہو کہ ان کے کندھے پر رکھ کر ایک ایسی بندوق چلائی جا رہی ہے جس کی لبلبی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ججوں کے پاس ہی ایک محرّر صفائی کے گواہوں اور استغاثہ کے بیانات قلم بند کر رہا تھا۔ سید مودودی صاحب کٹہرے کے پاس دائیں جانب رکھی ہوئی ایک میز کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی پشت پر کٹہرے کے اندر ملک نصر اللہ خاں عزیز، سید نقی علی اور دونوں مالکان پریس ایک اُونچی بنچ پر دو مسلح سپاہیوں کے درمیان بحیثیت ملزم بیٹھے تھے۔"[2]

جب بحث سید مودودی صاحب کے ۲۷ فروری والے بیان پر ہوئی، جس میں سید صاحب نے حکومت کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے تو ان کے وکیل چوہدری نذیر احمد نے مشورہ دیا تھا کہ اگر سید صاحب پسند کریں تو صرف اتنی

---

[1] چراغ راہ احتجاج نمبر ص ۱۰

[2] ایضاً ص ۱۰-۱۱

بات کہہ دیں کہ روزنامہ تسنیم میں شائع ہونے والے حرف حرف کا درست ہونا اور میری تحریر کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ پھر میں خود بحث کر لوں گا۔ لیکن سیّد صاحب نے اس مشورے کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ جب تسنیم کا پرچہ پیش کر کے عدالت نے اس بیان کے بارے میں پوچھا تو سیّد مودودی صاحب اُٹھ کر عدالت کے سامنے آئے اور کہا:

"ہاں یہ میرا بیان ہے اور
میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمّہ داری قبول کرتا ہوں[1]"

حق گوئی و بے باکی ہمیشہ سے آئینِ جواں مرداں رہا ہے اور یہ وہ صفت ہے کہ بڑے سے بڑے مخالف بھی اس خوبی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے سیّد صاحب کے ایک نقّاد پروفیسر محمد سرور صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے:

" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جرأتِ گفتار اور جرأتِ کردار کا تو کیا کہنا اس معاملے میں تو شاید ہی ہماری کوئی دینی و سیاسی شخصیت ان کے مقابلے میں لائی جا سکے[2]"

چار دن تک اس ناصاف، ہوا بند اور پُر ہجوم ہال میں سید مودودی صاحب کا مقدمہ چلتا رہا۔ ہر روز لوگوں کی بھیڑ جیل کے پھاٹک پر سیّد مودودی اور ان کے رفقاء کے نکلنے کی منتظر رہتی۔ پھر ان کو اپنے جلو میں لے کر کمرۂ عدالت تک آتی۔ درمیانی وقفوں میں بھی ایک بڑا ہجوم سیّد صاحب کے گرد جمع رہتا۔ یہاں تک کہ عدالتی کارروائی ختم ہونے پر لوگ پھر سیّد صاحب اور ان کے مسلح محافظوں کو اپنے درمیان لے کر حفاظت سے جیل کے پھاٹک تک پہنچا دیتے۔ آخری روز مقدمے کی سماعت ختم ہوئی اور عدالت بغیر فیصلہ سنائے برخاست ہو گئی تو سید صاحب سے واپسی میں کسی نے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے یہ آپ کو کیا سزا دیں گے؟ سیّد صاحب نے کہا یہ لوگ تو وہی سزا دیں گے جو انہیں اُوپر سے اشارہ ہوگا۔

---

[1] چراغ راہ احتجاج نمبر ص ۱۰-۱۱

[2] شورش کاشمیری کی "چہرے" نامی کتاب کا پیش لفظ۔

اشارہ اوپر سے ہو چکا تھا۔ اسی لیے تو عدالت میں کھلے بندوں یہ سزا سنانے کی ججوں کو جرأت نہ ہو سکی تھی۔[1]

سیّد مودودی صاحب نے ۱۹۳۸ء میں نام نہاد مسلم قوم پرست حکومت کے بارے میں ایک مضمون رقم کرتے ہوئے کتنی صحیح بات کہی تھی:

"وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہو گا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان پر سزا، پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"[2]

اس تحریر کے پورے پندرہ سال بعد مسلم قومی حکومت نے اس تحریر کو پیشین گوئی ثابت کر دیا۔

سنٹرل جیل کا ایک حصہ دیوانی گھر تھا جہاں جماعت اسلامی کے رہنما مقید تھے۔ ۱۱ مئی ۵۳ء کو سوموار تھا۔ اس شام مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے کمروں کے سامنے والے صحن میں لوگ جمع ہوئے۔ سیّد مودودی صاحب امامت کے لیے آگے کھڑے ہوئے۔ پیچھے پانچ رفقائے جماعت، ایک باورچی اور ایک نمبردار مقتدیوں کی صف میں کھڑے تھے۔[3] سیّد صاحب حسب عادت اپنے مخصوص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پاک کی آیات ادا کر رہے تھے۔ گویا وہ سبق پڑھا رہے ہوں اور طالب علموں کو معانی ذہن نشین کراتے جا رہے ہوں۔ ان کے تحت اللفظ میں بھی ایک الحان اور خاص کیفیت ہے اور معانی گویا دل میں اترتے جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے قرآن کے معانی ہم پر نازل ہو رہے ہیں اور ہمیں پیغام دیا جا رہا ہے:

---

[1] چراغ راہ اکتوبر ۵۳ء ص ۱۱

[2] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان

[3] چراغ راہ جنوری ۵۴ء ص ۶۹

"کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ بس وہ اتنے پر ہی چھوڑ دیئے جائیں گے کہ انہوں نے زبان سے کہہ دیا تھا کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم نے پہلے گزرنے والے لوگوں کی بھی آزمائش کی تھی۔ اس طرح اللہ راست بازوں اور جھوٹے فریب کاروں کو الگ الگ ظاہر کر دیتا ہے۔"

(سورۂ عنکبوت، آیت ۲)

نمازیوں کو محسوس ہوا کہ نماز کے دوران میں قریب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لیکن کوئی نماز میں شامل نہیں ہوا۔ غالباً آنے والے واپس لوٹ گئے۔ امام مودودی نے سلام پھیرا۔ دعا مانگی۔ شرقی حصّہ چمن میں کچھ لوگ نمازیوں کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ نماز مکمل کرنے کے بعد نمازی اکٹھے ان کے پاس پہنچے۔ رسمی طور سے سلام اور مصافحے ہوئے۔ فضا اور ماحول پر ایک ایسی چُپ طاری تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ نمازی اس تجسّس میں ہیں کہ یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ اُلجھن ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح بات کا آغاز کریں۔ ایک افسر کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے وہ سید مودودی صاحب کو نہیں پہچانتا تھا اس نے مہرِ سکوت توڑی اور استفہامیہ انداز میں پوچھا "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب؟" سیّد صاحب نے حسبِ عادت سکون سے جواب دیا۔ "فرمایئے مَیں ہوں۔" اور اس افسر نے فوجی عدالت کا وہ فیصلہ سُنایا جو تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔ "اخبار تسنیم میں بیانات کے سلسلے میں آپ کو سات سال قید با مشقت اور ملک نصراللہ خاں عزیز کو تین سال قید با مشقت۔ 'قادیانی مسئلہ' کے پرنٹر و پبلشر کی حیثیت سے سیّد نقی علی صاحب کو نو سال قید با مشقت اور 'قادیانی مسئلہ' لکھنے کے جُرم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو سزائے موت۔"[۱]

سُوئے دار

سزائے موت؟ سید مودودی کو سزائے موت؟ ایک دفعہ تو رفقائے جماعت کے

---

[۱] چراغ راہ جنوری ۵۲ء ص ۰۷

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یوں محسوس ہُوا کہ گویا زمین ان کی آنکھوں کے سامنے چکرکھا گئی ہے اور سامنے تاریکی کا پردہ گر گیا ہے۔ سیّد مودودی صاحب کی سزائے موت کی خبر سُن کر انہیں ایک جھرجھری محسوس ہوتی۔ کسی کی بھی زبان میں گویائی کی قوت نہ رہی۔ جیسے زبانیں تالو سے چپک گئی ہوں اور بولنے کا یارا نہ رہا ہو۔ لیکن آہنی اعصاب کے مالک سیّد مودودی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس تحمل کے پیکر نے اپنی سزا سُن کر پورے اطمینانِ قلب سے "بہت اچھا" کہا۔ اسی افسر نے ایک کاغذ جس پر سزائے موت لکھی تھی سیّد مودودی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "مولانا آپ چاہیں تو سزائے موت کے سلسلے میں ایک ہفتے کے اندر اندر رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ دوسرے مقدمے کی سزا کی کوئی اپیل نہیں۔" اتنا کہہ کر سزا سنانے والا افسر اور چند دوسرے افراد واپس چلے گئے۔ اس وقت بھی کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ ابھی تک زبانیں تالو سے چپکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پہ تالے پڑے ہوئے تھے اس خاموشی کو جیل کے افسر نے یہ کہہ کر ختم کیا۔

"مولانا آپ تیار ہو جائیں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں۔"[1]

سیّد مودودی نے دو ثانیے توقف کیا اور نپے تلے الفاظ میں اپنا تاریخی فیصلہ سُنا دیا۔ جس فیصلے نے انہیں ایسی عظمتوں کے تاج پہنا دیئے جن کے سامنے سلطنت و حکومت و طاقت کی عظمت، پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ سیّد صاحب نے رفقاء سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ لوگ ایک بات کا خیال رکھیں۔ مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور مَیں ان لوگوں کے سامنے رحم کی اپیل نہیں کروں گا اور میری طرف سے کوئی شخص بھی اپیل نہ کرے۔ نہ میری والدہ، نہ میرے بھائی، نہ میرے بیوی بچے، کوئی بھی نہیں ——— اور جماعت کے لوگوں سے بھی میری یہی درخواست ہے۔"[2] رفقاء نے اپنے قائد کی یہ جرأت آمیز بات سکون و اطمینان سے سُنی۔ سیّد صاحب کے پیچھے سب لوگ خاموشی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ سُوئے دار

---

[1] چراغ راہ جنوری ۱۹۵۴ء۔

[2] ایضاً ص ۱۷

جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ یہاں سے سیّد صاحب کا بستر سمیٹ کر پھانسی کی کوٹھڑی میں لے جایا جانا تھا۔ میاں طفیل محمد صاحب نے سیّد صاحب کا بستر کھول دیا۔ ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ، ان کے دلی اضطراب کا مظہر تھی۔ نقی علی صاحب کپڑے اور دوسری چیزیں لاکر بستر پر جما رہے تھے اور ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب سنجیدہ اور متفکر چہرے کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ سن رسیدہ محمد اکبر صاحب بُت بنے خاموش کھڑے تھے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب قرآنی دعائیں مانگ رہے تھے[1]

بستر بندھ گیا، کھانا بھی ایک کپڑے میں باندھ دیا گیا، قرآن شریف بھی ساتھ کر دیا گیا۔ سیّد مودودی صاحب سب سے گلے ملے۔ سوائے ان کے باقی سب کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں، ہونٹوں پہ دعائیں تھیں، سیّد مودودی سلام اور خدا حافظ کہہ کر افسر جیل کے ہمراہ چلے تو سب کی آنکھیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں، ان کے قدموں کو دیکھ رہی تھیں، ان کے سراپا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید پھر اس عظیم انسان کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو جو پھانسی کے تختے کی طرف اتنے اطمینان سے جا رہا تھا۔ اپنے ہمراہی، رفیق، رہبر، رہنما اور امیر کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتے ہی سیلابِ جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ دبے ہوئے کرب اور ضبط کی دیوار کو ایک سسکی نے توڑ دیا۔ میاں طفیل محمد صاحب اور نقی علی صاحب سسکیاں لے کر رونے لگے اور دونوں خدا کے حضور دعا مانگنے کے لیے جائے نماز پہ آئے۔ اصلاحی صاحب، چوہدری محمد اکبر صاحب اور نصر اللہ خاں عزیز صاحب پہلے سے سربسجود تھے۔ قلب کی گہرائیوں سے اور پورے خلوص کے ساتھ انہوں نے التجائیں کیں، گڑگڑائے، آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ 'وحدہٗ لاشریک لہٗ' سے اپنے ساتھی کی جان کے لیے کہا کہ "ہم تجھی سے استعانت چاہتے ہیں"۔ ایسی عاجزی سے مانگی ہوئی نیک بندوں کی دعاؤں کو عرشِ الٰہی پہ قبولیت مرحمت ہوئی۔ خداوند کریم نے ان کی دعا سن لی تھی![2]

---

[1] چراغ راہ جنوری ۵۴ء

[2] ایضاً

دیوانی گھر سے نکلے تو جیل افسر نے سیّد مودودی کو تسلی دینے کے لیے کہا کہ آپ گھبرایئے نہیں لیکن سیّد مودودی صاحب نے جواب دیا "صاحب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میں نے جس راہ میں قدم رکھا ہے اس کے متعلق اول روز سے جانتا تھا کہ کیا کچھ پیش آسکتا ہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ جس کی دی ہوئی یہ جان ہے اس کی راہ میں قربان ہونے کا شرف اسے حاصل ہو رہا ہے[1]۔" اور پھر اپنے باوقار انداز میں قدم اٹھاتے، خاموش لیکن غیر متفکر چہرے کے ساتھ منزلِ جاناں کی طرف بڑھے۔ آخر بیرک نمبر ۴ آگئی اور سیّد مودودی پھانسی کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔ شورش کاشمیری نے ایک دفعہ لکھا "مولانا مودودی کا کیریکٹر مثالی ہے انہوں نے موت کی سزا پہ جس ایمان کا ثبوت بہم پہنچایا اس پر جتنا فخر بھی کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ ہر شخص اتنے ثبات کے ساتھ موت کی کوٹھڑی میں داخل نہیں ہو سکتا۔"
اور اسی بات کو انہوں نے شعر کی زبان میں بھی کہا:

دار کو گلدستۂ طاقِ تغافل کر دیا
تیری ہمّت کا یہ افسانہ دلوں پر نوٹ ہے
گاہے گاہے دل میں آتا ہے یہ نازک سا خیال
تیری قسمت میں بھی شاید کوئی بالاکوٹ ہے[2]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (جو قریباً سوا سات سو سال پہلے وفات پا گئے) پر بھی اس زمانے کے مولویوں، پیروں اور حکومت کی اسی طرح نظر التفات تھی۔ حکومت نے انہیں تین مرتبہ پابندِ سلاسل کیا اور زنداں میں رکھا۔ انہوں نے ایک دفعہ فرمایا "قید میری خلوت، جلاوطنی میری سیاحت اور قتل میری شہادت ہے۔" یہ ایک بزرگِ دین کا ذکر ہے۔ آپ تاریخِ عزیمت پڑھ کر دیکھیں۔ اہلِ حق کا سر جھکانے کے لیے ہر زمانے کے جہانگیروں نے بڑے بڑے جتن کیے۔ لیکن وہ کسی مجدّد الف ثانی کا سر جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

---

[1] چراغ راہ ۵۴ء ص ۴۷

[2] ہفت روزہ چٹان ۲۷ اکتوبر ۶۳ء

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو جیل کے نمبر دار نے بتلایا کہ آپ کی رہائی کے کاغذات آگئے ہیں۔ مولانا نے خاموشی سے سُنا، پھر یوں گویا ہوئے "جب وہی شخص دنیا میں نہ رہا کہ جس کی رفاقت میں رہنے سے زندگی تھی تو پھر میں رہا ہو کے کیا کروں گا؟ ——

میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا، ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آج تک ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھا تھا جتنا وہ آج بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لیے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزار ہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اُونچے مقام پر لا کھڑا کیا ہے"۔

سیّد مودودی صاحب پھانسی کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں داخل ہوئے جس کا فرش کچا تھا۔ روشنی کے لیے ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ سیّد صاحب نے دیکھا کہ یہاں قرآن مجید رکھنے کی کوئی اونچی جگہ موجود نہیں۔ اس لیے اسے لوٹا دیا۔ پھر سیّد صاحب کو پھانسی پانے والے مجرموں کے چار خانہ کپڑے دیئے گئے تاکہ وہ اپنے کپڑے تبدیل کر لیں۔ سیّد صاحب کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پاجامے میں کمر بند نہیں تھا۔ اس خیال سے کہ شاید رات کے وقت لباس نکالنے والے سے بھول نہ ہو گئی ہو۔ کمر بند کا مطالبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ پھانسی کے قیدی کو کمر بند نہیں ملا کرتا۔ کیونکہ بعض قیدی اس سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ سیّد صاحب نے کہا: "جس شخص کو شہادت نصیب ہو رہی ہو، وہ احمق ہے اگر خودکشی کر کے حرام موت مرنے کی کوشش کرے"۔ لیکن جیلر نے معذرت کی کہ وہ قانون کی پابندی پر مجبور ہے اور ازار بند نہیں دے سکتا۔ چنانچہ سیّد صاحب نے پاجامے کو گرہ لگا کر باندھا۔ تبدیلی لباس سے فارغ ہو کر اطمینان سے کھانا کھایا۔ پھر نماز عشاء پڑھی، اپنے پروردگار سے دعائیں کیں، صبر و استقامت اور تحریکِ اسلامی کی بقاء و ترقی کی دعائیں مانگیں اور لیٹ گئے[1]

وہ اس اطمینان اور سکونِ قلب کے ساتھ دعائیں مانگتے ہوئے لیٹ گئے گویا نہیں

---

[1] چراغِ راہ جنوری ۵۴ء ص ۵۰

یقین ہو اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

میں رحم کی درخواست نہیں کروں گا

ان دنوں جماعت اسلامی کے امیر جناب سلطان احمد صاحب تھے۔ سارا دن مقدمے کی مصروفیت رہی۔ بعد میں اس پر تبصرے ہوتے رہے۔ پھر مقدمے کے فیصلے کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے رات بڑی دیر سے بستر پر گئے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ سید مودودی صاحب کو موت کی سزا سنائی بھی جا چکی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔ "شب کے دو بجے سے ذرا قبل میں پلنگ پر لیٹا تھا اور آنکھ لگی ہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اُٹھ کر ریسیور کان سے لگایا تو کوئی پوچھ رہا تھا ——— مولانا کے فیصلہ کی آپ کو خبر مل گئی؟ ہیلو! انہوں نے مودودی صاحب کو پھانسی کی سزا دی ہے...... ہیلو کون صاحب ہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ ـــ ـــ اندھیرے میں جو تھوڑی بہت روشنی تھی، وہ یہ سنتے ہی ایک دم غائب ہو گئی۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ بولنے والا ابھی بول رہا تھا، مگر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ باہر آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ سامنے شعبان کی آخری راتوں کا چاند پھیکا اور زرد تھا معلوم نہیں صبح تک کتنے چہرے اسی طرح زرد اور اُداس ہو جائیں گے"۔[1]

۱۲ مئی ۵۳ء یعنی اگلے روز کراچی کے روزنامہ جنگ نے اس خبر کو شہ سُرخی بنایا "فوجی عدالت نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کو سزائے موت سُنا دی"۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اس سے پہلے ہی لاہور، کراچی اور بڑے شہروں میں پھیل چکی تھی۔ اس خبر نے لوگوں کے دلوں

---

[1] چراغ راہ اکتوبر ۵۳ء احتجاج نمبر ص ۱۱

کو ہلا دیا۔ اُف اللہ کیا اتنا بڑا عالمِ دین حق گوئی کی پاداش میں تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا؟ کیا اتنا بڑا مفکرِ اسلام ہم سے چھین لیا جائے گا؟ اس خبر سے کتنی ہی زبانوں پہ آہیں تھیں، کتنی ہی آنکھیں اشکبار اور کتنے ہی دل سوگوار ہو گئے تھے، جماعت اسلامی کے ارکان اور متفقین مضطرب تھے کہ کیا ایک ایسی متاعِ عزیز اُن سے چھین لی جائے گی جس نے انہیں دین و دنیا میں زندگی بسر کرنے کا نیا عزم، نیا ولولہ اور نیا نصب العین دیا تھا۔ پاک و ہند اور عالمِ اسلام کے تمام مسلمان حیرت میں گم تھے کہ یا الٰہی! جس ملک کو خدا، رسول اور کلمۂ طیبہ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، کیا اس کی حکومت، اس روشنی کے مینار کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر دے گی؟ لیکن یہ وقت حیرت و غم میں ڈوبنے کا نہیں تھا۔ عمل کا وقت تھا۔ جماعت اسلامی کے ہزاروں کارکن اور لاکھوں ہمدرد حرکت میں آ گئے۔ وہ بازاروں میں، کالجوں میں، دفتروں میں اور گلیوں میں نکل گئے اور لوگوں کو اس ناانصافی کی اطلاع دے کر احتجاج کے لیے تیار کیا۔ بلا مبالغہ لاکھوں تار پاکستان کے گورنر جنرل، وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف کو ارسال کیے گئے جن میں مطالبہ کیا گیا کہ مولانا مودودی کو سزائے موت نہ دی جائے۔ گلی اور بازاروں میں احتجاجی جلسے ہوئے اور کچھ شہروں میں ہڑتال ہوئی۔

اس احتجاج میں عالمِ اسلام کی دھڑکنیں بھی پاکستانیوں کے ساتھ دھڑک رہی تھیں۔ عراق میں اہلسنّت والجماعت کے پیشوا امجد الزہاوی اور شیعان عراق کے مجتہد اعظم محمد الخالصی نے سزا کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ اخوان المسلمون مصر اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی نے تار دیا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ حکومت پاکستان دانش مندی سے کام لے گی اور استاذ مودودی کی سزا کو فوراً منسوخ کر دے گی۔ انڈونیشیا کے عیسیٰ انصاری نے ساٹھ اسلامی پارٹیوں کی طرف سے تار دیا اور لکھا کہ اگر پاکستان کو سیّد مودودی کی ضرورت نہیں تو دنیائے اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔ دمشق میں پاکستانی سفارت خانے پر مظاہرہ کیا گیا۔ قاہرہ، بغداد اور دمشق کے اخبارات نے سزا کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہوئے سیّد صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا اور "صفِ اوّل کا ایک جلیل القدر مجاہد صادق، دورِ ابتلا سے گزرنے والا مجاہد ابوالاعلیٰ مودودی" کہا۔ انگلستان میں مقیم مسلمانوں اور طلبہ نے احتجاجی

تار بھیجے۔ الجزائر کے مسلمانوں نے احتجاج کیا اور وہاں کے صدر جمعیۃ العلماء اور اخبار البصائر کے مدیر محمد البشیر الابراہیمی نے عربی اداریہ لکھا مَنْ هُوَ الْمَوْدُوْدِيْ (مودودی کون ہے ؟) اور آٹھ صفحات کے بسیط اداریے میں سید صاحب کا تعارف، اسلامی خدمات، حکومت سے سیاسی اختلاف اور سزا پہ احتجاج قلم بند کیا۔

ٹائمز کراچی کا اداریہ "مودودی کو ہرگز نہیں مرنا چاہیئے" تھا۔ تو جنگ کراچی کے اداریے کا عنوان "تمام قوم دہل گئی" تھا۔ روزنامہ انجام کراچی نے اداریے کی جگہ جلی حروف میں "مولانا مودودی کو سزا" کے الفاظ سیاہ حاشیے میں دیے، بے شمار اخبارات، رسائل و جرائد نے اس سزا پر اظہارِ افسوس کیا۔ عامر عثمانی مدیر تجلّی نے "آہ" کے عنوان سے لکھا کہ اس خبر سے دل کو اتنا صدمہ اور رنج ہوا ہے کہ صرف غالب نے ہی اس کی ترجمانی کی ہے :

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

کانپور کے جریدہ "سیاست جدید" نے 'آخری سلام' کے عنوان سے ان مؤثر الفاظ پہ اپنا اداریہ ختم کیا: "آپ رسولِ پاک کی اُمت کی راہبری کے لیے پھانسی کے تختے پر چڑھ رہے ہیں۔ آپ مِلکُ العلاّم کے پاس جا رہے ہیں، جب وہ آپ سے سوال کرے کہ آپ کو کس گناہ پہ قتل کیا گیا؟ تو آپ یہ ضرور کہیئے گا کہ آپ کے حبیب پاک کو خاتم النبیّین ثابت کرنے کے جرم میں مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ مولانا مودودی! آپ کو ایک دور افتادہ ہندوستانی مسلمان کا آخری سلام ہے۔"[1]

۱۲ مئی کی صبح شیخ سلطان احمد صاحب، بیگم مولانا مودودی کو تسلّی دینے کیلئے سید صاحب کی کوٹھی مرکز میں پہنچے تو ان کے پاس لاہور شہر کی تقریباً سات سو خواتین اظہار ہمدردی کے لیے پہنچ چکی تھیں۔ وہ تصویرِ صبر و سکون بنی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس روز بھی بچوں کو تیار کیا اور سکول بھیجا جس روز پورے پاکستان میں ان بچّوں کے والدِ

---

[1] چراغ راہ اکتوبر ۵۳ء احتجاج نمبر ص ۱۲۱ تا ۱۱۲

گرامی کو سزائے موت سُنانے پر کہرام مچا ہوا تھا۔ سلطان صاحب اپنے آپ کو ہچکیاں اور سسکیاں سُننے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ لیکن جب پردے کے پیچھے سے بیگم محمودہ مودودی کی صاف اور بلند آواز میں سلام کی آواز آئی۔ تو اس میں نہ کمزوری تھی اور نہ کپکپاہٹ تھی۔ سلطان صاحب نے تسلی کے الفاظ کہے تو انہوں نے کہا:

"میں ہر حال میں تقدیر پر شاکر ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تو کیا میرے بچے تک ہراساں نہیں، ان کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" لے

اس کے بعد سلطان صاحب پھانسی کا انتظار کرنے والے سیّد مودودی کو ملنے سنٹرل جیل پہنچے۔ ان کے اپنے الفاظ میں "جیل کے بیرونی آہنی پھاٹک کی کھڑکی کھلی۔ ابوالخیر صاحب مودودی، عمر فاروق صاحب مودودی، سعید ملک صاحب، عبدالعزیز شرقی صاحب، صفدر صاحب اور میں آگے پیچھے جُھک کر تاریک ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ اندر پہنچتے ہی پُرشور طریقہ پر کھڑکی اور اس کا قفل بند کر دیا گیا سب کے ہاتھوں پر نشانی کی مُہر لگائی گئی۔ کافی آگے جا کر بائیں ہاتھ کی بیرک کی آخری کوٹھڑی میں ہم سب داخل ہو گئے۔ باہر ایک نگران بیٹھا تھا۔ سامنے لوہے کی موٹی سلاخوں کا دوسرا دروازہ تھا جس پر بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ ہم کو دیکھ کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حسبِ معمول کشادہ روئی کے ساتھ اُٹھے اور آگے بڑھ کر سلاخوں کے باہر سب سے ہاتھ ملایا۔ فرزند کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے مخصوص انداز میں ہر ایک کی خیریت پُوچھنے لگے۔ سب لوگ نیچی نگاہ کیے کھڑے تھے اور ایک عجیب حجاب گفتگو میں حائل تھا۔" ۲ے

کچھ دیر بعد باتوں باتوں میں جب سلطان صاحب نے مولانا سے اپیل کے بارے میں ذکر کرنا شروع کیا تو سیّد مودودی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "بھئی میرا مسلک آپ کو معلوم ہے۔ میرے نزدیک ان لوگوں سے جو میرا اصل جُرم خوب جانتے ہیں معافی کا طلبگار

لے چراغ راہ اکتوبر ۵۳ء احتجاج نمبر ص ۱۵۔

۲ے ایضاً ص ۱۳۔

بننے سے یہ زیادہ قابلِ برداشت ہے کہ آدمی پھانسی پر لٹک جائے"! سلطان صاحب نے دلائل دیئے کہ قرار دادِ مقاصد کے بعد ان عدالتوں سے انصاف لینا جائز ہے۔ پھر یہ کہ اپیل معافی کی نہیں قانونی نکات اور مقدمہ کے حقائق کے زور پر ہوگی اور پھر اپیل کمانڈر انچیف کے پاس جائے گی جو کسی پارٹی کا آدمی نہیں ہے اور فوجی عدالت کی سزا حدِ شرعی تو ہے نہیں یہ تو صریح ظلم ہے۔ اس کے خلاف کیوں نہ اپیل کی جائے؟ لیکن سیّد مودودی نے کہ جن کا ایمان ہے کہ 'جان مرتی نہیں مرگِ بدن سے' یہ جواب دے کر بات ہی ختم کر دی" بھئی مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔ ورنہ مَیں حکم دینے کا تو حق نہیں رکھتا ——— مَیں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے یا میرے خاندان کے کسی فرد کی طرف سے یا خود جماعت کے اندر یا باہر کسی طرف سے کوئی رحم کی درخواست پیش کی جائے۔"[1]

روشنی کا مینار

سیّد مودودی کے یہ الفاظ بڑے بڑے پوسٹروں پر شائع ہو کر پاکستان کے کوچہ کوچہ اور گلی گلی میں پھیل گئے اور عزم و ہمت کا یہ فقرہ خاص و عام کے دل میں اُتر گیا "مَیں مر جاؤں گا لیکن رحم کی درخواست نہیں کروں گا"۔ اور اس روز ۱۲ مئی کو جب سنٹرل جیل کے یہ ملاقاتی لوٹنے لگے تو سیّد مودودی صاحب نے اپنے بیٹے عمر فاروق مودودی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی و تشفی دیتے ہوئے وہ الفاظ کہے جو تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔

"بیٹا! ذرا نہ گھبرانا، اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا ابھی حکم ہی نہیں تو پھر چاہے یہ اُلٹے لٹک جائیں لیکن مجھ کو نہیں لٹکا سکتے"۔[2]

سیّد صاحب کی موت سے اس مومنانہ بے خوفی کو شعر کی زبان میں یوں رقم کیا گیا ہے:

---

[1] چراغ راہ اکتوبر ۵۳ء احتجاج نمبر ص ۱۳، ۱۴۔

[2] ایضاً ص ۱۴۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
اس جان کی کوئی بات نہیں یہ جان تو آنی جانی ہے

تاریخ شاہد ہے کہ سیّد مودودی نے تختۂ دار کو خوشی سے چوم کر مرگِ باشرف کو چن لیا تھا۔ لیکن پھر ان کے خون کے پیاسوں کے اپنے قدم ڈگمگا گئے۔ انہیں دو روز بعد ہی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنا پڑا۔ برسرِ اقتدار طبقے نے اپنے دامن کو اس دھبے سے ہمیشہ کے لیے داغدار کر لیا۔ جس آمرِ مطلق غلام محمد نے نشۂ اقتدار میں یہ سارا کھیل رچایا تھا اس کی عبرت ناک موت زبان زدِ عام ہے۔ اس کے برعکس گنتی کے چند ہی لوگوں کو یہ علم ہو گا کہ آج اس کی قبر کہاں ہے؟

حکومتیں ایک ایک کر کے بدلتی گئیں اور اکثر نے سیّد مودودی کی پہلوں سے بڑھ کر مخالفت کی۔ لیکن سیّد مودودی روشنی کے اُس مینار کی طرح اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے جو سمندر کے درمیان کھڑا ہوتا ہے اور طوفان اسے تھپیڑے مارتے رہتے ہیں اور وہ ان تھپیڑوں سے بے نیاز، سربلند و سرفراز، مضبوط قدم جمائے، جہازوں کو راہ دکھاتا رہتا ہے۔ اسی طرح سیّد مودودی بھی ہر زمانے کی مخالفت، الزامات و اتہامات اور دار و رسن کے باوجود اپنے مشن پر پورے ثبات سے ڈٹے رہے ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی راہ دکھا رہے ہیں۔

سیّد مودودی صاحب کے افکار و خیالات سے بلامبالغہ لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا ہے۔ انہوں نے اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں سے پاکستان کی فعال، سیاسی اور دینی جماعت کو مستقل بنیادوں پر اٹھایا ہے۔ جس رفتار سے جماعت اسلامی کو اثر و نفوذ اور ذرائع و وسائل ملتے جائیں گے، انقلابِ افکار کا سیلاب پاکستان سے پھیل کر دیگر مسلم آبادیوں تک پہنچے گا اور پھر ساری دنیا میں اسلام کا پیغام ایک انقلابی تحریک کی صورت میں بڑھتا ہی جائے گا۔ سیّد مودودی صاحب کی کتابیں کئی مقامی اور بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی زندگی اور افکار پر بیرونی ممالک میں ریسرچ ہو رہی ہے۔ ان کی اس مقبولیت کو دیکھ کر کئی فراعنۂ وقت کی جبیں پر بل پڑتے رہے ہیں

اور کچھ اغراض پرست لوگوں کا یہ پیشہ بن گیا ہے کہ وہ اس چاند پر تھوکنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں خواہ اس سے ان کے اپنے ہی چہرے آلودہ اور آخرت برباد ہوتی ہو۔ دوسری طرف سیّد مودودی ان مخالفتوں سے بے پرواہ ہو کر تعلیم یافتہ نوجوان نسل کی تعمیرِ افکار اور تشکیلِ سیرتِ اسلامی میں مصروف ہیں اور ایک محنتی مالی کی طرح خیالات و افکار کی زمین میں کشاورزی اور تخم ریزی کیے جا رہے ہیں۔

ان کے علمی کام یعنی مستقل اہمیّت کی ستر سے زیادہ ٹھوس اسلامی کتابوں کی تصنیف اور عملی کام یعنی جماعت اسلامی کی تنظیم و سربراہی، سیاسی امور میں مشغولیت اور تربیّت و رہنمائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا اتنا کام اُس ایک شخص نے کیا ہے جسے شروع سے ہی معاشی فارغ البالی حاصل نہیں تھی، جسے مروجہ معنوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا، جس کے کندھے پہ ایک بھرے پُرے گھر کی ذمہّ داریاں ہیں، جس نے قریباً چار سال سے زیادہ عرصہ قید میں گزارا ہے اور جو دردِ گردہ کا مستقل مریض رہا ہے کہ جس سے کام لمبے عرصے کے لیے معطل ہو جاتا تھا۔ لاریب یہ عقل و حکمت، علم و عمل، عزم و استقلال، عفو و حلم اور عزّت و عظمت، اللہ عزوجل کی عنایت اور دین ہے۔ کوئی انسان اپنی محنت اور کوشش سے اس عالی مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ تا نہ بخشند خدائے بخشندہ۔

آئندہ صفحات میں اسی ادیب، سیاست دان، عالم، مفکر اور عظیم انسان کی ابتدائی پچاس سالہ زندگی کے تعارف کی بالکل ابتدائی سی کوشش کی گئی ہے۔

باب ۲

ابوالاعلیٰ

آباؤ اجداد

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو سال تک سلسلۂ رشد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ سادات اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ہرات (ایران افغان سرحد کے پاس افغانستان کے اندر قدیم شہر: مؤلف) کے قریب ایک مقام پر آ کر آباد ہوئی تھی جو چشت کے نام سے تمام دنیا میں مشہور رہا۔ اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتی سے صوفیائے کرام کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتی کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی (وفات ۵۲۷ھ) تھے جو تمام سلاسلِ چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندانِ مودودیہ کے مورث ہیں۔

خاندانِ مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ جنہوں نے ہندوستان میں مستقل

سکونت اختیار کی حضرت ابُوالاعلیٰ مودودی (وفات ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانے میں چشت سے ہندوستان آئے اور کرنال کے قریب قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا اور اب تک کہ چھٹی پُشت گزر رہی ہے اسی اُجڑے دیار میں آباد ہیں۔ ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا مرزا قربان علی بیگ خاں سالک گو خود شاعر اور صاحبِ قلم تھے مگر پشت ہا پشت سے ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا۔ قریباً چالیس سال تک کی عمر انہوں نے دہلی میں گزاری پھر حیدرآباد واپس ہوئے اور سر سالار جنگ اعظم نے ان کو سررشتہ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے انتقال فرمایا۔

میرے والد مرحوم مولوی سیّد احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دَور کے طالبعلموں میں سے تھے۔ سرسیّد مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں شدید نفرت تھی، مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ کیوں کہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا، مگر سرسیّد کے خیال سے خاموش تھے۔

ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے، وہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی اور یہ دیکھ کر انہیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیرِ طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے، انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوتے تو دادا صاحب سے مل کر کہا کہ بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ مَیں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کُرتی پہنے گیند بلّا کھیل رہا تھا۔ یہ

خبر سُن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور انہوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بُلا لیا۔ اس طرح وہ وہاں تکمیلِ تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے الٰہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔

کئی سال تک والد مرحوم ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق رہے جس کے بعد میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر وغیرہ میں وکالت کی۔ ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمے میں وکالتہً اورنگ آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میرِ عدل تھے اور رشتے میں والدِ مرحوم کے چچا تھے۔ ان کے ایماء سے یہاں وکالت شروع کی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد مرحوم پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ معاشرت کا غلبہ تھا اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی[1]۔"

۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن کے عمائد و مشاہیر کا ایک تذکرہ شائع ہوا تھا جس میں وہاں کے اہلِ قلم حضرات نے اپنے سوانح حیات تحریر کیے تھے۔ سیّد مودودی صاحب کی "خود نوشت" بھی اس مجموعے میں شامل ہوئی۔ اسی سے ہمیں سیّد مودودی صاحب کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ اوپر کا اقتباس بھی اسی خود نوشت سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیّد صاحب نے "میرا بچپن" کے عنوان سے اپنے بارے میں ایک مضمون رقم کیا۔ ان دو مضامین کے علاوہ وہ جستہ جستہ معلومات ہیں جو مختلف مصنفوں نے سیّد صاحب یا جماعتِ اسلامی کے بارے میں لکھتے ہوئے رقم کی ہیں یا پھر سیّد ابوالخیر مودودی صاحب ہیں جو سیّد مودودی کے بڑے بھائی ہیں انہوں نے اپنے خاندان اور سیّد مودودی صاحب کی ابتدائی زندگی کے بارے میں قیمتی معلومات دی ہیں۔

لیونارڈ بائنڈر نے لکھا ہے:

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۱ تا ۳۶

"مودودی خاندان کے افراد علماء نہیں تھے اور اگرچہ وہ خاندان مغلیہ کی شاہی ملازمت میں تھے۔ لیکن وہ درباری کبھی نہیں رہے۔ خاندان مغلیہ کو زوال آیا، دہلی اُجڑ گیا، حیدر آباد دکن کی ریاست اہمیت اختیار کر گئی جو مغل تہذیب وتمدن اور سیاست کی سب سے بڑی وارث ریاست تھی تو مولانا مودودی کے والد حیدر آباد چلے گئے۔ وہ ایڈووکیٹ تھے اور سرسید احمد خاں کے ساتھی تھے۔ مولانا کے والد کو دہلی میں مکانات کے کرائے کی صورت میں سو روپے کی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔"[1]

لیکن ابوالخیر صاحب مودودی کہتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب دہلی میں لوٹ مار، قتل وغارت اور تباہی وبربادی عروج پر تھی دہلی کی ہماری اکثر جائداد برباد ہو گئی۔ البتہ یوپی میں کچھ زرعی جائداد باقی بچ گئی اس سے گزارہ ہوتا رہا۔"[2]

ابوالخیر مودودی صاحب:

"پہلے والد میرٹھ میں وکالت کرتے تھے جب ایک دو مرتبہ اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ وہاں دہلی کے بہت سے خاندان آباد تھے۔ حیدر آباد کی بہ نسبت اورنگ آباد کی معاشرت دہلی سے ملتی جلتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اورنگ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور پھر وہیں وکالت کرتے رہے۔ ریاست حیدر آباد دکن کے چار صوبے تھے جن میں سے ایک اورنگ آباد تھا۔ اورنگ آباد ہی اس کا صوبائی صدر مقام تھا۔ والد صدر عدالت میں کام کرتے تھے جس میں دس ہزار سے زائد کے مقدمے زیر سماعت آتے تھے۔ یہی سشن عدالت بھی تھی۔ والد ماتحت عدالتوں میں نہیں جاتے تھے۔"[3]

---

[1] "Religion and Politics in Pakistan" P.78.

[2] ہفت روزہ آئین: ۱۷ اکتوبر ۶۲ء

[3] ایضاً

خود نوشت: "مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت نے رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے اور اس کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۹۰۰ء میں والد مرحوم نے مولوی صاحب سے بیعت کر لی اور ذکر و شغل، ریاضات و مشاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے۔ تاہم اس وقت تک یہ رنگ اتنا نہ چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین اور دنیا ساتھ ساتھ چلتے رہے[1]"

ان دنوں سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دنیا میں تشریف لائے۔

ابوالاعلیٰ

"میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد (محلہ چیلی پورہ — مؤلف) میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آتے تھے۔ انہوں نے میری پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے اور انہی کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس لیے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو مجھے اسی نام سے موسوم کیا گیا۔[2]"

عربی میں ابوالاعلیٰ کی طرح کے نام مستعمل ہیں جس طرح ابوالخیر کے معنی بھلائی والا اور ابوتراب کے معنی مٹی والا ہیں۔ اسی طرح ابوالاعلیٰ کے معنی عظمت و بلندی والا ہے۔ الاعلیٰ جہاں اللہ تعالیٰ کا اسم صفت ہے وہیں قرآن پاک نے اسے انبیاء کرام اور مومنوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ جیسے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۲۷

[2] ایضاً: ص ۳۸

شیکسپیئر نے لکھا ہے کہ پھُول کو پھُول کی بجائے کوئی اور نام دے دیں وہ جب بھی خوشبو دیتا رہے گا۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ جب فتنہ ڈھونڈنے والے لوگ خورد بین لے کر بیٹھ جائیں تو انہیں اس نام بھی کیڑے نظر آتے ہیں۔ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی غلطی کی نشان دہی کریں گے اور اپنی عربی دانی کی دھاک بٹھائیں گے کہ جی دیکھو مولانا مودودی نے اپنا نام ابوالاعلیٰ رکھ رکھا ہے۔ اعلیٰ تو اللہ کا نام ہے۔ تو کیا یہ نعوذ باللہ اللہ کا باپ ہے؟ —— پھر وہ فاتحانہ انداز میں اس طرح دیکھیں گے گویا اس "عالمانہ" دلیل کے ساتھ انہوں نے سیّد مودودی اور جماعت اسلامی کے چالیس سالہ کام کو صفر سے ضرب دیدی ہے۔

جن دنوں ابوالاعلیٰ پیدا ہوتے اس زمانے میں ان کے والد گرامی جو کبھی انگریزی معاشرت میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے، بالکل بدل چکے تھے۔ مذہب کی طرف اس حد تک مائل ہوتے کہ دنیا بھی ترک کر دی۔ خودنوشت میں سیّد مودودی لکھتے ہیں۔" انہوں نے نہ صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم بستی عرب سرائے میں اقامت گزین ہو گئے اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے"۔[1]

"جب تین سال اسی طرح گزر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لیے ترکِ دنیا لازم نہیں ہے۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کر دی۔ مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر موکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا جب انہیں کامل اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے، تب کہیں اس کی

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔ ص: ۳۹

وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان تقیدات کے ساتھ وکالت کا چلنا معلوم، رفتہ رفتہ اہلِ معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں۔ مگر اس کے ساتھ ان کا مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ شُبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے۔ ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے پھر حیدر آباد تشریف لائے۔ مگر چند مہینے رہ کر خرابیٔ صحت کے باعث بھوپال چلے گئے، جہاں میرے بڑے بھائی سیّد ابو محمد صاحب ایگزیکٹو افسر تھے[۱]۔"

پروفیسر محمد سرور نے سیّد مودودی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ رؤسا سے نیچے کے ایسے مسلمان شرفا کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں "جو مسلمان حکمران طبقوں کی دوسری روایات کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ اور سیّد احمد شہید سے لے کر دیوبند کے علماء تک کی مذہبی تحریکوں سے بھی متاثر ہے۔ اس طبقے میں عام رکھ رکھاؤ بھی ہے، مذہب سے وابستگی بھی اور حسنِ اخلاق کا بھی اسے خاص پاس رہتا ہے۔ مختصراً آج ہم شرافتِ خاندانی کے لفظ سے جو مفہوم لیتے ہیں یہ طبقہ اس کا بالعموم حامل ہے اور مولانا مودودی تو اس طبقے میں سے ہیں، بلکہ اس طبقے کے ممتاز ترین حصے سے۔ اس لیے وہ ذہنی اور تہذیبی طور پر اس طبقے کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں[۲]۔"

سیّد مودودی صاحب کا بچپن اور لڑکپن اپنے والد صاحب کے ساتھ اورنگ آباد دکن میں گزرا۔ اس عرصے کی یادداشتوں پر مشتمل انہوں نے میرا بچپن کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں رقمطراز ہیں: "مجھے اپنی حیرت اب تک یاد ہے جو مجھے پہلی مرتبہ یہ سُن کر ہوئی تھی کہ ابا کے ابا کو دادا اور ابا کی امی کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل یہ یقین کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا کہ ابا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں اور نہ میں یہ تصوّر ہی کر سکتا

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۷

[۲] محمد سرور: مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی ص ۲۵،

تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بوڑھے ہیں یہ سب کبھی بچے تھے اور ان کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

اس سے بھی زیادہ چھوٹی عمر کا ایک اور خیال مجھے اب تک یاد ہے۔ میں ابّا اور اماں کے کوئی معنی نہیں جانتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور میں ان کے پاس کیسے آگیا ہوں۔ البتہ میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ یہ ہیں بڑے اچھے لوگ۔ اپنے والد کو دنیا کا سب سے اچھا آدمی اور اپنی والدہ کو دنیا کی سب سے اچھی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا یا مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لیے پریشان ہوتے تھے۔ اسی لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی کبھی جان بوجھ کر خطرہ میں ڈالتا تھا۔ اس وقت جو بے چینی میری والدہ اور میرے والد کے دل میں پیدا ہوتی تھی، اس سے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ انہیں میری بہت فکر ہے۔ ان تجربات سے ماں اور باپ کے معنی میری سمجھ میں آتے

——— میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ ایک مکمل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتداء ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہوگئے۔[1]،،

بچپن

مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر صاحب نے مولانا کے بچپن کے حالات و واقعات بتلاتے ہوئے کہا: ” ابوالاعلیٰ بڑا ذہین بچہ تھا۔ مذہبی امور سے چار سال کی عمر سے ہی شغف تھا۔ اتنی سی عمر میں ہی والد صاحب کے ساتھ مسجد میں جا کر پانچوں وقت

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۲۲

کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کا عادی ہوگیا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف کی تقریباً تیس آیات بامعنی یاد ہو چکی تھیں اور روزے کی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے اس نے باقاعدگی سے روزے رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک دن وہ صبح اٹھا تو اس کا روزہ تھا۔ گھر والوں کے اصرار کے باوجود اس نے روزہ نہ توڑا اور اس طرح کسی خارجی دباؤ کے بغیر ہی اس نے روزے کی عادت عمر سے پہلے ڈال لی۔

ابوالاعلیٰ ابھی پانچ برس کے تھے کہ والد کے ہمراہ مسجد میں نماز کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک روز وہاں پہنچے تو مؤذن نہیں تھا۔ والد صاحب نے ویسے ہی بیٹے سے کہہ دیا تمہی اذان دے دو۔ یہ کہہ کر وہ ذرا ادھر ہوئے تو اس چھوٹے سے گورے بچے کو لوگوں نے جلدی جلدی وضو کر کے مکبّر پر چڑھتے دیکھا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں اذان کہنی شروع کی۔ والد صاحب غور سے سنتے رہے۔ انہیں پتہ تھا کہ ابوالاعلیٰ نے اذان نہیں سیکھی اس لیے ڈر تھا کہ کہیں درمیان میں بھول نہ جائے یا اٹک نہ جائے لیکن ابوالاعلیٰ نے بڑے اعتماد کے ساتھ پوری اذان صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کی۔ جب والد صاحب گھر آئے تو ان کا چہرہ خوشی و مسرت کے جذبات سے قندھاری انار کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ والدہ سے کہنے لگے آج تمہارے بیٹے نے کمال کر دیا۔ اذان دی اور نہ کہیں بھولا اور نہ اٹکا اور جتنے لوگ مسجد میں موجود تھے وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ابوالاعلیٰ کو پیار کیا۔

ایک روز بہت سے دوست تالاب میں نہا رہے تھے۔ ان میں ہمارے چچیرے بھائی بھی تھے کہ اتنے میں ابوالاعلیٰ بھی وہاں آنکلے۔ سارے اس ننھے مُنّے بچے کی طرف متوجہ ہو گئے جسے گھر والے اور اعزہ و اقربا پیار سے مُنّا جی کہتے تھے۔ کسی شوخ لڑکے نے ابوالاعلیٰ سے کہا مُنّا جی اللہ کا نام لے کر چھلانگ دو۔ کسی کو بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ یہ بچہ ایسی دلیری کا مظاہرہ کرے گا لیکن جب بچے نے بڑے ہو کر اپنی پوری زندگی سے بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق کی عملی تفسیر لکھی اس بچے نے اللہ کا نام لے کر دوسرے ہی لمحے بے خوف و خطر تالاب میں چھلانگ لگا دی۔"[1]

---

[1] ہفت روزہ آئین ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء

خود نوشت: "میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقے پر کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفاء کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انہوں نے یہ خیال رکھا تھا کہ میری زبان بگڑنے نہ پائے۔ جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا میں کوئی بازاری لفظ سیکھ لیتا تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح بولنے کی عادت ڈالتے۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہندوستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے اخلاق کی درستی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایسے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیا جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جب کبھی میں کوئی بُری عادت سیکھ لیتا تو بڑی کوشش سے اسے چھڑاتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک ملازمہ کے بچے کو مارا تو انہوں نے اس بچے کو بُلا کر کہا تو بھی اسے مار۔ اس سے مجھے ایسا سبق مِلا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیردست پر نہیں اٹھا۔ وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں کی صحبت میں لے جاتے تھے اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں مہذب عادات سیکھ گیا اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دلچسپی لیتے تھے کیونکہ میں شرارتیں کرنے کے بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔"[1]

ملک غلام علی صاحب جو عرصۂ دراز سے سیّد مودودی صاحب کے قریب رہے ہیں، انہوں نے "ایک رفیق کے تاثرات" کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سیّد مودودی صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: "گو مادی لحاظ سے والد صاحب نے میرے

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۴۰

لیے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا لیکن ان کا بہترین ورثہ جو میرے حصے میں آیا ہے وہ ان کی اخلاقی تربیت ہے۔" ——— پھر ملک صاحب لکھتے ہیں: "مجھے ابتدا میں جب مولانا سے نیاز حاصل ہوا تو ایک عجیب بات محسوس ہوئی تھی اور وہ یہ کہ مولانا کی زبان میں وہ تیزی، طراری اور زود گوئی مطلق نہیں تھی جو اکثر اہلِ زبان میں ہوتی ہے۔ مولانا اتنے دھیرے دھیرے اور اطمینان سے بولتے ہیں کہ کوئی چاہے تو سن کر لکھتا چلا جائے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے۔ بچپنے سے ہی مجھے بازاری لونڈوں اور لااُبالی نوجوانوں میں گھلنے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ گالی سے میری زبان آج تک آشنا نہیں ہوئی۔ مجھے والد صاحب ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کہیں گھر سے باہر جاتے تھے تو مجھے ساتھ ہی لے جایا کرتے تھے۔ ان کا آنا جانا عموماً سن رسیدہ، ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کے ہاں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں گفتگو ہمیشہ ٹھنڈے اور پُر سکون طریق پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی وقت سے ایسا طرزِ تکلم میرے لیے فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے[1]۔"

ابتدائی تعلیم

ابوالخیر مودودی صاحب: "ابوالاعلیٰ ہر کام اپنی عمر کے بچوں سے بہت پہلے سیکھتے چلے گئے۔ چونکہ انہوں نے پڑھنا بھی بہت پہلے سیکھ لیا تھا اس لیے ابوالاعلیٰ کے لیے رسمِ بسم اللہ بھی منعقد نہ ہو سکی۔ گھر میں بہت سے اخبار اور رسالے آتے تھے۔ میں اور ابوالاعلیٰ باری باری پڑھ کر ان کی خبریں اور مضامین والد صاحب کو سناتے۔ وہ ہمارے تلفظ کی تصحیح کرتے، مطالب کی وضاحت کرتے۔ اس طرح نہ صرف ہم اردو زبان سیکھ جاتے، بلکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا۔ شکوہ ہند پڑھی تو ہندوستان کی تاریخ کے چیدہ چیدہ واقعات کا ایک خاکہ ذہن میں بیٹھ گیا، مسلمانوں کی

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۶۰

خستہ حالی کا احساس ہوا اور جب مسدس حالی بھی اسی طرح والد صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھی تو مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ کے عروج و زوال کا علم ہوا۔[1]"

میرا بچپن: "میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ گھر کی یہ تعلیم میرے لیے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ پانچ چھ سال میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا جتنا دوسرے بچوں کو آٹھ سال میں ہوتا ہے، بلکہ جب مجھ کو گیارہ سال کی عمر میں مدرسے کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا تو اکثر مضمونوں میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ تھیں، حالانکہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔[2]"

مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعتِ رشدیہ میں داخل ہونے کے بعد: "مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے میل جول کا موقع ملا کیونکہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت ہی میں رہا تھا۔ مدرسے میں اول اول تھوڑے دنوں تک اجنبی رہا پھر میں نے مدرسے کی اس شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے جس میں سنجیدہ اور شوقین طالب علم تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محض اپنی ظرافت کے ذریعے سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں تو شریک نہیں ہوتا تھا مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا اور شریر ٹولی سے بھی میرے تعلقات نہ بگڑے۔[3]"

اورنگ آباد کا یہ مدرسہ فوقانیہ انٹرمیڈیٹ تک تھا جس کے پرنسپل ملّا داؤد بوہرہ تھے جو ابو الاعلیٰ سے بڑی مہربانی اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ "یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہوا۔ ذریعۂ تعلیم اردو تھی مگر کیمیا، طبعیات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے

---

[1] ہفت روزہ آئین: ۱۷/ اکتوبر ۶۸ء

[2] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۲۶

[3] ایضاً: ص ۴۰

واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رکھائی اور اکھل کھرے پن کو دور کر دیا جو ابتداءً سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بدولت پیدا ہو گئی تھی مگر اتنے دنوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا۔

والد مرحوم کی صحبت اور تلقین و تربیت سے مجھ میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو چکی تھی اور ان کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کر سکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہوا جب میں اپنی زندگی میں کلیتہً آزاد و خود مختار ہو گیا اور سر پر نگرانی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی جس نے مجھ کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ حالانکہ جب میں آزاد ہوا تھا اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی جس میں عام طور پر نوجوان کے لیے گمراہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

استادوں میں سے اکثر میرے اوپر مہربان تھے، خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں اور ان کے صاحبزادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ مدرسے ہی میں مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصّہ لینے کا موقعہ ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہوا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کام لینے کی کچھ صلاحیت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند مہینے ہی گزارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے تھے کہ روزانہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے اور مل کر کچھ مطالعہ کیا کریں گے اور مل کر تفریح بھی کریں گے۔

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں بہت کم دلچسپی تھی۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو بنوٹ[1] کے

---

[1] بنوٹ دو الفاظ بن اور اوٹ کا مجموعہ ہے یعنی یہ ایک ایسا فن ہے جس میں مدافعت کرنیوالا بغیر کسی پناہ یا ہتھیار یا اوٹ کے حملہ کرنے والے سے نہ صرف اپنے کو بچاتا ہے بلکہ حملہ کرنے والے پر (باقی ص ۵۸ پر)

فن سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت ماہر تھے۔ میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی مگر صرف تفریح کے لیے اس میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

تحریر و انشا کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز اشفاق احمد صاحب زاہدی (عطاب فراست ابید) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت تک ہمارے ہاں رہے۔ انہوں نے ہمارے دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشاپردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام رسالے اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو۔

یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں گلستان بوستان پڑھ چکا تھا اور اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے۔ ان

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷ سے) خالی ہاتھ بھی قابو پا لیتا ہے خواہ حملہ کرنے والے کے ہاتھ میں چاقو، خنجر، ڈنڈا یا تلوار ہی کیوں نہ ہو۔ یہ فن جاپانی کشتی جوڈو سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں پاکستان ٹائمز ۲۴ ستمبر ۶۷ء میں شاکر رضوانی کا مضمون: خود حفاظتی کا قدیم مسلم طریقہ۔)

معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا۔ مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوط کو دیکھ کر پھڑک اُٹھے تھے اور خصوصیت سے میرے خط کو انہوں نے زیادہ پسند کیا تھا۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدّت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ والد مرحوم کی شدید نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ مگر تعلیم سے جو کچھ وقت بچتا تھا اس میں اردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف مضامین اور اسالیبِ بیان ذہن نشین ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی سی فرصت میسّر آگئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی اس فرصت کے زمانہ میں اپنے بھائی کی تحریک پر مَیں نے قاسم امین بے کی کتاب المراۃ الجدیدۃ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں مگر مجھے خوب یاد ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاستِ زبان اور چٹخارے دار محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے بھی خوب داد دی تھی[۱]،،

سیّد ابوالخیر مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ مولوی کے امتحان کی تیاری کیا کرتے تو ابوالاعلیٰ بھی ان کے پاس آ بیٹھتے اور انہیں پڑھتا دیکھتے کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ ابوالخیر صاحب نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ جب وہ مولوی کے امتحان کا داخلہ بھیجنے لگے تو ابُوالاعلیٰ نے کہا میں بھی امتحان دوں گا۔ انہیں سخت حیرت ہوئی کہ نہ انہوں نے کتابیں دیکھیں، نہ پڑھائی کی، نہ سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ یہ کیسے امتحان دیں گے؟ جب انہوں نے اپنے طور پر برخوردار کا ٹیسٹ لیا تو اور بھی تعجب ہوا کہ اسے کچھ نہ کچھ شُدبُد ہے۔ لیکن اب دقّت یہ تھی کہ اتنی کم عمر کا اُمیدوار امتحان نہیں دے سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے قوانین میں

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۰ تا ۵۱

یہ گنجائش لی گئی۔ ابُوالاعلیٰ امتحان میں بیٹھے اور بھائی کے ساتھ ہی وہ بھی پاس ہو گئے — ابُوالاعلیٰ ان دنوں صرف گیارہ سال کے تھے[1]،،

والد صاحب کی رحلت

خود نوشت: "۱۹۱۴ء میں مَیں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہوا۔ اس زمانے میں والد مرحوم کی مشکلات بہت بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی تا ہم وہ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد تشریف لائے اور مجھے دار العلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرایا۔ اس زمانے میں مولانا حمید الدین صاحب فراہی مرحوم دار العلوم کے صدر تھے۔ والد مرحوم مجھے حیدر آباد میں چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور مَیں یہاں پڑھتا رہا۔ مگر تعلیم کا یہ سلسلہ چھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکا[2]،،

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے لکھا ہے کہ سیّد مودودی صاحب نے دہلی میں مولانا عبدالسلام صاحب سے عربی پڑھی۔ مولانا موصوف بہت کم لوگوں کو پڑھاتے تھے اور پھر اپنے طالب علموں کو ایسے وقت آنے کے لیے کہتے کہ صرف وہی طالب علم پہنچ سکتے تھے جنہیں واقعی پڑھنے کا شوق ہوتا تھا۔ ابُوالاعلیٰ کو وہ نماز فجر سے پہلے پڑھاتے۔ سردی کے زمانہ میں بھی یہ صبح ہی پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کا مُوڈ نہ ہوتا تو فرما دیتے سید میاں! آج تو طبیعت حاضر نہیں ہے اور ابُوالاعلیٰ اسی سردی میں لوٹ آتے[3]۔ اس کڑے وقت سے ابُوالاعلیٰ کے طلبِ علم کے ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے مولانا عبدالسلام نیازی صاحب مرحوم سے عربی صرف و نحو، معقولات اور معانی و بلاغت کی تعلیم حاصل کی، مولانا اشفاق الرحمان کاندھلوی مرحوم سے درسِ حدیث لیا اور مولانا شریف اللہ صاحب مدظلہ سے تفسیر بیضاوی فقہ میں ہدایہ اور معانی و بلاغت میں مطوّل پڑھیں[4]۔ پھر ساری عمر عربی کتب، تفاسیر، حدیث اور فقہ کے دشت

---

[1] ہفت روزہ آئین: ۱۷ اکتوبر ۶۸ء [2] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۱

[3] خورشید احمد: تذکرۂ زنداں۔ [4] عاصم نعمانی: مولانا مودودی پر جھوٹے الزامات: ص ۲۹-۳۰

کی سیاحی کرتے رہے پھر انہوں نے اسلامی علوم پر عہد آفریں تصانیف قلم بند کیں لیکن بعض علمائے کرام نے ان کے علم، تفقہ فی الدین اور اصابت رائے کو تسلیم کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کر دیا کہ انہوں نے ان جیسے کسی عالم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔

سید مودودی نے ایک دفعہ اس اعتراض کا جواب دیا "یہ ایک لاحاصل سوال ہے کہ میں نے کس عالم سے فیض حاصل کیا ہے؟ یہ سوال تو اس سے کرنا چاہیئے جس نے کوئی علمی کام نہ کیا ہو اور جس کے علمی مرتبہ و مقام کو جاننے کے لیے مدرسہ کی سند اور استادوں کے نام کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔ میں نے کام کیا ہے اور میرا کام کوئی چھپا ہوا نہیں۔ چھپا ہوا سب کے سامنے موجود ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے کیا کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اسے کتنا ہضم کیا ہے"۔

گویا سید مودودی صاحب نے کلاس میں بیٹھ کر دو ڈھائی سال ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد انہیں سکول یا کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ابتدا میں ان کے والدِ گرامی ہی ان کے استاد اور مربّی تھے تو ان کی رحلت کے بعد نوجوان ابوالاعلیٰ نے زیادہ تر اپنی محنت اور کوشش، ذوق اور شوق، لگن اور جذبے سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے مطالعے کو وسیع کیا اور عمیق بنایا۔ جوں جوں موقع ملتا گیا انہوں نے اردو اور عربی پر دسترس حاصل کرنے کے بعد انگریزی بھی سیکھی۔ پھر اس میں بھی اتنی مہارت حاصل کر لی کہ جدید دنیا کے علم کے دروازے بھی ان پر کھل گئے۔ ان کی ذاتی کمائی کا ایک معتد بہ حصہ ہمیشہ سے کتابوں پہ خرچ ہوتا رہا اور دن کا ایک تہائی حصہ مطالعے میں صرف ہوتا رہا۔ اس طرح انہوں نے عرق ریزی، تندہی اور جفاکشی سے نہ صرف اس کمی کو بہت جلد اپنی ذہانت و ریاضت سے دُور کر لیا جو ابتدائی زندگی کے ناسازگار معاشی حالات کی وجہ سے تعلیم میں رہ گئی تھی بلکہ انہوں نے اسلامی علوم اور جدید علوم دونوں میں خوب مہارت حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ اسلامی دنیا کے مسلمہ ممتاز عالمِ دین ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بیرون ملک کسی پاکستانی سے الجزائر، اردن یا کسی اور عرب ملک کا مسلم ملتا ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص پاکستانی ہے تو اس کی آنکھیں خوشی سے

چمک اُٹھتی ہیں اور وہ پوچھتا ہے "تم تو سیّد مودودی کو جانتے ہو گے ؟"

خود نوشت میں والد گرامی کی رحلت کا ذکر کرتے ہوئے سیّد مودودی لکھتے ہیں:

"ایک روز بھوپال سے دفعتہً اطلاع آئی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے ۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد سے روانہ ہوا اور بھوپال جا کر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہو گیا ۔ رفتہ رفتہ ان کے صحت یاب ہونے کی تمام اُمیدیں منقطع ہو گئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو محسوس کرانا شروع کیا ۔ ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزّت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لیے جدّ و جہد کیے بغیر گزارہ نہیں۔[1]"

محنت اور ذاتی مطالعہ

"١٩١٨ء میں سب سے پہلے میرے بھائی نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر ہوئے ۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر کام شروع کیا ۔ لیکن ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ ہم وہاں نہ نباہ سکے ۔ وہاں سے ہم دہلی واپس ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتدا ہو رہی تھی ۔[2]"

اس سیاسی تحریک اور اس میں سیّد مودودی نے کتنا حصّہ لیا اس بارے میں علی سفیان آفاقی نے لکھا ہے :" ١٩١٨ء میں سیّد مودودی نے اپنے بڑے بھائی کیساتھ ایک ایسی سیاسی جماعت کے ذہنی طور پر قریب آئے جو ہندوستان میں سیاسی انقلاب لانا چاہتی تھی ۔ مولانا حسرت موہانی ، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا عبدالباری فرنگی محل

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں ۔ ص ٤٢

[2] ایضاً : ص ٤٣

بھی اس جماعت کے ممبر تھے اور اسی ضمن میں ان کی مولانا حسرت موہانی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس جماعت میں مودودی صاحب کا حصّہ زیادہ تر ذہنی تھا۔ اسی زمانہ میں انہیں ان تمام سیاسی تحریکوں اور خفیہ سازشوں کی تاریخ دیکھنے کا موقع رہا جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے کی گئی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی مطالعہ کیا کہ ان سازشوں اور تحریکوں کو کس کس طرح چلایا گیا تھا اور ان کے ناکام ہونے کی کیا وجوہات تھیں۔ اس مطالعہ کا یہ مقصد تھا کہ اس سے پہلے لوگ جو غلطیاں کر چکے ہیں دوبارہ ان کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ لیکن اس جماعت کے ممبروں کی بے عملی کی وجہ سے مولانا مودودی اور ان کے بھائی بہت جلد اس سے علیحدہ ہو گئے"۔[1]

خود نوشت: "کچھ فطری آزاد خیالی کچھ ذاتی مطالعے کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ابتدا ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی اور طبیعت ایسی ہر تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کی جائے۔ اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہو گئے۔ بہر حال ان وجوہ سے ہم نے انجمنِ اعانتِ نظر بندانِ اسلام میں کام کرنا شروع کیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصّہ لیا۔

اس زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی جو صوبہ متوسط کے رہنے والے تھے اور انجمنِ اعانتِ نظر بندانِ اسلام کی روحِ رواں تھے۔ تاج الدین ان کا نام تھا۔ انہوں نے جبل پور سے تاج نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کی ایڈیٹری ہم دونوں بھائیوں کے سپرد کی۔ مگر وہ زمانہ اخبارات کے لیے سخت ناسازگار تھا۔ چند مہینے سے زیادہ تاج نہ نکل سکا اور ہم جبل پور سے بھوپال اور بھوپال سے دِلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا۔ خوش قسمتی سے ایک شفیق استاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مِل گئے جنہوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ

---

[1] علی سفیان آفاقی: ابوالاعلیٰ مودودی

لیا کہ اگر اس شاگرد کو پرائمر اور رگنگ ریڈر پڑھائی گئی تو اس کا دل اُکھڑ جائے گا۔ اس لیے انہوں نے ابتدا ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی۔

یہ تعلیم چار یا پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدّت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس مدت میں جو کچھ مَیں نے پڑھ لیا اس کے بعد مَیں استاد سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں نے خود انگریزی اخبارات، رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا۔ اوّل اوّل میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان کے محلِ استعمال اور مختلف اسالیبِ بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور مَیں نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دِقّت نہیں ہوئی۔[1]"

اور اب تو سیّد مودودی صاحب کو انگریزی پہ اتنی دسترس حاصل ہے کہ ——

مصباح الاسلام فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ سیّد مودودی کو "انگریزی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ پر بھی پوری مہارت اور عبور حاصل ہے۔ بارہا انہوں نے میری انگریزی تحریروں کی اصلاح کی ہے۔ مَیں نے جب کبھی اپنی انگریزی تحریر ان کے سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کی انہوں نے الفاظ یا فقرے کی ساخت میں معمولی تبدیلی اور بعض مقامات پر (Punctuation) لگا کر تحریر کو زیادہ خوبصورت، باوقار اور بامعنی بنا دیا ہے۔ مَیں نے اپنی ڈگری کے لیے اسے ہمیشہ تازیانۂ عبرت سمجھا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا اور جو ان کی عظمت کی دلیل ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اصلاح و ترمیم کرتے ہوئے میری تحریر کے الفاظ

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۳ تا ۴۵

کو اپنے الفاظ سے کبھی نہیں کاٹا۔ بلکہ ہمیشہ انہیں زیر لکیر کر کے حاشیے پر اپنی ترمیمات لکھ دیں۔ ان کی یہ ترمیمات بطور تجویز ہوتی تھیں۔ میں نے بطیب خاطر ہمیشہ انہیں قبول کیا کیونکہ اس طرح میری ہی تحریر زیادہ مؤثر اور خوبصورت بن جاتی تھی۔ البتہ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے ان کی ترمیم سے اتفاق نہیں کیا اس پر انہوں نے کہا "آپ سے کس نے کہا ہے کہ میری ترمیم حتمی ہے۔ میں تو ترمیم صرف بطور تجویز لکھتا ہوں اسے اختیار کرنا یا چھوڑ دینا آپ کی مرضی پر منحصر ہے اس معاملے میں آپ کو پوری آزادی حاصل ہے[1]۔"

---

[1] Misbah-ul-Islam Farooqi :- Introducing Maududi.

باب ۳

ایڈیٹر

تحریک خلافت

"اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی۔ مگر ۱۹۲۰ء سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔ بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر "تاج" نکالا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا۔[۱]"

تحریکِ خلافت نہ صرف سیّد مودودی صاحب کی زندگی کا ایک باب ہے بلکہ ہماری

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۵

قومی تاریخ کا ایک سنگِ میل ہے۔ اس لیے مختصراً اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ قاری کو اس زمانے کے سیاسی اور ملّی نشیب و فراز کا حال معلوم ہو سکے اور ہم سیّد مودودی کے حالاتِ زندگی کو اس پس منظر میں صحیح طرح دیکھ سکیں اور سمجھ سکیں۔

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل چھڑی تو یورپ کے مردِ بیمار ترکی نے جرمنی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی۔ ترکی میں اس وقت تک سلطنتِ عثمانیہ خلافت کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔ انگریزوں نے حریف کو زک پہنچانے اور اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے لارنس آف عریبیا کو عرب قومیت کا پرچارک بنا کر بھیجا۔ شریف حسین ہاشمی (شریفِ مکہ) اس کے جھانسے میں آگیا اور وسط ۱۹۱۵ء میں 'عربوں کی قومی آزادی' کے لیے مسلمانوں سے لڑائی شروع کی اور ترکی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ جنگِ عظیم اوّل اتحادیوں کی فتح کے ساتھ ختم ہوئی جنہوں نے خفیہ معاہدوں سے شروع جنگ سے ہی عثمانی سلطنت کی بندربانٹ کر رکھی تھی۔ مئی ۱۹۱۹ء میں عثمانی دارالحکومت میں سلطان برائے نام رہ گیا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے حصّے بخرے کر دیئے گئے۔ تھریس کا علاقہ یونان کو عنایت کر دیا اور سمرنا کو یونان نے بزورِ قوّت لے لیا۔ الجیریا سے لے کر بحرین تک کے علاقوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فرانس اور برطانیہ کی زیرِ نگرانی دے دیا۔

برّصغیر ہند و پاک میں مسلمان زعمانے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ خلیفۃ المسلمین اور ادارۂ خلافت ہمارا اصل ایمان ہے۔ چنانچہ سلطنتِ عثمانی کی شکست و انتشار کو دیکھ کر انہیں خدشہ ہوا کہ انگریز کہیں مرکزِ خلافت کو ختم نہ کر دے جسے ہندی مسلمان اپنا دینی و روحانی مرکز سمجھتے تھے (حالانکہ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت نے جب تک وہ کمزور نہ ہوئی کبھی عثمانیہ سلطنت کی برتری یا خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا) مسلم زعمانے وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور سیّد سلیمان ندوی وغیرہم پر مشتمل ایک وفد مارچ ۲۰ء کو لندن میں پہنچا جسے برطانوی حکومت نے جواب دیا کہ ترکی کے علاوہ دوسرے علاقے ترکوں کو نہیں دیئے جا سکتے۔ اس پر ہندوستان میں بقائے خلافت کے لیے زبردست تحریک اُٹھی۔ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور کانگرس نے پوری دلجمعی سے ساتھ دیا۔ دس اگست کو یوم

خلافت منایا گیا جس سے ملک گیر ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک مہینے میں تیس ہزار مسلمانوں نے اپنے آپ کو جیل کے لیے پیش کیا۔ گاؤں کے لوگوں تک میں خلافت کے چرچے تھے۔ بچہ بچہ گلیوں میں اسی کے گیت گا رہا تھا۔ لیکن معاملہ انجام کار مدعی سُست گواہ چست ثابت ہوا۔

وہ یوں کہ کمال اتاترک نے اپنی فراست و بہادری سے کافی علاقے انگریزوں سے واپس لے لیے، ترکوں کو متحد کیا اور کھویا ہوا وقار حاصل کیا۔ لیکن قوت حاصل کرتے ہی اس نے نومبر ۲۲ء میں سلطان محمد ہاشم کو معزول کر دیا اور مارچ ۲۴ء میں آخری اور کٹھ پتلی سلطان عبدالمجید کو ملک بدر کر کے ادارۂ خلافت کو ختم کر دیا۔ ڈاکٹر معین الحق لکھتے ہیں: "ہند و پاک میں تحریکِ خلافت سے منسلک مسلمانوں کے لیے (اتاترک کا یہ اقدام) ضربِ کاری کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نے سب سے بڑھ کر محمد علی جوہر کو صدمہ پہنچایا جو اس تحریک کی زندگی اور روح تھے۔ اب شریف حسین نے جو برطانوی شعبدہ بازی کا آلۂ کار بن کر مسلم دنیا میں بُری طرح بدنام ہو چکا تھا، دعویٰ کیا کہ وہ خلافت کا حق دار ہے۔ لیکن اب برطانیہ نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ وہابی لیڈر ابن سعود کے اسلحہ کی مدافعت نہ کر سکا اور ابنِ سعود نے سال کے خاتمے کے ساتھ ہی مکہ اور طائف پر قبضہ کر لیا اور حجاز کا اکثر حصّہ اس کے زیرنگیں ہو گیا۔"[1] اب تحریکِ خلافت کی ہمدردیاں اہلحدیث مسلک کے ابن سعود کے ساتھ تھیں۔ لیکن جب اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی تاریخی ہستیوں کے مزارات گرائے تو بدایونی، بریلوی اور کچھ دوسرے علماء تحریکِ خلافت سے الگ ہو گئے۔ تاہم خلافت کمیٹی نے ابن سعود کو خلیفۃ المسلمین بننے پر ۴ جنوری کو تار کے ذریعے مبارک دی صرف چار روز بعد ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو ابنِ سعود نے اعلان کر دیا کہ وہ حجاز کا (خلیفہ نہیں) بادشاہ ہے۔[2]

اور فیلڈ مارشل اتاترک نے خلافت عثمانیہ کے کھنڈرات پر جدید دینِ الٰہی کی عمارت

لے "History of Freedom Movement." VIII Part I.

لے Ibid.

کس طرح کھڑی کی؟ بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔

"مصطفےٰ کمال پاشا نے تو انتہا کر دی مغرب کی تقلید میں رہنا سہنا، کھانا پینا، لباس، ناچ رنگ، شراب خوری اور دوسری خرافات کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہاں تک کہ مدارس سے مذہبی تعلیم خارج کر دی اور اپنی زبان کا قدیم رسم الخط بھی بدل کر رومن کر دیا۔ ترکی اخبار نویسیوں کا جو وفد دلی آیا تھا۔ وہ بار بار بڑے فخر سے اپنے آپ کو یورپین نیشن کہتا تھا۔ دلی کے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں تشریف لائیں لیکن انہوں نے درخواست قبول نہ فرمائی۔ خاص کوشش سے ان کے پروگرام میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معائنہ بھی رکھا گیا تھا' مگر وہاں تشریف نہیں لے گئے اور ہندو یونیورسٹی بنارس کو جو ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھی اپنے قدوم سے مشرف کیا۔"[1]

اس طرح تحریکِ خلافت اپنے انجام کو پہنچی لیکن تاریخ ہند و پاک پہ اپنا اثر چھوڑ گئی اور آزادئ وطن کے لیے اجتماعی جدوجہد کا راستہ دکھلا گئی۔ سید ابوالاعلیٰ کی زندگی پر اس کا اثر یہ ہوا کہ انہیں تقریریں کرنے اور فنِ تقریر کی مشق اور اپنے ملّی جذبات کے اظہار کے لیے موقع مِلا۔

خودنوشت: "اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا اس لیے مجبوراً مجھے تقریریں بھی کرنی پڑیں حالانکہ مَیں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ بہرحال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے۔ ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی۔ پہلے میں ذمّہ داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب بھی کوئی ایسا کام درپیش ہوتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تھا۔ لیکن جبل پور میں جب مَیں نے تنہا کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمّہ داری پر اخبار نویسی اور پبلک کی خدمت کی تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں جو ضرورت کے موقعہ پر خود اُبھر آتی

---

[1] مولوی عبدالحق: سر سید احمد خاں ص ۳۴

ہیں اور میری مدد کرتی ہیں۔ اس وقت سے پھر کبھی میں کسی ذمہ داری کو قبول کرنے سے نہیں جھجکا۔ دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ میں اپنی زندگی میں کلیتہً خود مختار ہو گیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو عملاً برتنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا تھا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھی۔"[1]

اس زمانے میں لکھے ہوئے 'تاج' کے اداریے دیکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر میں عوامی جذبات سے اپیل کرنے کا اسلوب موجود ہے اور وہ تعقل، استدلال اور منطق کے اس نقطۂ عروج کو ابھی نہیں پہنچے تھے جو ان کی بعد کی تحریروں کا خاصا ہے۔ تاہم ان کی تحریر میں پختگی آ چکی تھی اور وہ گوناگوں مسائل کے بارے میں اس وقت بھی ایک متوازن رائے رکھتے تھے اور اس کی شہادت سیّد صاحب کی کتاب "اسلام کا سرچشمۂ قوت" کے مضامین دیتے ہیں جو سیّد صاحب نے اسی زمانے میں لکھے تھے۔ مثلاً اُن دنوں سیّد مودودی صاحب نے ایک اداریہ لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"سمرنا میں یونانی مظالم

دولتِ عثمانیہ دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا مرکزِ وحید ہے۔ اسلام کی مذہبی عزت اور مسلمانوں کی قومی حرمت کی حفاظتِ دنیاوی کے ذرائع میں سے اب صرف یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ لہٰذا اس کا باقی رہنا اب مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا حاصل کرنے کے ذرائع کا باقی رہنا ہے ——— مگر دیکھو! دولتِ عثمانیہ سے یورپ خالی کرا لیا گیا۔ عرب کو دھوکا دے کر اس سے علیٰحدہ کر لیا گیا۔ عراق، شام اور فلسطین بھی چھین لیے گئے اور آرمینیا بھی آزاد ہو گیا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس کو اپنے وطنِ قدیم اناطولیہ یعنی ایشیائے کوچک میں محدود ہو جانا پڑا۔ اب کم از کم اس رقبۂ زمین پر اس کا آزاد رہنا اس کی زندگی کے لیے نہایت

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں؛ ص ۴۵

ضروری ہے لیکن اس چھوٹے سے ملک میں بھی اس کو چین سے رہنے نہیں دیا جانا اور ولایت سمرنا پر یونان کو مسلط کر دیا گیا ہے۔[1]"

دسمبر ۲۰ء میں سیّد مودودی کو جبل پور چھوڑنا پڑا کیونکہ انہی دنوں ان کے لکھے ہوئے ایک مضمون پر انگریزی حکومت نے گرفت کی۔ چونکہ اخبار پر ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور سید مودودی حکومت کی گرفت سے بچ گئے۔ وہ اس صورت حال سے رنجیدہ تھے کہ ان کی تحریر کی وجہ سے دوسرا شخص قانونی گرفت میں آیا ہے چنانچہ وہ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں "مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی اور آئندہ کے لیے میں نے عہد کر لیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا بلکہ اپنی ہر جنبش قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔[2]"

ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی

ان دنوں اسلامیانِ ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد کا طوطی بول رہا تھا جنہوں نے الہلال اور البلاغ میں اپنے اچھوتے، دلنشین اور تیکھے اندازِ بیان سے لکھے ہوئے مضامین و مقالات کے ذریعے سے دلِ مسلم کو وہ ذوقِ تمنا دیا تھا جس نے قلوب کو گرما دیا تھا اور رُوح کو تڑپا دیا تھا۔ کون تھا جو ان کے سحرِ نگارش سے مسحور نہ ہوا ہو اور ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد مزید کی طلب نہ رکھتا ہو۔ انہوں نے قوم کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا اور بتلایا تھا کہ افلاس، نکبت، جہالت اور غیروں کی غلامی جیسی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پورے اسلام کی طرف آؤ، انفرادی و اجتماعی زندگی، عقائد و افکار اور سیرت و کردار کو قرآن و سنّت کے مطابق ڈھالو، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو تو آخرت کی سرخروئی کے علاوہ دنیا میں علم و سرفرازی، آزادی و حریت اور غلبہ و تفوق حاصل ہو گا۔

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۵

[2] ایضاً: ص ۴۶

پروفیسر محمد سرور نے جو مولانا عبید اللہ سندھی کے پیروکار، ابوالکلام آزاد کے مداح اور سید مودودی صاحب کے نقاد ہیں، اپنی کتاب "مولانا مودودی کی تحریک اسلامی" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید مودودی نے ابوالکلام آزاد کے انہی افکار کو اپنایا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور جن پر وہ خود بھی کانگرس میں شامل ہونے سے پہلے عمل پیرا تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر سرور صاحب نے دونوں بزرگوں کی زندگیوں اور تحریروں کا تقابل کر کے مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ دونوں بزرگوں نے کسی خاص فقہی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی اس کے باوجود محنت اور خداداد ذہانت سے دونوں نے قدیم و جدید علوم پر قابل رشک دسترس حاصل کر لی ہے۔ ۳۶ء میں سید مودودی نے اپنے بارے میں ترجمان القرآن میں لکھا "مجھے گروہ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے اور دونوں کوچوں میں چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا حق سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو۔"

مثلاً ابوالکلام آزاد نے لکھا "الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی، سیاسی ہوں خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا یہی ہے کہ اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔" ———— اور قریباً یہی بات سید مودودی صاحب نے ۱۹۴۷ء میں اپنی تقریر میں کہی جو شہادت حق کے نام سے شائع ہوئی۔ "اب میں مختصراً آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کس غرض کے لیے اٹھے ہیں۔ ہم ان سب لوگوں کو جو اسلام کو اپنا دین مانتے ہیں یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس دین کو واقعی اپنا دین بنائیں۔ اس کو انفرادی طور پر اپنی زندگیوں میں اور اجتماعی طور پر اپنے گھروں میں، اپنے خاندان میں، اپنی سوسائٹی میں، اپنی تعلیم گاہوں میں، اپنے ادب میں اور صحافت میں، اپنے کاروبار اور معاشی معاملات میں، اپنی پالیسی اور قومی اداروں میں اور بحیثیت مجموعی اپنی قومی پالیسی میں عملاً قائم کریں۔"

ابوالکلام آزاد نے الہلال میں لکھا "انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہے۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آزادی سے کان بہرے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیوں الگ کر دیں۔ ہمارے عقیدے میں تو وہ ہر خیال جو قرآن کے علاوہ اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے" ——— اس کے مقابلے میں سیّد مودودی صاحب کی سیاسی تحریریں اور کتابیں رکھ کر دیکھئے دونوں تحریریں ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔

حزب اللہ بنانے کے لیے ابوالکلام آزاد نے دعوت دی تو لکھا "دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی مگر وہ صرف ایک ہی تحریک حق و صداقت جو مسلمانوں کو ان کی حیات انفرادی و ملّی کی ہر شاخ میں مسلم بننے کی دعوت دے اور اپنی اس آواز کو اس طرح ہر فرد ملت کے دل و جگر میں اتار دے کہ خدا کے بندے پھر اس کے ہو جائیں، اس کے رشتے سے ٹوٹے ہوئے پھر اس کے ساتھ جُڑ جائیں، اس کے دروازے سے بھاگے ہوئے پھر اس کی غلامی کی زنجیریں پہن لیں۔ اور اس ایک کی غلامی کا حلقہ پہن کر تمام دنیا کو پھر اپنا غلام بنانے والے پھر اسی کی چوکھٹ پر جُھک جائیں تاکہ اس کے آگے جُھک کر سب کے آگے سربلند ہوں۔" ——— اور اس مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا:

"میں اب ہمہ وجوہ مستعدِ سفر ہوں اور ہمرہانِ سفر کے لیے صلائے عام ہے۔"

اس کے مقابلے میں "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں سیّد مودودی صاحب نے ایک مضمون لکھا اس میں کہا "لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے۔ البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی گروہ ایسا اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے، ایمان دار، دھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔"

پروفیسر سرور صاحب کے نزدیک ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی دونوں کی شخصیات میں بھی مماثلت ہے۔" دونوں دہلی کے مسلمان شرفاء کی روائتی تہذیب اور اُس کے معیارِ اخلاق کا بڑا اچھا نمونہ ہیں۔ اور دونوں کو اپنے طبقے کے مخصوص رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال رہتا ہے۔ مولانا آزاد کی طرح مولانا مودودی کو بھی اپنی گفتار، کردار، تحریر اور عادات پر بڑا قابو ہے۔ نیز ان کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط ہے۔ وہ بہت کم اشتعال میں آتے ہیں اور ان کے جذبات بھی شاذ و نادر بے عنان ہونے پاتے ہیں۔ یوپی اور دہلی کے پرانے مُسلمان شریف خاندانوں کی تربیت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے۔ سخت سے سخت حادثے میں اپنے اوپر پوری طرح قابو رکھنے کا جو نمونہ مولانا مودودی نے پچھلے دنوں پھانسی کا حکم ملنے پر پیش کیا وہ ان کے کردار کا بہترین رخ ہے۔ آپ اس وقت بھی ہر ایک سے حسبِ معمول کشادہ روئی سے ملے اور آپ کے چہرے پر کوئی اضطراب نہ تھا۔"[1]

پروفیسر سرور صاحب کے استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ سر سیّد احمد خاں کی تحریک کے نتیجے میں ایسے مسلمان لیڈر پیدا ہوئے جو انگریزی حکومت کے سامنے جھکنے اور مراعات مانگنے والے لوگ تھے۔ اس وقت آزاد نے نعرۂ حق بلند کیا اور ہر قسم کی دوئی ختم کر کے خدا کا یکسو بننے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں ایسی جاذبیت، ترنگ اور للکار تھی کہ نوجوان مسلمان آزاد کا کلمہ پڑھتے آگے بڑھے۔ علماء نے کہا کہ ابُوالکلام نے ہمیں بھُولا ہُوا سبق یاد دلایا۔ اسی دَور کو سرور صاحب "اسلامی رومانیت کا دور" کہتے ہیں۔ گویا مسلمان اسلامی تخیّل کے تُھلکے مشتاق ہو گئے۔ عین اُس وقت ہندوستان میں تحریکِ خلافت کو ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، جنگ بلقان میں ترکی کو شکست ہو گئی، مصطفےٰ کمال نے خلافت کو ختم کر کے لادینی حکومت قائم کی۔ چنانچہ ابُوالکلام جیسے عملی انسان نے اپنے آپ کو خیالی جنّت سے نکالا۔ چپ چاپ وطنی قومیت کی پناہ میں چلے گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر ۱۹۲۶ء میں ایک ایسی سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا جس کا رکن بننے

---

[1] محمد سرور: مولانا مودودی کی تحریک اسلامی۔ ص ۹۱، ۹۲

کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ کسی مذہبی جماعت کا ممبر نہ ہو۔ مولانا آزاد کی اس کایا پلٹ سے ان کے ذہنی مریدوں کو سخت پریشانی ہوئی لیکن ابوالکلام اس تبدیلی کے بارے میں ابوالسکوت ہی رہے اور پُورے اطمینانِ قلب کے ساتھ کانگرس میں شامل ہو گئے کہ اس سے الگ ان کا کوئی وجود ہی نہ رہا۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے ان دو بزرگوں اور ان کی تحریکِ افکار کا موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے "مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جس دعوتِ اسلامی کا عَلم بلند کیا تھا اس کا ہدف بھی مسلمانانِ ہند کا دُنیوی مفاد تھا۔ ان کی دعوت کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند اسلام کی اپیل پر آزادی کی جدّوجہد کریں۔ یہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں اسلام بحیثیت نظامِ زندگی کے قائم و نافذ ہو۔ لہٰذا جب حالات نے سازگاری نہ کی تو وہ صرف آزادئ ہند کے علمبردار بن کر رہ گئے تاکہ مسلمان انگریزوں سے نجات پاکر ترقی کی راہ پر دوڑنے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے لیے انہوں نے ہندوؤں سے بھی گٹھ جوڑ کیا اور کانگرس میں بھی شرکت کو ضروری سمجھا اپنی مشہور کتاب آزادئ ہند میں وہ اپنے اس نقطۂ نگاہ کو بالکل صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

لیکن مولانا مودودی نے جو تحریک اقامتِ دین جاری کی اور جس کا عملی مظہر جماعتِ اسلامی ہے۔ مولانا آزاد کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کسی قومی یا وطنی مفاد کا کوئی تصوّر نہیں۔ اس میں براہِ راست اِس فریضے کی ادائیگی کی دعوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام پر عائد ہوتا ہے[1]۔"

ہجرت کی تحریک

یہ بات قرینِ قیاس معلوم دیتی ہے کہ سیّد مودودی مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے الہلال کے زمانے کے خیالات سے متاثر ہوئے ہوں گے اور اخذ و استفادہ کرنے میں کوئی

---

[1] ہفت روزہ ایشیا: ۱۶ رجون ۱۹۶۹ء

بُرائی بھی نہیں اگر اندھے بہرے ہو کر تقلید نہ کی جائے۔ سیّد مودودی صاحب نے خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَرَ والے حکیمانہ قول پہ عمل کیا۔ آزاد کی اچھی باتوں کو اپنایا اور جن باتوں کو غلط سمجھا ان پر نہ صرف گرفت کی بلکہ اس پر سخت تنقید کرنے سے بھی نہ ہچکچائے۔ "مسئلۂ قومیت" اس کی سب سے نمایاں مثال ہے حتیٰ کہ اس زمانے میں بھی جب سیّد مودودی سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان تھے انہوں نے جذباتی ہونے کا ثبوت نہ دیا اور مولانا آزاد کی ہجرت کی تحریک میں شامل نہ ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رانچی جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے ہجرت کی تحریک شروع کی۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لیے یہاں سے ہجرت کر کے دارالاسلام چلے جانا چاہیئے۔ افغانستان کے بادشاہ امیر امان اللہ خاں نے ایک جلسہ عام میں کہا کہ بے شک ہندی مسلمان ہجرت کر کے اس کے ملک میں آ جائیں۔ مولانا آزاد کی اس تجویز پر مسلمان حسبِ معمول آنکھیں بند کر کے ہجرت کے لیے دوڑ پڑے۔ دہلی میں ہجرت کمیٹی قائم کی گئی اور ایک باقاعدہ دفتر بنایا گیا۔ اس تحریک کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہزاروں خاندانوں نے اونے پونے اپنا ساز و سامان اور زمین، مکانات اور جائیدادیں فروخت کیں اور افغانستان روانہ ہوئے۔ صرف اگست ۱۹۲۰ء کے ایک مہینے میں اٹھارہ ہزار لوگوں نے ہجرت کی۔ پانچ سے بیس لاکھ کے درمیان لوگ اس فتوے سے نہ صرف بے گھر ہوئے بلکہ انہیں ناقابلِ برداشت مصائب بھی سہنے پڑے۔

آفاقی: "مولانا مودودی اور ان کے بھائی نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا تھا۔ ہجرت کمیٹی کے سیکرٹری ان کے ایک شناسا مسٹر تجمل حسین تھے۔ انہوں نے دونوں بھائیوں کو ہجرت کرنے پر آمادہ کر لیا لیکن جب مفصل گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہجرت کمیٹی کے سامنے کوئی باقاعدہ منصوبہ یا سکیم نہیں ہے اور نہ ہی حکومت افغانستان سے اس سلسلے میں کوئی بات کی گئی ہے جہاں ہجرت کرنے والے قافلے جوق در جوق جا رہے تھے۔ مولوی مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ مودودی صاحب نے ان دونوں حضرات سے ملاقات کی اور منصوبہ بندی کے فقدان کا تذکرہ کیا۔

انہوں نے اس خامی کو تسلیم کر لیا اور مولانا مودودی سے درخواست کی کہ اس سلسلہ میں وہ ایک سکیم تیار کر دیں۔ مودودی صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ سب سے پہلے تو حکومتِ افغانستان سے یہ گفتگو کرنی ضروری ہے کہ آیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بسانے کے لیے آمادہ ہے یا نہیں اور یہ کہ اس آباد کاری کا طریقہ کیا ہوگا۔ افغانی سفیر سے گفتگو کی گئی تو معلوم ہوا کہ اب حکومتِ افغانستان خود پریشان ہے۔ جو مسلمان جا چکے ہیں انہیں واپس کرنے سے افغانستان کی حکومت جھجکتی ہے لیکن مسلمانوں کا بوجھ برداشت کرنا اس کے مقدور سے باہر ہے چنانچہ اس طرح سخت ناکامی سے دوچار ہو کر ہجرت کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ ہجرت کی تحریک تو ختم ہو گئی لیکن اس سلسلے میں مولانا نے جمعیت العلماء ہند کے ارکان سے جو ملاقاتیں کیں وہ بے اثر نہ گئیں اور کچھ عرصہ بعد جمعیت کی جانب سے اخبار جاری کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ اس کی ادارت کے لیے مولانا مودودی کا نام پیش کیا گیا۔[1]

الجمعیتہ کے ایڈیٹر

خودنوشت "۱۹۲۰ء کے خاتمے پر میں دہلی واپس ہوا۔ ۱۹۲۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی صدر و ناظم جمعیتہ العلماء ہند سے ہوئی۔ اسی سال انہوں نے جمعیتہ علمائے ہند کی طرف سے اخبار "مسلم" نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ اخبار ۲۳ء تک جاری رہا اور آخر تک میں ہی اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۶ء سے ۲۱ء تک کا زمانہ میرے لیے سخت مصائب، خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا مگر میں اس نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی میں

---

[1] علی سفیان آفاقی: ابوالاعلیٰ مودودی

بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیل تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچائی۔ ۲۳ء میں 'مسلم' بند ہو گیا اور مَیں نے حیدر آباد کے قصد سے دہلی چھوڑ دی لیکن رستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور مَیں نے حیدر آباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

بھوپال میں ڈیڑھ سال تک ہمہ تن مطالعے میں مشغول رہا اور بجز ایک دو مضامین کے تحریر کا کوئی کام نہ کیا ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پھر دہلی واپس آ گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجھے 'ہمدرد' میں اپنا مددگار بنائیں گے لیکن اس زمانے میں مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیتہ علماء ہند کی جانب سے اخبار 'الجمعیتہ' نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے الجمعیتہ کو ہمدرد پر ترجیح دینی پڑی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مَیں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔ غرض ۲۵ء کی ابتدا سے الجمعیتہ کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۸ء کی انتہا تک مَیں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا۔"[1]

محمد علی جوہر پہ ایک مضمون میں سیّد مودودی نے وجہ یوں بیان کی ہے "ابھی ہمدرد کے اجرا کے انتظامات ہو ہی رہے تھے کہ مَیں نے اس سے وابستہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل چند ہی روز بعد مَیں نے محسوس کر لیا تھا کہ فکری ہم آہنگی، جذباتی عقیدت اور سیاسی معاملات میں تمام تر اتفاق رائے کے باوجود میرا اور ان کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی مہر پدریں جبر پدر بھی شامل تھا اور وہ بھی پوری شدت اور انتہا پسندی کے ساتھ۔ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس نے خود میرے مزاج اور افتادِ طبع کا بھی ایک نہ ٹوٹنے والا سانچہ بنا دیا تھا۔ اگر ساتھ رہتا تو اندیشہ تھا کہ یہ سانچہ ٹوٹ نہ جائے۔ لہٰذا

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۶

میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہمدرد کے عملۂ ادارت سے وابستگی اختیار نہیں کروں گا البتہ اس سے باہر رہ کر جو خدمت بھی اس بطلِ جلیل کی بن آئے گی کروں گا۔"[1]

ان دنوں سیّد مودودی نے اخبار الجمعیتہ میں ایک اداریہ لکھا جس کا عنوان "مسلمانوں کی راہِ عمل" تھا۔ اس میں لکھا ——— "جمعیت العلماء کو اس طرف جلدی توجہ کرنی چاہیئے اور ایسی راہ بتلانی چاہیئے جس میں نہ تو وہ آزادی کی جدّوجہد میں ملک کی اور قوموں سے علیحدہ ہوں اور نہ خلافت اسلامی اور مقاماتِ مقدسہ کے مطالبے سے عملاً دست بردار ہوں۔ یہ مہلک غلطی ہو گی اگر ہم آزادی کے نام پر اپنی انفرادیت کو قربان کر دیں۔ خود جمعیت العلماء کا وجود ہماری انفرادیت کا کھلا نشان ہے اور یہ بات اسی نوبت پر صاف اور واضح ہو جانی چاہیئے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں اور اپنی اسی حیثیت کے استقرار کے ساتھ ہم آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیں گے ——— اوّل و آخر ہندوستانی یا اوّل ہندوستانی اور پھر سب کچھ اس قسم کے نظریئے ہمارے لیے قطعاً ناقابلِ قبول ہیں"۔

ملک غلام علی صاحب نے صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے ——— "جس زمانے میں مولانا کا ادارتی تعلق الجمعیتہ سے رہا ہے اس زمانے میں جمعیتہ علماء ہند، کانگرس کے نظریات و عملیات کی ہمنوا نہیں تھی بلکہ اس آزادانہ پالیسی پر چل رہی تھی جو مولانا محمد علی مرحوم نے اس زمانے میں ملکی و ملی مسائل کے بارے میں اختیار کی تھی[2]"

پروفیسر خورشید احمد صاحب سیّد مودودی صاحب کے اسلوبِ نگارش کے بارے میں لکھتے ہیں ——— "ادبی سٹائل پر گفتگو کے دوران مولانا (سیّد مودودی صاحب: مولف) نے بتایا کہ شروع شروع میں وہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر رہے لیکن کبھی بھی کسی کا تتبع نہیں کیا۔ ضرورت اور حالات کے مطابق ان کا سٹائل آپ ہی رونما ہوا۔ مولانا نے ایک دلچسپ بات یہ بھی بتائی کہ لکھتے وقت ان کو الفاظ کی تلاش و جستجو نہیں کرنا

---

[1] رئیس احمد جعفری: علی برادران

[2] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۲۶۲

پڑتی۔ خیالات ذہن میں پکتے رہتے ہیں اور پھر جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو صرف خیالات ہی نہیں بلکہ اظہار کی شکل بھی خیالات کی مناسبت سے آپ سے آپ صورت پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو اقبال نے اپنے اشعار کے بارے میں کہی ہے کہ الفاظ اور خیالات دونوں ایک ساتھ آتے ہیں اور (Inspired) محسوس ہوتے ہیں۔"[1]

خود نوشت: "ابتدائی تین چار سال تک نومشقی کی حالت تھی جس کا انداز تحریر پسند آجاتا تھا اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر جُوں جُوں مطالعہ بڑھتا گیا مَیں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے جس میں مَیں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔ مَیں اس نظریئے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں الفاظ وہی ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیئے باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو مَیں اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔"[2]

اس زمانے میں سیّد مودودی صاحب نے مصر کے ایک عربی ادیب مصطفےٰ کامل کی کتاب اَلْمَسْئَلَۃُ الْمَشْرِقِیَّۃ کا ترجمہ کیا۔ یہ ۲۳-۲۴ء کی بات ہے لیکن سیّد صاحب کے ایک کرم فرمانے اسے اپنے نام سے شائع کروایا۔ ان کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اب تک کسی سے ان صاحب کا نام نہیں لیا بلکہ پوچھنے پر بھی ٹال جاتے ہیں۔ انہوں نے ان دنوں اس کے علاوہ بھی انگریزی عربی کُتب کا ترجمہ کیا[3] جس کا ذکر بائنڈر کی کتاب میں

---

[1] خورشید احمد: تذکرۂ زنداں

[2] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۵۲

[3] Reng.— "Politics in Pakistan", P. 77

ملتا ہے بائنڈر لکھتا ہے:

"مولانا مودودی نے اٹھارہ سال کی عمر میں عربی سیکھنی شروع کی اور سب سے پہلے جو کتاب انہوں نے ترجمہ کی وہ ایک مصری کتاب تھی .... بائیس سال کی عمر میں مولانا نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ تحریکِ خلافت کے لیے انہوں نے انگریزی سے تین کتابیں اردو میں ترجمہ کیں جن کے نام یہ ہیں (۱) سمرقند پر کیا گزری (۲) ترکی میں عیسائیوں کی حالت۔ (۳) سمرنا میں یونانیوں کے انسانیت سوز مظالم ______ مولانا مودودی تحریکِ خلافت کے مقاصد سے اتفاق رکھتے تھے لیکن انہیں اس کے طریقِ کار سے اختلاف تھا (محمد علی جناح کا بھی یہی حال تھا)، تاہم ترکی مہاجرین کی مدد کے لیے انہوں نے اپنے کھانے اور تفریح کی مختصر پونجی میں سے کافی چندہ ادا کیا۔"[1]

جنگِ عظیم اول کے بعد کی، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کے بارے میں سیّد صاحب کا خیال یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلم سیاست کی ایک کمزوری تھی کہ خود اپنی بنیاد پر اور اپنے مسائل کے لیے سیاسی جدوجہد کم تھی اور ان معاملات پر مدار زیادہ تھا جو خود ان کے اپنے ہاتھوں میں نہ تھے۔ اسلام کی عالم گیریت کا فطری تقاضا تھا کہ سارے عالمِ اسلام کے مسائل ہمارے مسائل ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود مسلمانانِ ہند کا سیاسی نصب العین کیا ہو اور وہ اسلام کے تقاضوں کو سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں کس طرح پورا کریں اس کا شعور خاصا کم تھا۔

سید مودودی کے ذہن و کردار کا ایک خاص سانچہ بن چکا تھا۔ اسی ذہن و فکر سے وہ الجمعیۃ کے اداریے لکھتے رہے۔ ۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک چار سال تک وہ اس انداز میں قومی رہنمائی کا فرض انجام دینے کی کوشش کرتے رہے۔ الجمعیۃ کا ایک ہم عصر اخبار "الامان" تھا جو اسم بامسمیٰ تھا۔ مخالفین کی اس طرح خبر لیتا کہ مخالف بیچارہ الامان والحفیظ پکار اٹھتا اور تماشائی خوب دادِ تحسین دیتے تھے۔ اس لیے وہ پرچہ خوب بِکتا تھا۔ الجمعیۃ کے مالک اور جمعیۃ العلماء ہند

---

1. Ibid. p. 78.

کے کچھ قائدین یہ چاہتے تھے کہ الجمعیتہ بھی مخالفوں کو اسی طرح زیر کرے لیکن سید صاحب نے اپنے سنجیدہ، پُر وقار اور علمی اندازِ استدلال اور اسلوب کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اس وجہ سے انہیں ۱۹۲۸ء میں الجمعیتہ سے علیحدہ ہو جانا پڑا۔

ترجمہ و تالیف کا کام

ماہنامہ فاران کے مدیر ماہر القادری صاحب نے لکھا ہے:

"مولانا مودودی سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب انہوں نے کچھ دن پہلے سہ روزہ الجمعیتہ کی ملازمت ترک کی تھی اور حیدر آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے بلکہ رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ پنڈت کوچہ دہلی میں ابُوالاعلیٰ مودودی نام کے ایک خوش پوش اور موزوں قامت شخص سے ملاقات ہوئی جس کی نشست و برخاست میں وقار اور گفتگو میں سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت مولانا مودودی کے مکان میں کھانا نہیں پُرتکلف دعوت کھائی۔ مودودی صاحب نے ہمیں جس کمرے میں بٹھایا اور کھانا کھلایا وہ سجا ہوا تو نہیں تھا مگر جو چیز جہاں رکھی تھی اس میں سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر ایک نیا آدمی یہ قیاس کر سکتا تھا کہ جو کوئی اس کمرے میں رہتا ہے وہ سلیقہ مند ہے اور اس کی زندگی اُکھڑی اُکھڑی اور غیر مرتب نہیں ہے۔

نواب نثار جنگ بہادر اور ہم مولانا مودودی سے ملنے کے لیے جاتے رہتے تھے۔ مودودی صاحب از خود نواب صاحب کے ہاں بہت کم جاتے تھے۔ ہاں ایسا ہوتا کہ نواب صاحب نے موٹر بھیج کر انہیں بلوا لیا یا دعوت ہوئی تو مولانا اس میں شریک ہو گئے۔ ہمارے شدید اصرار پر ان دنوں مولانا مودودی نے دو یا تین بار سینما بھی دیکھا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مجھ پر تو فلم کا نشہ سا سوار تھا اور مولانا مودودی پہ ذرہ برابر اثر نہیں تھا جیسے انہوں نے فلمی تصویر دیکھی ہی نہ تھی اور دیکھی تھی تو اس کا شاید کوئی نقش ہی قبول نہیں کیا۔ سینما کی بلا چلتے وقت وہیں سینما ہال میں دامنِ فکر و خیال سے جھٹک کر چلے آتے۔ اس کے بعد بھی ہم نے مودودی صاحب سے سینما چلنے کے لیے کہا۔ یا یوں سمجھئے انہیں بہکایا

تو وہ طرح دے گئے اور پھر ہمیں بھی احساس ہو گیا کہ یہ شخص اُن چٹخاروں میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

مولانا مودودی تنہا رہتے تھے اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک ملازم تھا جو ڈاک خانے ڈاک وغیرہ لے جانے کا کام بھی کرتا تھا۔ میں اور نواب نثار جنگ کبھی ان سے ملنے جاتے اور چائے کا وقت ہوتا تو مولانا کے ہاں چائے بھی پیتے۔ کئی بار ان کے ہاتھ کے تلے ہوئے انڈے بھی کھائے۔ مولانا مودودی کی ترغیب دلانے پر نواب صاحب مرحوم نے اپنے ہاں کے تمام زیورات کی کئی سال تک کی زکوٰۃ ادا کی۔ خود مودودی صاحب نے کانٹے میں ایک ایک زیور کو تول کر اس کا وزن لکھا۔

ایک دعوت میں مولانا مودودی نے فانی بدایونی مرحوم کی اس غزل کی بہت تعریف کی جس کا مطلع ہے:

گُل خنداں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے

فانی نے کہا مولانا! آپ کو غزل پسند ہو تو میں لکھ کر دے دوں مولانا مسکرا کر بولے "ضرور —— میرا دل یہی چاہتا تھا مگر غیرت نے گوارا نہ کیا کہ آپ سے غزل کے لیے سوال کرتا۔"[1]

پروفیسر خورشید احمد صاحب: "ایک عرصہ سے مجھے جستجو تھی کہ مولانا کی شاعری کا سراغ لگاؤں اور اپنی سراغ رسانی کی کوششوں سے میں یقین کے ساتھ یہ معلوم کر چکا تھا کہ ۱۹۳۲ء میں چند ہفتے مولانا نے شاعری کی ہے بلکہ اس زمانے کے چند اشعار بھی میں نے حاصل کر لیے ہیں۔ گو مولانا کی رائے کے احترام میں ان کو شائع کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ مولانا سے میں نے بارہا اس بارے میں سوال کیا تھا اور ہمیشہ ٹال جاتے تھے لیکن جب اس مرتبہ میں نے ان کا تخلص بھی ان کو بتا دیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ میں واقفِ راز ہو چکا ہوں

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۴۳ تا ۳۴۴

تو انہوں نے بھی اعتراف کر لیا اور یہ بات بھی بتائی کہ میں نے چند ہفتے اس حماقت کی نذر کیے ہیں۔ چند غزلیں کہی تھیں لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری طبیعت کا فطری میلان اس طرف نہیں ہے اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا اور پھر کبھی بھول کر بھی یہ حماقت نہیں کی۔[1]"

اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ سید مودودی کو تو گفتار کی بجائے کردار کا غازی بننا تھا!

سید مودودی نے الجمعیۃ دہلی کی ادارت کے ساتھ ساتھ دو کتابیں لکھیں۔ الجہاد فی الاسلام کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ دوسری کتاب 'دولت آصفیہ و حکومتِ برطانیہ' تھی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں الجمعیۃ سے قطع تعلق ہو گیا تو —— خود نوشت: "اگست ۱۹۳۰ء تک حیدر آباد رہا اس مدت میں میں نے تاریخ آلِ سلجوق تالیف کی (یہ کتاب سلاجقہ کے نام سے پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔ مؤلف) اور ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے ہیں اگست ۳۰ء میں بیمار ہو کر میں دہلی واپس چلا گیا۔ چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخِ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا جسے لکھنے کا میں ایک عرصے سے ارادہ کر رہا تھا۔ جولائی ۳۱ء میں پھر حیدر آباد واپس آیا اور تاریخِ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا۔ اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ کی سیرت لکھی جو عنقریب مکمل ہو جائے گی اور ایک مختصر تاریخِ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ آج کل میں جامعہ عثمانیہ کے لیے صدرالدین شیرازی کی کتاب —— "الاسفار الاربعہ" کا ترجمہ کر رہا ہوں جو عربی میں فلسفے کی ادق کتاب ہے۔[2]"

یہ کتاب "الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ" تھی جو چار حصوں میں ہے۔ اسی لیے اسے الاسفار الاربعہ کہتے ہیں۔ اس کے پہلے دو حصوں کا ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے کیا اور یہ دونوں حصے ضخیم کتابوں کی شکل میں حیدر آباد دکن سے شائع

---

[1] خورشید احمد: تذکرۂ زنداں

[2] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۴۹

ہوئے۔ باقی دو سفروں کا ترجمہ سیّد مودودی صاحب نے کیا ان ضخیم کتابوں، فلسفے کی پیچیدگیوں اور ثقیل کام کو انہوں نے مسلسل بیٹھ کر آٹھ مہینوں میں مکمل کر دیا۔ اگر یہ کتابیں بھی شائع ہو جاتیں تو ساڑھے تین ہزار صفحات پر محیط ہوتیں۔ سیّد مودودی کو معاوضے میں جو رقم ملی اس سے انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی بہت سی کتابیں خریدیں۔ اس کے علاوہ "انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، کا پورا سیٹ خرید لیا۔ ماہر القادری نے سیّد صاحب کا فقرہ لکھا ہے "بھئی یہ رقم کسی نہ کسی کام میں خرچ ہو ہی جاتی میں نے ہمت کر کے یہ کتاب (انسائیکلو پیڈیا) بھی خرید لی"۔ ———— اور اسفار کے ترجمے کے معاوضے میں سے انہوں نے پانچ ہزار روپے الگ کر کے رسالہ ترجمان القرآن کے لیے وقف کر دیئے تاکہ بعد ازیں خریداروں کی قلت کی وجہ سے ان کا پیغام بند نہ ہو[1]

میرا جذبہ ناکام نہ جائے گا

آفاقی: "سرکاری ملازمت سے مودودی صاحب ہمیشہ گریزاں رہے۔ جن دنوں وہ حیدر آباد دکن میں تھے سرکاری ملازمتوں کے کئی مواقع نکلے اور ایک زمانہ میں مولانا مناظر احسن صاحب نے یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم و تدریس کے لیے مودودی صاحب کا نام پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کالج کی نئی نسل کو مذہب کی تعلیم جس طرح مولانا مودودی دے سکتے ہیں وہ خود یہ فرض اس خوبی سے شاید انجام نہ دے سکیں۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن نے سر اکبر حیدری سے گفتگو کرنے کے بعد مودودی صاحب کو کالج میں دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کالج کی طرف سے پیش کش کی گئی کہ وہ ہمہ وقت نہ پڑھا سکتے ہوں تو پارٹ ٹائم اپنی خدمات نذر کر سکتے ہیں۔ غرض مختلف طریقوں سے زور ڈالا گیا۔ لیکن مودودی صاحب نے یہ تجویز منظور نہ کی۔

ان دنوں مودودی صاحب حیدر آباد سے ترجمان القرآن نکالتے تھے ترجمان کی

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۴۹

مالی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی اور پرچے پر اپنی گرہ سے روپیہ صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ مناظر احسن صاحب کے کہنے پر مولانا کے بڑے بھائی نے بھی اس موضوع پر ان سے گفتگو کی انہیں کالج کی پروفیسری قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا نے کہا کہ وہ قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

بڑے بھائی نے انہیں سمجھایا کہ تم مسلمانوں کو دیکھ اور آزما چکے ہو۔ محمد علی جوہر کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ مسٹر جناح بھی تمہارے سامنے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر میں قابلیت، خلوص اور صداقت کی کمی نہیں تھی لیکن ان کی جیب خالی تھی۔ اس لیے قوم نے انہیں ایک طرف ہٹا دیا۔ ہر زمانے میں ان پر شبہ کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں مسٹر جناح اپنے ذاتی مصارف کے لیے بھی قوم کے محتاج نہیں ہیں اس لیے قوم ان کی نیت پر کسی قسم کا شبہ کر ہی نہیں سکتی اور ہر حالت میں لبیک کہنے پر آمادہ ہے۔ تمہاری جیب بھی خالی ہے تم خواہ کچھ بھی کرو سمجھا یہی جائے گا کہ تم کاروبار کے لیے اُٹھے ہو۔ ان حالات میں مناسب یہ ہوگا کہ تم کالج میں دینیات کی پروفیسری قبول کر لو۔ کالج والے تمہیں انتہائی گریڈ دینے کے لیے تیار ہیں۔ سال دو سال میں کچھ رقم تمہارے پاس پس انداز ہو جائے گی اس کے بعد تم چاہو تو سیاسی کام بھی شروع کر سکتے ہو۔

اس طویل لیکچر کے جواب میں مولانا مودودی نے کہا اب وقت ضائع کرنے کا وقت نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص ہوا تو میرا جذبہ ناکام نہ جائے گا۔ ان کے بھائی کا کہنا ہے کہ تقریباً چھ گھنٹے تک اس موضوع پر ان کی مودودی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران میں مودودی صاحب کی آواز بھر آگئی اور انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے وہ ۱۸۵۷ء والے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اپنی ہمت کے مطابق میں ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔[1]

---

[1] علی سفیان آفاقی: ابوالاعلیٰ مودودی۔

ماہر القادری صاحب: "حیدر آباد دکن جانا ہوا مولانا مودودی وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے اور اپنے بڑے بھائی سید ابوالخیر صاحب مودودی کے ہاں مقیم تھے۔ ابوالخیر صاحب دارالترجمہ عثمانیہ کے رکن تھے۔ عربی کتابوں کا ترجمہ ان سے متعلق تھا۔ بنگلے نما مکان تھا، سواری کے لیے موٹر تھی، نوکر چاکر تھے، اسی خوشحال ماحول میں مودودی صاحب اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں خوب میل جول تھا بلکہ قدرے بے تکلفی بھی تھی اگرچہ طبیعتوں اور مزاجوں میں کافی فرق تھا۔ جب مودودی صاحب نے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی تو وہ معظم جاہی مارکیٹ سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دو منزلہ مکان کے اوپر کے فلیٹ میں رہتے تھے اور ابوالخیر صاحب کے ہاں سے اُٹھ آئے تھے[1]"

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۴۴

باب ۴

الجہاد فی الاسلام

پس منظر

سیّد مودودی صاحب اخبار الجمعیتہ دہلی کے ایڈیٹر تھے کہ ہندوستان میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو بظاہر ایسا زیادہ غیر معمولی نہیں تھا لیکن سیّد مودودی کی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعے نے پھندنے والی ترکی ٹوپی پہننے والے، داڑھی صاف، اس نوجوان کو، جو اب تک اپنے مختصر حلقۂ تعارف میں "سیّد ابوالاعلیٰ مودودی" کے نام سے معروف تھا، اسلام کے ایک اہم مسئلے کی تفصیلات حاصل کرنے کے بہانے، اسلام کے کئی ایک گوشوں پہ تحقیق و مطالعہ کرنے کا موقعہ فراہم کیا اور اسی مطالعے کے دوران انہیں اسلام کی ہمہ گیری، وسعت اور مکمل و مربوط نظامِ حیات کی حیثیت کا علم ہوا۔ یہیں سے ان کی آنکھوں کے سامنے اسلام کے وہ آفاق کھل گئے جنہوں نے ان کے طرزِ فکر، مقصدِ زندگی حتیٰ کہ پوری زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ایک ولولہ انگیز لٹریچر تیار کیا، ایک فکری تحریک پیدا کر دی اور جدید ترین جمہوری، سیاسی، اسلامی تنظیم کی بنیاد رکھی جس سے بجا طور پر اسلام کے ایک

نئے دَور کی توقع قائم کی جا رہی ہے۔

ہؤا یوں کہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کو، جو آریہ سماج کے لیڈر تھے اور جنہوں نے اپنی ایک کتاب میں رسولِ خدا پر نارَوا حملے کیے تھے عبدالرشید نامی ایک مسلمان نے قتل کر دیا جس کے بعد ایک ہنگامہ خیز مقدمہ شروع ہؤا۔ اس واقعے پر ہندو مہاسبھائیوں، کانگرسیوں اور دوسرے تمام ہندوؤں نے اور ہندو پریس، اخبارات و رسائل نے ایک ملک گیر طوفان کھڑا کر دیا۔ اسلام اور خصوصًا نظریۂ جہاد کو ہدفِ طعن و تنقید بنایا جانے لگا کہ اسلام عقل اور دلیل کا مذہب نہیں اور یہ جنگجو عربوں، غیر متمدن بدوؤں اور زبردستی کلمہ پڑھوا کر لوگوں کو مسلمان بنانے والے خونخواروں کا مذہب ہے۔ اسلام عقل و دلیل، اپنے نظامِ حیات اور پیروکاروں کی عمدہ سیرت کی بجائے تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور آج بھی مسلمان تلوار سے ہی اغیار کو رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علمائے کرام مدافعت کی پناہ گاہ میں آ گئے کہ نہیں جی اسلام تو جارحانہ جنگ بالکل نہیں سکھاتا وہ تو صرف دشمن کی مدافعت کرنے کو جہاد کہتا ہے۔ اس معذرت خواہی کے باوجود مہاتما گاندھی نے یہ کہا کہ اسلام میں فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور اب بھی تلوار ہے۔

الجہاد فی الاسلام کے دیباچے میں سیّد صاحب نے لکھا ہے "اخبارات میں اس (عبدالرشید) کی جانب یہ خیالات منسوب کیے گئے تھے کہ وہ اس نیک کام کے کرنے سے جنت کا اُمیدوار ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اس واقعہ کو اس کی طبعی حدود تک محدود رکھنے کے بجائے تمام امتِ مسلمہ کو بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کیا اور قرآن کریم کے خلاف اس قسم کے الزامات عائد کرنے لگے کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے۔ اس کی تعلیم امن و امان اور مسالمت کے خلاف ہے اور اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اسے قتل کر کے جنت بن جانے کی اُمید رکھتے ہیں۔ بعض دریدہ دہنوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا۔"[1]

---

[1] الجہاد فی الاسلام: ص ۱۰

ان دنوں مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور کا معمول تھا کہ وہ دہلی میں نمازِ جمعہ کے بعد جامع مسجد کے صحن میں بنے ہوئے مکبّر پر کھڑے ہو کر حالاتِ حاضرہ پر تقریر کیا کرتے تھے۔ سیّد مودودی صاحب اس تقریر کو پوری پابندی سے سُنتے اور فکری رہنمائی حاصل کرتے۔ مولانا جوہر نے ہندوؤں کی بہتان تراشیوں اور بے بنیاد الزامات کا ذکر کیا۔ جوشِ خطابت میں وہ جذبات میں آگئے اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان الزامات کے جواب میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرتا۔ دہلی کی اس عظیم مسجد میں ہزاروں مسلمانوں کا مجمع جوہر کی تقریر سے حسبِ معمول بہت متاثر ہوا لیکن ایک نوجوان نے اس روز ایک عزمِ صمیم کیا اور اس کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔[1]

یہ نوجوان ابوالاعلیٰ مودودی تھا!

ان کا کہنا ہے "تقریر سُننے والوں میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ مَیں جب وہاں سے اٹھا تو یہ سوچتا ہوا اُٹھا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کر دوں۔[2]" مولانا محمد علی جوہر کی اپیل پر چوبیس سالہ ابوالاعلیٰ مودودی نے مسلمانوں اور اسلام کی مدافعت کے لیے قلم سنبھالا، یوں ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہوئی، جس نے پورے ماحول کو منور کر دیا۔ اگرچہ اخبار نویسی کے مشاغل اور مصروفیات کسی تحقیقی کام اور ریسرچ کے لیے موزوں نہیں ہوتے کیونکہ ایسے کام کے لیے یکسوئی سکون اور ہنگامہ آرائی سے دُوری درکار ہوتی ہیں لیکن ۲۷ء کے شروع میں انہوں نے الجمعیتہ کے کالموں میں اس علمی بحث کا آغاز کر دیا۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ چند ایک مضامین سے مبحث پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے گا لیکن ایک دفعہ چھڑنے کی دیر تھی کہ موضوع اور اس سے متعلقہ مسائل زلفِ یار کی طرح دراز ہوتے چلے گئے۔

مولانا محمد علی جوہر پر ایک مضمون میں سیّد صاحب لکھتے ہیں "واپس آ کر مَیں نے اس موضوع سے متعلق جتنی بھی معتبر اور مستند کتابیں فراہم ہو سکتی تھیں جمع کیں اور چند روز بعد

---

[1] رئیس احمد جعفری: علی برادران

[2] ایضاً

الجمعیۃ میں الجہاد فی الاسلام کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کر دیا۔ جب اس کے چوبیس نمبر شائع ہو چکے تو مَیں نے محسوس کیا کہ موضوع اتنا اہم ہے کہ مقالات کا متحمل نہیں ہو سکتا یہ ایک مستقل تصنیف کا طالب ہے۔ چنانچہ مَیں نے دو تین سال کی تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نام سے ایک کتاب مکمل کر لی جس کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے شائع کیا تھا بعد میں مزید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد مَیں نے خود اسے شائع کیا[1]"۔

۱۵ جون ۱۹۲۷ء کو سید مودودی صاحب نے دہلی میں بیٹھ کر اس کتاب کا دیباچہ لکھا جب کہ یہ پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں لکھا کہ جدید یورپ نے اسلام کو ہدفِ طنز و تضحیک بنایا اور اس پر بہت سے بہتان تراشے جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ تلوار کے زور سے مذہب کو پھیلانے کی تعلیم دے کر خونریزی کی ترغیب دیتا ہے۔" عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتابِ عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس بہتان کے مصنف یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سُرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرے کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود دوسری قوموں پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جن کی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہیئے[2]"۔

سید مودودی صاحب کے نزدیک یورپ کی اس دیدہ دلیری اور مسلمانوں کی مرعوبیت کی وجہ مسلمانوں کی سیاسی محکومی تھی" انسان کی یہ کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان

---

[1] رئیس احمد جعفری: علی برادران

[2] الجہاد فی الاسلام: ص ۸

میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جس کی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا اور اسی لیے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کیے جاتے ہیں[1]۔" ——— نتیجہ ظاہر ہے "اسلام کے وکلاء مخالفین سے مرعوب ہو کر خود بخود ملزموں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور مجرموں کی طرح صفائی پیش کرنے لگتے ہیں۔ کچھ نے اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین ہی میں ترمیم کر ڈالی اور شدتِ مرعوبیت میں جن جن چیزوں کو انہوں نے اپنے نزدیک خوفناک سمجھا، انہیں ریکارڈ پر سے بالکل غائب کر دیا تاکہ مخالفین کی نظر اس پر نہ پڑ سکے ——— دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول و عقائد کو خواہ کتنا ہی رنگ کر پیش کریں یہ ناممکن ہے کہ تمام مختلف الخیال گروہ ہم سے متفق ہو جائیں اور سب کو ہمارا وہ رنگ پسند آ جائے۔ اس لیے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد، اپنے مسائل، اپنی تعلیمات اور اپنے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دیں بہتر سے بہتر طریقے سے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں اور پھر خود اس کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ دعوت و تبلیغ کا صحیح اصول ہے جسے ہمیشہ سے اربابِ عزم لوگوں نے اختیار کیا ہے اور خود انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی پر عمل کیا ہے[2]۔"

جہادِ اسلامی کی حقیقت

سید مودودی صاحب نے وضاحت سے بتایا ہے کہ اسلام میں انسان کی جان قابلِ احترام ہے اور اسے ناحق قتل نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت کے دن انسانوں کے درمیان سب سے پہلے جس چیز کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جہاں قتلِ ناحق سے اتنی شدت سے منع کیا ہے وہیں قتل بالحق کی سخت تاکید کی ہے کہ جو فرد، افراد

---

[1] الجہاد فی الاسلام: ص ۸

[2] ایضاً: ص ۹

یا جماعت خدا کی زمین میں فتنہ و فساد پھیلائیں، ظلم و خونریزی کریں، لوگوں کے مال، آبرو اور جانوں سے تعرض کریں، اپنے جیسے بندوں کی آزادی سلب کر کے ان کے خدا بن بیٹھیں، ایسے فرعونوں کے ساتھ: "ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں فرض ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے اور ان مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے اللہ کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے جو شیطان کی اُمّت بن کر اولادِ آدم پر اخلاقی، روحانی اور مادّی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں[1]"

جہاد فی سبیل اللہ کی تشریح میں لکھا ہے "جو لوگ دنیا سے ظلم و طغیان کو مٹا کر عدل و انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں، جو سرکشوں اور فسادیوں کی جڑ کاٹ کر بندگانِ خدا کو امن و اطمینان سے زندگی بسر کرنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں، ان کی جنگ راہِ خدا کی جنگ ہے۔" مختصر الفاظ میں "قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں حمایتِ حق کی ایسی ناقابلِ تسخیر روح پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلّط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے[2]"

"قرآن مجید وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لیے مسلمان پیدا کیے گئے ہیں اور اصلی خدمت بھی بیان کرتا ہے جس کو انجام دینے کے لیے ان کی قوّت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا تم ایک بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اس ارشاد میں اخرجت للعرب یا اخرجت للعجم یا اخرجت للشرق نہیں کہا گیا بلکہ اخرجت للناس کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم

---

[1] الجہاد فی الاسلام: ص ۲۵

[2] ایضاً: ص ۲۹

ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم کریں اور بدی سے روکیں۔ ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے تخیل سے قومیت و وطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تنگ دماغ آشنا نہیں ہیں۔ وہ قوم پروری یا وطن پروری کو تو خوب جانتے ہیں اور قوم پرستی تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے۔ مگر جغرافی و نسلی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر سارے عالمِ انسانی کی عملی خدمت انجام دینا اور اسی کو پوری قوم کا مقصدِ حیات قرار دینا ان کی رسائی سے بہت دور ہے[1]۔"

سید مودودی صاحب کے مخالفین اپنی کم فہمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی بن گئے ہیں۔ حالانکہ وہ تو اپنی پہلی کتاب لکھتے وقت بھی سیاسی ذہن رکھتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے فتنہ و فساد کو مٹانے کے لیے حکومت الٰہیہ پر زور دیا ہے کیونکہ تمام وہ برائیاں جنہیں فتنہ و فساد سے تعبیر کیا گیا ہے دراصل ایک ناحق شناس اور ناخدا ترس نظامِ حکومت سے پیدا ہوتی ہیں" اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل انسان کے اخلاق و تمدن پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی اور مؤثر عامل حکومت ہے۔ حکومت کا نظام اگر غلط ہو اور اس کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے فساد اور خدمت نفس کے لیے استعمال کرتے ہوں تو ایسی حالت میں کسی نیکی کا سرسبز ہونا، کسی اصلاحی کوشش کا بار آور ہونا اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھولنا مشکل ہو جاتا ہے[2]۔"

"بس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لیے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جد و جہد (جہاد) سے اور اگر ضرورت پڑے تو جنگ (قتال) کے ذریعہ سے

---

[1] الجہاد فی الاسلام: ص ۶۲-۶۳

[2] ایضاً: ص ۹۱

ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور ان کی جگہ وہ عادلانہ نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور خدا کے مقرر کیے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے جو شخصی یا طبقاتی یا قومی اغراض کے بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے۔ جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں اور اپنی بڑائی کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی کے لیے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیں[1]۔"

"حکمِ قتال کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کی آزادی چھین لی جائے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کو حقیقی اور انسانیت پرور آزادی عطا کی جائے۔ ایسی آزادی جو اخلاقی حدود کی پابندی پر مبنی ہو اور ناروا قید اور ناروا بے قیدی دونوں سے پاک ہو۔ اسلام کی تلوار صرف ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھتی ہے خواہ اس شیطانی قوت کا شکار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب تک کوئی جماعت اس قوت کا استعمال ترک نہیں کرتی اس کے ساتھ اسلام کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر جس لمحہ وہ اس گناہِ عظیم کو ترک کر کے حق و انصاف کے قانون کی پابندی اختیار کر لیتی ہے ٹھیک اسی لمحے سے اس کا خون حرام ہو جاتا ہے اس کے مال اور اس کے اعراض کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے[2]۔"

"اسلام کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک قانونِ زندگی اور ایک نظامِ حیات ہے جس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور اختیار کر لینے کے بعد سب کے حقوق، اختیارات اور مراتب اس کے نظامِ اجتماعی میں یکساں قرار پاتے ہیں۔ اس کو انسان کی نسل یا رنگ یا

---

[1] الجہاد فی الاسلام، ص ۸۹

[2] ایضاً: ص ۹۰

وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور تنظیم حیات (انسانی) کا ایک قانون پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین ہے۔ اس طریقے اور قانون کو جو کوئی اختیار کرلے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ و امام کے درجے تک بھی پہنچا سکتی ہے ــــــ اس کے نزدیک اگر ایک حبشی غلام بھی صالح ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے نہیں روک سکتی۔" لے

سید صاحب نے وضاحت کی کہ عصا نہ ہو تو کلمی ہے کا یہ بے بنیاد۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، دعوت و تبلیغ کا مؤثر سے مؤثر انداز اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا، اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھائے، اپنے اخلاق اور اپنی پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ لیکن قوم نے آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ــــــ لیکن جب داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور خطبہ حجۃ الوداع کے موقعے پر کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے قبیلوں کے ایک دوسرے پہ خون کے دعوے اور مال کے دعوے میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ گویا اب وہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ تو انہوں نے موروثی امتیازات کا خاتمہ کر دیا، عزت و اقتدار کے تمام رسمی بُتوں کو توڑ دیا، ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی، اخلاقی قوانین کو بزور نافذ کر کے اس بدکاری و گناہ گاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی لذّتیں ان کو مدہوش کیے ہوتے تھیں۔ دِلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا، رُوحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں، گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہ رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔[۲]"

لے الجہاد فی الاسلام، ص: ۱۰۰

۲ے ایضاً ص، ۱۳۷ - ۱۳۸

اسلام نے دنیا میں آکر نہ صرف مقصدِ جنگ کو بدل دیا بلکہ طریقِ جنگ میں بھی انقلابی تبدیلیاں کیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں پر ہاتھ اُٹھانے سے منع کیا جو جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ پھر شور و ہنگامہ، بدنظمی و انتشار، لُوٹ مار اور تباہ کاری سے روکا، بدعہدی کرنے، سفیروں اور قیدیوں کو قتل کرنے، غفلت میں حملہ کرنے، مُثلہ کرنے اور آگ میں جلانے سے منع کیا۔ ان تمام امور کو سیّد صاحب نے اسلامی تاریخ کی درخشاں مثالوں سے واضح کیا ہے۔ "اس اصلاحی تعلیم نے آٹھ سال کی قلیل مدّت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کیے ان کا بہترین نمونہ فتح مکّہ ہے۔" ——— کہ جس شخص کو اہلِ مکّہ نے بُری طرح تکلیفیں دے کر نکالا، قتل کرنے کی کوشش کی، مدینہ پر بار بار زبردست فوجوں کے ساتھ حملہ کیا، جب وہ فاتح کی حیثیت میں مکہ میں داخل ہُوا تو "کوئی قتلِ عام نہیں کیا جاتا، لُوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی جان و مال اور عزّت و آبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، کسی پر انتقام کا ہاتھ نہیں اُٹھتا، دشمن گردنیں جُھکائے آگے کھڑے ہوتے ہیں فاتح پُوچھتا ہے اب تم کیا امید کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ جاؤ تم آزاد ہو آج تم سے کوئی باز پُرس نہیں۔"[1]

سیّد مودُودی کا اوّلین شاہکار

پانچ سو صفحات کی یہ ضخیم، تحقیقی اور عالمانہ کتاب سیّد مودودی صاحب کا پہلا تحریری شاہکار ہے جو ان کی تصنیفات میں آج بھی منفرد اور سرِفہرست ہے۔ اسی کتاب کے بارے میں علاّمہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا کہ یہ کتاب اِسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر ایک بہترین تصنیف ہے اور مَیں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔ نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ خود علاّمہ اقبال مرحوم نے یہ کتاب پڑھوا کر سُنی تھی اور اسے بہت پسند کیا تھا۔[2]

---

[1] الجہاد فی الاسلام۔ ص: ۱۹۴-۱۹۵-

[2] ہفت روزہ ایشیا۔ ۲۵ اپریل ۶۹ء۔

رئیس احمد جعفری نے ۱۹۳۷ء میں سیّد مودودی صاحب سے حیدرآباد دکن میں ملاقات کی جس کا حال لکھا: "بچپن سے مولانا ابو الاعلیٰ کے افکارِ دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہُوا تھا۔ یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ترجمان 'الجمعیۃ' کی ادارت ہاتھ میں لی اور اسے ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اول میں پہنچا دیا۔ شوامی شردھانند کے حادثۂ قتل کے بعد جس نے 'اِسلام اور تشدد کا مسئلہ' کے موضوع پر اس قدر عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہو گئے۔[۱]"

پاکستان کے ممتاز اور بے باک صحافی شورش کاشمیری صاحب کی شاہراہِ حیات کے ایک نمایاں سنگِ میل پر اسی کتاب کا نام لکھا ہُوا ہے —— الجہاد فی الاسلام!

وہ مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انگریز دشمنی اور آزادیٔ وطن کی خاطر قید ہوئے، پانچ سال قید کی سزا کاٹنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں انہیں منٹگمری (اب ساہیوال) سنٹرل جیل میں ڈالا گیا جہاں سوشلزم اور کمیونزم کے بڑے بڑے ہندوستانی جغادری لیڈر جمع تھے جن کے اثر سے کوئی اس ماحول میں مذہب کا نام نہیں لیتا تھا۔ پھر شورش صاحب نے دو سال تک اشتراکیت کا لٹریچر تفصیل سے پڑھا جس کا اثر ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہوا "سچ تو یہ ہے کہ میری ذہنی بنیادیں ہل گئیں۔ میں خدا کے وجود سے لے کر عام اخلاقی اقدار تک کے عقیدے میں ڈانواں ڈول ہو گیا۔ میں نے قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ترک کر دی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ مطلب جانے بغیر اس کی تلاوت بے فائدہ ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ (نعوذ باللہ) کو فرصت کے قہقہوں کا موضوع سمجھتا تھا اور اس مسئلہ کی تضحیک میں خوشی محسوس ہوتی تھی جو مذہب کے غیر عقلی وجود سے پیدا ہوتا ہے۔"

پھر ایک روز شورش صاحب کا جیل کے ہندو سپرنٹنڈنٹ سے جھگڑا ہو گیا۔ قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ جب پڑھنے کے لیے کتاب مانگی تو اس نے جیل کی لائبریری سے

---

[۱] رئیس احمد جعفری: دید و شنید۔

الجہاد فی الاسلام اُٹھا کر شاید اس خیال سے دے دی کہ اس میں اَنٹ اَنٹ زیادہ آتا ہے۔ ضرور یہ مسلمانوں کی کوئی مذہبی اور بے ضرر کتاب ہو گی۔ پھر کیا ہوا؟ شورش صاحب لکھتے ہیں

"میں نے تین دن میں تمام کتاب پڑھ ڈالی۔ یہ مطالعہ آنکھوں کی مشغولیت تک محدود رہا۔ دماغ میں ایک دھندلا سا نقش ہی قائم ہو سکا۔ البتہ دل نے ایک لطیف اثر ضرور قبول کیا۔ اب میں نے کتاب کے بیس صفحے بلا ناغہ پڑھنا اور ان پر اپنے فہم کے مطابق سوچنا شروع کیا جب میں کتاب ختم کر چکا تو مجھے اپنے دِل و دماغ میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوئی۔"

"میں نے کچھ دوستوں کو خطوط لکھے۔ انہوں نے مجھے مولانا ابوالاعلیٰ کی بعض دوسری کتابیں بھجوا دیں۔ میں نے انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان کے مطالعہ سے میرے ذہن سے شک و شبہ کے کانٹے نکل گئے اور میں نے پہلی دفعہ اسلام کی عملی بنیادوں کو محسوس کیا۔ میں ان بنیادوں کے بارے میں اپنے ہمراہیوں سے بے تکلف گفتگو کرتا۔ انہیں اپنے تصورات سمجھاتا اور ان کے تصورات سے موازنہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنوں میں اپنے اشتراکی نظریات کے متعلق شک کرتے ———— میں جب قید سے چھوٹا تو میرے لیے یہ اطمینان کا موجب تھا کہ میرا ذہن اعتقاداً مسلمان تھا اور اس کا عظیم سبب مولانا ابوالاعلیٰ کی کتابیں تھیں[1]۔"

ایک مغربی نقاد نے اس کتاب کو ہٹلر کی کتاب "مین کیمف" سے تشبیہ دی ہے مئی ۵۶ء کے "ٹائمز یونین فلوریڈا" میں جماعت اسلامی پاکستان کے خلاف مضمون شائع ہوا۔ مضمون نگار جان لیکیکوس نے لکھا "مودودی کی تسلیم شدہ صالحیت بھی شدید خطرے کا باعث ہے۔ اس کی جماعت کے ارکان جو صالحین سمجھے جاتے ہیں قرآن کے احکامات اور فرائض پر نہایت سختی سے عامل ہیں اور اسی لیے وہ مخلص، ایثار پیشہ اور پارسا قرار دیئے جاتے ہیں۔ مودودی کی اہم ترین کتاب الجہاد فی الاسلام بعض مغربی نقادوں کے

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۵۳۵ تا ۵۴۳۔

نزدیک ہٹلر کی مشہور کتاب مین کیمف (میری جدّوجہد) سے مشابہت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لیے جوش اور ولولہ انگیزی کا وسیع سامان موجود ہے[۱]۔"

الجہاد فی الاسلام ہی وہ کتاب ہے کہ جس سے بقول علامہ اقبالؒ ——————

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی —— —— اس کتاب کے بارے میں مصنف کی اپنی رائے بھی سُن لیجئے جو انہوں نے اپنی خود نوشت میں لکھی ہے۔

"اس کتاب نے سب سے زیادہ فائدہ خود مجھے پہنچایا ہے۔ میں نے جب اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے اندر دینی حمیّت سے زیادہ قومی حمیّت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ لیکن تالیف و تحقیق کے دوران میں جب مجھے ایک ترتیب کے ساتھ اسلام کے اساسی نظریات اور اس کے تفصیلی احکامات کا غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں نہ صرف نظامِ شریعت کا فہم اور اس کی حقّانیت کا غیر متزلزل یقین اُبھر آیا بلکہ اس نظام کے احیاء کا ولولہ بھی مجھ میں پیدا ہو گیا اور اس کے لیے کام کرنے کا طریقہ بھی میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد میں نے اخبار نویسی کے مروّج اور پامال راستے کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی۔ الجمعیۃ سے علیحدگی اختیار کر لی اور یہ طے کیا کہ صحافت کی دنیا میں اگر آئندہ قدم رکھوں گا تو صرف اس شرط پر کہ اسے دینِ حق کی خدمت کا ایک ذریعہ بناؤں۔ اس کے بعد میں مزید پانچ سال تک پھر صرف مطالعہ، لکھنے پڑھنے اور اپنی علمی استعداد بڑھانے کا کام کرتا رہا[۲]۔"

الجہاد فی الاسلام کی ترتیب و تصنیف کے دوران سیّد مودودی صاحب کو اسلام کی پوری وسعتوں کا صحیح شعور ہوا کہ اسلام تو ایک نظریۂ حیات ہے جو دنیا میں اپنے پیروکاروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس نظریہ کو نہ صرف اپنی اپنی انفرادی زندگی پر نافذ کریں بلکہ اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں بھی قرآن ہی سے رہنمائی لے کر معاشرے کی تعمیر کریں جس

---

۱ "The Times Union" May, 1956: Jhon Leacocks.

۲ مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ۳۶۳

کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلام کے پاس سیاسی قوت ہو اور جب تک یہ غلبہ و تفوق نہ ہو اسلام چاہتا ہے کہ ہم لوگوں میں اس بات کا شعور پیدا کریں۔ جو اس نظریہ کو بدل و جان مان لیں انہیں ایک پارٹی میں منظم کریں پھر تدبر و حکمت اور تزکیہ و تربیت سے ان میں نظم و ضبط، محنت و جفاکشی اور ایثار و قربانی کی حامل، عمدہ سیرت و کردار تعمیر کریں۔ جب قوت فراہم ہو جائے تو دنیا کے کسی خطے میں جہاں ممکن ہو اس پارٹی اور نظریے کے ہاتھ میں سیاسی قوت دینے کی کوشش کریں۔ پھر قانون، فوج، پولیس، خزانے اور عمدہ کردار کے لوگوں کے بل پر سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور عسکری ڈھانچے کو بتدریج قرآن کی بتلائی ہوئی ہدایات کے مطابق بدل دیا جائے۔ پھر ریاست اور عوام کے ذرائع و وسائل سے نہ صرف پوری دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچایا جائے اور ہر جگہ باطل کی بجائے اسلام کا بول بالا ہو بلکہ پوری کائنات پر خدا کا حکم (قرآن) ہی جاری و ساری ہو۔ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (تاکہ اسلام ہی دنیا کے تمام دوسرے نظام ہائے حیات پر غالب آئے) انبیائے کرام دنیا میں یہی انقلاب لانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے اور اب اسی انقلاب کو لانا ہر مسلم کا فرضِ عین ہے۔

اور جب سید مودودی کو اس مشن کی وسعت اور اہمیت کا احساس ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ دنیا میں اس شعور کو عام کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ ہے لیکن چند گنتی کے نفوسِ قدسیہ کے علاوہ نہ تو کوئی اس مشن کو جانتا ہے اور نہ اس کی اہمیت ہی سے واقف ہے۔ حالانکہ یہ ہر مسلم کی زندگی کا فرضِ عین ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی اب یکسو ہو گئے کہ اس مشن کو پھیلانا ہے۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا یہ نصب العین متعین کر لیا کہ وہ ہر دل میں اسلامی نظامِ حیات کو غالب کرنے کی تڑپ پیدا کریں گے۔ اس مقصدِ زندگی کو اپنانے والوں کو تنظیم کی لڑی میں پرو کر قوت فراہم کریں گے اور اسلامی انقلاب لانے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ جب

سیّد مودودی نے آتشِ نمرود میں بے خطر کُود پڑنے کا عزمِ مصمّم کر لیا تو اللہ تعالےٰ نے بھی انہیں کام کی راہیں سُجھا دیں۔

اور اس راہ کا سب سے پہلا قدم ترجمان القرآن کا اجراء تھا۔

باب ۵

ترجمان القرآن

تحریکِ مجاہدین

ترجمان القرآن موجودہ تحریکِ اسلامی کا سنگِ بنیاد ہے!

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ محض ایک اتفاق ہے یا اس کے پیچھے قدرت کا کوئی خاص راز ہے کہ ترجمان القرآن کے اجراء سے پورے دو سو سال پہلے ۱۷۳۱ء میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد دعوتِ اسلامی کا کام شروع کیا (اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۰۳ء میں گویا سیّد مودودی کی پیدائش سے پورے دو سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے) اور پورے ایک سو سال پہلے شمالی ہندوستان کی سرزمینِ بالاکوٹ میں احیائے اسلام کی معرکہ خیز تحریک کا آخری باب لکھا گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے ترجمان القرآن اسی پیغام کی صدائے بازگشت ہے جسے انیسویں صدی کے اوائل میں سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے فدائیان اسلام ساتھیوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دیا تھا۔ قاری کے ذہن میں مجاہدین کی اس عظیم تحریک کی ہلکی سی یاد تازہ کرنے کے لیے

ہم اس کا انتہائی مجمل ذکر یہاں کرتے ہیں تاکہ موجودہ تحریکِ اسلامی کا ماضی سے تاریخی ربط قائم رہے۔ اگر آپ اسے مفصّل پڑھنا چاہیں تو محترم غلام رسول مہر صاحب کی قابلِ قدر کتاب "سیّد احمد شہید" پڑھیں۔

سیّد احمد شہیدؒ رائے بریلی میں ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ صاحب سے دہلی میں علومِ اسلامی حاصل کیے۔ مولانا عبدالحیؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ شہید نے آپ کی بیعت کی۔ احیائے سنت اور نکاح بیوگان کے اعادہ سے احیائے دین کا کام شروع کیا۔ ۷۵۲ ساتھیوں کے ہمراہ ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ شریف کیا۔ چالیس سال کی عمر میں جہاد کے لیے ساڑھے چھ سو غازیوں کے ہمراہ ہجرت کی۔ اجمیر، سندھ، کوئٹہ، قندھار، غزنی اور کابل سے ہوتے ہوئے سات ماہ کے سفر کے بعد پشاور پہنچے۔ اس کے نزدیک چارسدے میں قیام کیا جو ان کے اصلی وطن سے ڈھائی ہزار میل دُور تھا۔ راستے میں بہت سے مقامات خصوصاً قندھار سے بہت سے غازی شوقِ شہادت میں آپ کی جماعت میں شامل ہوتے گئے۔ صوبہ سرحد کے بے شمار لوگ سیّد صاحب کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے۔

سرحد کو سیّد شہیدؒ نے اس خیال سے جہاد کا مرکز بنایا کہ یہ سارا علاقہ مسلمانوں کا تھا۔ اس زمانے میں رنجیت سنگھ کی حکومت پنجاب سے بڑھ کر پشاور تک پہنچ چکی تھی اور سکھ مسلمانوں کی جان و مال، عبادت گاہوں اور عزّت و آبرو پر اکثر و بیشتر دست درازی کرتے رہتے تھے۔ سیّد احمد شہیدؒ کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ اس علاقے کے لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں گے۔ چنانچہ اس تحریک کے معرکوں میں بہت سے مقامی لوگوں نے بہادری اور اولوالعزمی کے نشان چھوڑے۔ لیکن سرزمینِ ہزارہ کے چند کوتاہ اندیش مولویوں نے سردارانِ علاقہ سے مِلی بھگت کر کے اس تحریک کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔

موجودہ شہرِ نوشہرہ کے قریب اکوڑہ خٹک میں غازیوں نے پہلا معرکہ سر کیا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۲۲ء کو غازیوں نے آٹھ ہزار سکھوں کے زبردست لشکر پر مختصر سی تعداد کے ساتھ

شبخون مارا۔ سات سو سکھوں کو قتل اور بے شمار کو زخمی کر دیا۔ اگرچہ غازیوں میں شامل چند مقامی لوگوں کے حرصِ مال نے اس معرکے کو سخت نقصان پہنچایا تاہم جنگِ اکوڑہ کی کامیابی سے علاقے کے لوگ اور خوانین سیّد صاحب کے حلقہ میں شامل ہو گئے اور پانچ ہی سال میں ۱۸۲۷ء تک سیّد شہیدؒ کے ساتھ (بیعتِ امامت کے بعد) اسّی ہزار سرحدی جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔ پشاور کے خوانین بھی بیس ہزار کا لشکر اور آٹھ توپیں لے آئے۔

۶ فروری ۱۸۲۹ء جمعہ کے روز سیّد شہیدؒ نے اپنے نئے مرکز پنجتار میں عوام و خواص سے بیعت لی اور علاقے میں مروج برائیوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ یہاں رواج تھا علاقے کا خان جو کچھ بھی کرتا مُلّا لوگ اسے ثابت کر دیتے کہ یہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ اگر کوئی شخص مر جاتا تو مرحوم کے رشتہ دار مُلّا کو گُڑ اور پیسے دے دیتے اور مرنے والے کے گناہ ختم کروا لیتے اس رسم کا نام "اسقاط" تھا۔ بیٹیوں کے نکاح کے لیے گرانقدر رقوم وصول کرتے۔ اسی لیے وہ اکثر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔ لڑکیاں وراثت سے محروم تھیں۔ چار سے زیادہ نکاحوں کا رواج تھا۔ ان لوگوں کو لوٹ مار اور جہاد کے فرق کا قطعی علم نہیں تھا۔ گروہ بندی میں اپنے قبیلہ اور برادری کی ضرور حمایت کرتے تھے۔ خواہ یہ حمایتِ ناحق ہوتی۔ وعدے کو توڑتے ہوئے دل میں کوئی خلش تک محسوس نہیں کرتے تھے۔

تھوڑے ہی عرصے میں سیّد شہیدؒ کے اس کارنامے کے اثرات لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھنے شروع کیے۔ لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی، مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے، اپنے قبیلے کی ناحق طرفداری ختم ہو گئی، کوئی شخص بے نمازی نہ رہا، دوسروں کے جانور بھٹک کر کسی کے علاقے میں آجاتے تو بھی مالکوں کو پہنچا دیئے جاتے، جب مجرموں کو پناہ دینا ختم ہو گیا تو جرائم میں کمی آگئی، مانیری گاؤں کے لوگ مظلوموں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ جمائے ہوئے تھے اور اسی بات پر نوّے سال سے کشت و خون ہوتا چلا آرہا تھا جس میں اب تک چار ہزار مسلمان مر چکے تھے۔ سیّد شہیدؒ نے طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دی تو مانیری گاؤں والوں نے پوری زمینیں اصل مالکوں

کو دے دیں، اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔

سیّد شہیدؒ کی شخصیت اور دعوتِ جہاد کی کشش سے پورا علاقہ آپ کے حلقۂ ارادت میں آگیا۔ ہندوستان سے مالی اعانت پہنچنی شروع ہوئی اور مجاہدین کے قافلے آنے لگے۔ خٹک، آفریدی، شنواری اور مہمند وغیرہ قبائل بھی ساتھ آشامل ہوئے افغانستان کے غلزئی رؤسانے بھی جہاد میں شریک ہونے کی رضامندی ظاہر کی۔ ضلع ہزارہ کے لوگ بھی ہری سنگھ نلوہ کی زیادتیوں کے باعث سیّد شہیدؒ کی اعانت کے طالب ہوئے۔ ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں میں سکھوں کو اندازہ ہوا کہ ایسے عظیم قائد، غازیوں کی بے لوث اور منظم جماعت اور اسلام کے جذبۂ جہاد کے سامنے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکیں گے۔

المیۂ بالاکوٹ

لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اپنوں ہی نے نقصان پہنچایا۔ جب خوانین اور سرداروں نے دیکھا کہ عوام و خواص نے سیّد شہیدؒ کو ہیرو بنالیا ہے جن کے پاس نہ صرف سیاسی قوت ہے بلکہ ان کی محبت بھی لوگوں کے دل میں گھر کر گئی ہے تو انہیں فکر ہوئی کہ ان کی سرداری تو ختم ہوئی۔ چنانچہ جنگِ شیدو کے معرکے میں سکھوں کو شکست اور غازیوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی کہ پشاور کے یار محمد خاں دُرّانی نے عبداللہ بن اُبی والا کردار ادا کیا اور اپنی فوج کو لے کر میدانِ جنگ سے پلٹ گیا اور دوسروں کو بھی بہکایا تو باقی سردار بھی اپنی اپنی فوج لے کر بے تحاشا بھاگ اُٹھے۔ فتح شکست میں بدل گئی۔ چھ ہزار غازی شہید ہوئے۔ سکھوں نے سکھ کا سانس لیا اور جشنِ مسرت منایا۔ دُرّانیوں نے شرارتوں کا سلسلہ مزید دراز کیا تو سیّد شہیدؒ کو ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے جنگ اوتمان زئی لڑنی پڑی۔

ہندوستان سے غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ مولوی محبوب علی صاحب یہاں آئے تو انہوں نے آتے ہی سیّد شہیدؒ، ان کی طرزِ معاشرت، اور کارکردگی پر غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کردی۔ یہیں بس نہیں کی واپس وہ لوٹ گئے، اور ان کی کوششوں

کے نتیجے میں ہندوستان سے قافلے آنے بند ہو گئے۔

سید شہیدؒ نے قلعہ اٹک پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا تو ایک مقامی رئیس خادے خاں نے سکھوں کو اطلاع دے دی۔ حالانکہ یہ شخص سید صاحب کا پہلے بہت ہی معتقد تھا۔ جب اسے فہمائش کی گئی تو اس کے جواب میں یکبادلی بول رہا تھا۔ "ملا لوگ ہمارے یہاں اسقاط اور خیرات کھانے والے لوگ ہیں، انہیں کارو بارِ سیاست کا کیا شعور ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارے تابع ہیں، ہم ان کے تابع نہیں ہیں۔ ان کا جو مشورہ ہماری سمجھ میں آتا ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتا اسے نہیں مانتے۔" خادے خاں نے اسی پر بس نہیں کی رنجیت سنگھ کو پیغام بھیج کر سکھ لشکر منگوایا۔ سید شہیدؒ نے کمالِ جنگی فراست سے پنجتار میں سکھ لشکر کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ مقامی خوانین نے سید شہیدؒ صاحب کی تمام توانائیوں کو سکھوں کی بجائے منافقوں پر صرف کرنے پر مجبور کر دیا۔ خادے خاں اپنے قلعہ میں اور یار محمد دُرّانی جنگ زیدہ میں مارا گیا۔

اسی طرح ایک رئیس پائندہ خاں نے مجاہدین کے راستے میں کانٹے بوئے۔ ایک اور رئیس احمد خاں نے مردان میں مجاہدین کے خلاف تیاری کی۔ کھلابٹ والوں نے پانچ ہزار کا لشکر تیار کیا کہ تحریکِ مجاہدین اور غازیوں کو ختم کر دیں لیکن سید شہیدؒ کی بہادری اور فراست سے سب زیر ہو گئے تو پشاور کے دُرّانی چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار کی زبردست فوج لے کر سید شہیدؒ پر چڑھ دوڑے۔ ان کے ہمراہ چھ توپیں بھی تھیں۔ سید شہیدؒ کے پاس غازیوں، پٹھان مجاہدوں اور خوانین کی کل ساڑھے تین ہزار فوج تھی۔ مایار کی یہ جنگ غازیوں کے لیے ایک سخت دن تھا جس میں دُرّانیوں نے بار بار حملے کیے۔ آخر منہ کی کھا کر پشاور بھاگ گئے۔ اس سب کے باوجود جب دُرّانی معافی کے طلب گار ہوئے تو سید شہیدؒ نے معاف کر دیا۔

تحریکِ مجاہدین کا یہ روشن ترین لمحہ تھا جب سلطان محمد دُرّانی کی اطاعت سے خیبر سے امب تک پورا علاقہ سرحد اور اس کے وسائل سید صاحب کی دسترس میں آ گئے۔ ہر مقام پر تحصیل دار مقرر کیے گئے جو پیداوار کا عشر سید شہیدؒ کی اسلامی حکومت

کے بیت المال میں پہنچانے لگے۔ یہ عُشر وغیرہ پہلے مُلّاؤں کو ملتا تھا اس لیے انہیں یہ اسلامی نظام شاق گزرا۔ سادہ لوح پٹھانوں کی زمام تو انہی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ پٹھانوں کو مشتعل کرنے لگے۔ یہ حالات سرداران پشاور کے لیے حسبِ مراد تھے۔ انہوں نے یہ بات عام کی کہ ہندوستان کے علماء نے سیّد شہیدؒ کو انگریزوں کا جاسوس قرار دیا ہے۔ اِدھر مُلّاؤں نے پورے علاقے میں ایک محضر پھیلا دیا جس میں کہا کہ سیّد شہید کسی مذہب کے پیرو نہیں اور انہوں نے ایک نیا دین نکالا ہے۔

چنانچہ نومبر ۱۸۳۰ء کی ایک رات کو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پُورے علاقے کے دیہاتوں میں نقارے بج گئے۔ غازیوں نے حیران ہو کر پُوچھا کہ یہ نقّارے کیوں بج رہے ہیں تو انہیں بتایا گیا کہ "خندروس کوبی" یعنی ان نقّاروں کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اکٹھے ہوں اور وہ جوار کوٹیں۔ حالانکہ اس خفیہ کوڈ کا مطلب یہ تھا کہ غازیوں اور تحریکِ مجاہدین کو نہس نہس کر دو۔ چنانچہ ہر ہر جگہ بے خبر غازیوں کو چُن چُن کر شہید کر دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ ان کی لاشوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتے اور کہتے کہ اُٹھو اور ہمیں نماز کی تاکید کرو، اُٹھو اور ہم سے عشر وصول کرو۔

کچھ لوگ، اس علاقے کے لوگوں کو اس بے دردی کا قصور وار گردانتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ شاید اس مٹی کا خمیر ہی ایسا ہے۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آخر وہ لوگ بھی تو اسی علاقے کے تھے جنہوں نے تحریکِ مجاہدین کے لیے ہزاروں جانباز مہیّا کیے تھے۔ دراصل ہر زمانے میں تجدید و اصلاح کی تحریکوں کے ساتھ ابلہانِ مسجد اور غرض مندان دنیا مل کر یہی سلوک کرتے آئے ہیں تحریکِ مجاہدین کے لیے یہ کوئی خاص سلوک نہیں تھا۔

بہر حال سیّد شہیدؒ اس خوفناک واقعے سے سخت دل گرفتہ ہو گئے اور اس علاقے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانے کے قصد سے کشمیر کا رُخ کیا کہ ایک مقامی آدمی نے سکھوں کے لشکر کو مسلمانوں کے لشکر، تعداد اور مقام کے بارے میں اطلاع دے دی۔ سکھ جرنیل شیر سنگھ نے چاروں طرف سے ناکہ بندی کر دی اور سیّد شہیدؒ بالاکوٹ میں محصور ہو گئے۔ اس آخری معرکے میں سینکڑوں مجاہدین کے علاوہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سیّد احمد شہیدؒ نے

پوری پامردی سے اپنے سے زیادہ سکھ لشکر کا مقابلہ کیا اور سکھوں کی طرف اقدام کرتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو صبح گیارہ بجے کمال بہادری سے شہید ہوئے۔

سیّد شہید کی تحریک مجاہدین درسِ عبرت ہی نہیں درسِ عزیمت بھی ہے۔ اس میں تجدید و احیائے دین کا کام کرنے والوں کے لیے پیغامِ عمل بھی ہے اور طریقِ کار کی نشان دہی بھی ہے۔ اسی لیے سیّد شہید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جب سیّد مودودی نے تحریکِ اسلامی کا خاکہ سوچا تو انہیں خوب معلوم تھا کہ اس راہ میں کن مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا، نام کے مسلمان اور بڑے بڑے جبّہ و دستار کس طرح احیائے دین کے کام میں رکاوٹیں ڈالیں گے، اپنے ہی ساتھی کن نازک مراحل میں بے یار و مددگار چھوڑ جائیں گے، اہلِ مسجد نہ صرف کفر کے فتوے لے کر پہنچیں گے بلکہ وہ تحریک احیائے دین کے مقابلہ پر ہر سکّہ شاہی اور طاغوتی اقتدار کی مدد کرنے کو دوڑیں گے، انہیں ہندوستان میں احیائے اسلام کی اس آخری کوشش اور اس کے نشیب و فراز کا حال بھی معلوم تھا اور اس راہ کی مشکلات کا بھی اندازہ تھا تاہم انہوں نے ہر چہ باد اباد کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے حرفِ آغاز کے طور پر ماہنامہ ترجمان القرآن کی بنیاد رکھ دی۔

ترجمانُ القرآن

قرآنی پیغام کو پھیلانے کی مناسبت سے ماہنامے کے لیے ترجمان القرآن موزوں نام تھا۔ اس نام کا ایک رسالہ پہلے شائع ہوا کرتا تھا جسے عالمگیر تحریکِ قرآنی کے علمبردار مولوی ابو محمد مصلح صاحب ڈیڑھ دو سال سے چلا رہے تھے۔ سیّد مودودی صاحب نے انہی سے یہ پرچہ لیا اور اب تک قریباً چالیس سال سے یہ برابر شائع ہو رہا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ سیّد مودودی اور جماعتِ اسلامی عام گفتگوؤں میں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں تو اس میں بھی شک نہیں کہ ترجمان القرآن اور سیّد مودودی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

سیّد صاحب نے اس پرچے کو اپنی تحویل میں لیا تو شروع میں یہ ماہنامہ حیدرآباد سے

۹۶ صفحات پہ شائع ہوتا تھا۔ جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں دارالاسلام سے ۸۰ صفحات پر شائع ہوتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا کاغذ کمتر اور معیارِ طباعت بہتر ہو گیا اور صفحات ۶۴ ہو گئے سائز ہمیشہ ۹½ × ۶ ہی رہا۔ ایّامِ اسیری کے علاوہ سیّد مودودی ہی ہمیشہ اس کے مدیر رہے اور وہی اس کا اداریہ لکھتے رہے جس کا عنوان اشارات ہے کچھ عرصہ یہ اداریہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے رہے۔ پھر نعیم صدّیقی صاحب لکھتے رہے اور اب کافی عرصے سے اداریہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب ایم اے لکھتے ہیں۔

سیّد مودودی صاحب نے ترجمان القرآن کے دَورِ جدید کے پہلے شمارہ کے اشارات لکھے۔ ترجمان القرآن کے اس حرفِ آغاز کو پڑھ کر تحریکِ اسلامی کے حقیر آغاز کا احساس بیدار ہوتا ہے "یہ رسالہ آج جس مرحلے میں قدم رکھ رہا ہے وہ بہت کٹھن اور دشوار ہے۔ کٹھن اور دشوار اس معنی میں نہیں کہ اس کے پیشِ نظر اب پہلے سے زیادہ مشکل کام ہے بلکہ اس معنی میں بھی کہ جن ہاتھوں میں وہ منتقل ہو رہا ہے وہ پہلے کام کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ کمزور ہیں اور اب یہ کام اس شخص کے سپرد کیا جا رہا ہے جو انکسار کے طور پر نہیں اعترافِ حقیقت کے طور پر اپنی کمزوری، اپنی بے چارگی اور اپنی بے مائگی کو تسلیم کرتا ہے اور ہر شخص سے زیادہ خود اپنے عجز و درماندگی سے واقف ہے ...... کام کی دشواری اور اپنی کمزوری کو جاننے کے باوجود محض خدمت کے جذبہ نے مجھ کو اس دعوت کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو مجھے اس کام کی جانب دی گئی تھی اور اس بھروسہ نے میری ہمّت بڑھائی کہ جس خدا نے میرے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا تھا وہی رسوخِ علم، صحتِ فکر، سلامتیٔ قلب اور طہارتِ نفس و روح بھی ارزانی فرمائے گا۔"[1]

ترجمان القرآن شروع ہوا تو اس کا دفتر حیدر آباد دکن کی نظام شاہی روڈ پہ بدرالدین بلڈنگ پہ تھا جس جذبے اور مقصد کے ساتھ اس ماہنامے کو شروع کیا گیا تھا اور

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ عدد ۱۔ ص ۲ تا ۵

جس مقصد کی تکمیل یہ ابھی تک کر رہا ہے اسے ابتدائی چند سالوں تک اس جریدہ کے آخری صفحہ پہ نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا غالباً یہ مناسب ہو گا کہ تاریخی ربط کو قائم رکھنے کے لیے اس عبارت کو دُہرا دیا جائے ——— "تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی رسالہ ہے اس کا مقصدِ وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصولِ تہذیب و تمدن پھیل رہے ہیں ان پر قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔ یہ رسالہ اُمتِ مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ ' اپنے دل اور دماغ کو مسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اُٹھو اور دُنیا میں غالب بن کر رہو۔"

ایک ہی سال میں سید صاحب کو ایسی مشکلات اور لوگوں کی عدم توجہی کا تجربہ ہوا کہ انہوں نے دُوسرے سال کے آغاز میں اداریہ لکھتے ہوئے کہا کہ خدا نے ——— "سخت ہمت شکن حالات میں کمر بستہ رہنے کی جو استقامت بخشی اس کے لیے شکر بجالانا میرا فرض ہے...... مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہیں ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے اگر میرا اعتقاد خدا کے بجائے دنیوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا...... اس رسالے کی ادارت ہاتھ میں لینے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ مسلمان علمِ قرآن کے پیاسے ہی نہیں قرآن کی دعوت سُننے کے لیے ان میں پوشیدہ تڑپ موجود ہے۔ مگر کمی جو کچھ بھی ہے صرف اس بات کی ہے کہ اس جنس کے پیش کرنے والے کمیاب ہیں۔ لیکن گزشتہ ایک سال کے تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے قرآن کے نام میں اتنی بھی کشش نہیں ہے جتنی فلم ستاروں کی تصویروں میں ہے۔ کسی کتاب یا رسالے پر قرآن کا نام آجانا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ مسلمان اس سے بھاگیں اور شجرِ ممنوع سمجھ کر اس کو ہاتھ

نہ لگائیں۔[1]"

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں۔ ہمیشہ دیکھیں گے کہ جب بھی کسی مردِ حق آگاہ نے دعوت حق دی تو اس کے لیے پھولوں کی سیج کبھی نہیں سجائی گئی۔ اس کے راستے میں ہمیشہ مشکلات کی دیواریں اور مصائب کے پہاڑ ہی کھڑے کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی راہ پہ چلنے والوں کو بیماری، بھوک، افلاس اور پریشانیوں سے آزماتا ہے اور جو جتنی پامردی دکھاتا ہے اتنا ہی اسے انعامات سے نوازتا ہے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ ترجمان کی ابتدائی فائلیں اس کی گواہ ہیں۔ سیّد صاحب نے لکھا ——— "ربیع الاوّل اور ربیع الثانی کے دونوں مہینے سخت جسمانی تکلیفوں کے ساتھ گزرے۔ ربیع الاوّل کا پرچہ طبیعت پر جبر کر کے حسبِ دستور مرتّب کیا۔ مگر بیماری اور محنت نے دل و دماغ پر ایسا بُرا اثر کیا کہ ربیع الثانی کے پرچے میں نقد و نظر کے سوا اور کچھ نہ لکھ سکا" ——— اور کچھ عرصہ بعد لکھا "دوسرے سال میں خدا کے فضل نے یُسر کی صورت دکھائی اور اب تیسرے سال کے آغاز میں پھر عُسر کے آثار نظر آرہے ہیں۔[2]"

رسالہ نہیں، مشن اور پیغام ہے

ترجمان القرآن کی حالت تسلّی بخش نہیں تھی۔ ایک دفعہ سیّد صاحب نے اشاعت بڑھانے کے لیے اپیل کی ——— "ادارہ ترجمان القرآن کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک مقصد ہے اور وہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دینا ہے۔ رسالہ کی اشاعت فی نفسہٖ مقصود نہیں بلکہ محض اس دعوت کی اشاعت کے لیے ہے۔ ہر داعی و مبلغ کی طرح ہماری بھی یہ دِلی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں تک یہ پیغام پہنچے۔ ہمیں خریداروں کی ضرورت نہیں پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اگر ایک

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۴ شمارہ ۱۔

[2] ایضاً ج ۴ عدد ۶۔

رسالہ کو ہزار ہزار آدمی بھی پڑھیں تو ہمیں رنج نہ ہوگا بلکہ مسرت ہوگی۔ اگر ہمارے مضامین اخباروں اور رسالوں میں نقل کیے جائیں تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے کہ انہوں نے اس دعوت میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔"[1]

حتیٰ کہ حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ 'الجمعیتہ' اور 'صدق' نے لوگوں کو توجہ دلائی کہ دینی مشن کا ایسا اہم ماہنامہ کہیں بند نہ ہو جاتے۔ اس وقت مولانا نے ترجمان جلد نمبر ۸ عدد ۶ میں لکھا ——— "ترجمان القرآن کی اشاعت اس وقت چھ سو ہے دوسری قوموں کے علمی ذوق اور جرائد کی اشاعت دیکھتے ہوئے تو یہ تعداد بہت کم ہے۔ مگر مسلمانوں کی ذہنی حالت کے لحاظ سے اس کو بہت زیادہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ دُوسرا ہے۔ اس چھ سو کی تعداد میں سے پورے نصف کی خریدار سرکارِ آصفیہ ہے۔ اگر ان تین سو پرچوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی اس آبادی میں صرف تین سو اصحاب ایسے ہیں جو ترجمان القرآن کی وضع کا ایک رسالہ پڑھنے کے لیے کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔"[2]

حالات اس سے بھی دگرگوں ہو گئے۔ سیّد صاحب کو دعوتِ حق کے سلسلے میں مزید ایک چوٹ سہنی پڑی۔ لیکن ایک خدا سے مانگنے والا بندوں کا دستِ نگر نہ ہُوا۔ سیّد صاحب نے خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کی تفصیل میں ماہر القادری صاحب نے لکھا ہے ——— "ریاست حیدر آباد دکن کا محکمہ امورِ مذہبی رسالہ ترجمان القرآن کے کئی سو پرچے خریدتا تھا۔ ایک سال یہ خریداری روک دی گئی۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے اس کی منظوری متعلق تھی۔ نواب صاحب یہ چاہتے تھے بلکہ متمنی تھے کہ مودودی صاحب ان سے خود آ کر کہیں تو وہ منظوری دے دیں۔ مولانا مودودی صاحب کو جب یہ اطلاع ملی تو بولے کہ میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہیں

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۶ عدد ۷۔

[2] ایضاً جلد ۸ عدد ۲۔

جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب نہیں گئے اور انہیں خاصا مالی نقصان اُٹھانا پڑا[۱]۔"

لیکن جس شخص نے اپنی پوری زندگی اپنے مشن کے لیے وقف کر دی تھی اسے پہلے قدم پر ہی معلوم تھا کہ اس کے راستے میں یہ مشکلات آئیں گی۔ حالات پریشان کُن ہو جائیں گے۔ کوئی پُرسانِ حال بھی نہ ہوگا۔ ان حالات کا تحمل، مستقل مزاجی اور پامردی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لیے اس مردِ درویش نے کہ جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ، تند و تیز ہوا میں بھی ترجمان القرآن کا چراغ جلائے رکھا اور آج برِصغیر ہند و پاک کا شاید ہی کوئی اردو رسالہ اس کے مدِمقابل رکھا جا سکے جو اتنے عرصہ دراز سے اور اس باقاعدگی سے اپنی قدیم وضع کے ساتھ شائع ہو رہا ہو۔ دو دفعہ کی جبری بندش کے علاوہ کہ جب حکومتِ پاکستان نے اِسے بند کیا، یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے اور اس کی اشاعت مسلسل بڑھتی ہی رہی ہے۔

تشکیلِ جماعت اسلامی سے پہلے تک اس کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ بتدریج ۱۹۶۱ء تک اس کی اشاعت چھ ہزار تک پہنچی۔ اسی سال منصبِ رسالت نمبر بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا جس سے منکرین حدیث کے استدلال کا قلعہ برباد ہو گیا تو ترجمان کی اشاعت یک دم چھ ہزار سے نو ہزار ہو گئی۔ اس ایک یکدم اضافے کے علاوہ ہمیشہ بتدریج ہی اضافہ ہوتا رہا ہے۔

ترجمان القرآن ایک رسالہ ہی نہیں دعوت، مشن اور پیغام بھی ہے۔ اس کی فائل میں عہدِ حاضر کے مفکرِ اسلام سیّد مودودی کے خیالات و افکار کا ریکارڈ ہی نہیں، تحریکِ اسلامی کی بھی پوری تاریخ موجود ہے۔ سیّد مودودی صاحب نے ایک ننھا سا بیج ڈالا، جب اس کے پودے نے ذرا سا سر نکالا تو لوگ پکار اُٹھے کہ یہ اسلام کا پیغام ہے۔ جب پودا بڑا ہوا، زمین میں قدم جما لیے اور اس کی جڑیں پھیلنے لگیں تو

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۴۰

اس کے برگ و بار کو جماعت اسلامی کا نام ملا۔ اب یہ ایک تناور درخت ہے جس کی جڑیں بہت دُور دُور تک پہنچی ہوئی ہیں اور جو بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر چکا ہے اور جس پر اسلامی انقلاب کا پھل لگنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ایسا ہوا تو صدیوں سے غربت و مادیت کی ماری دنیا کو فردوسِ اسلام کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے گا۔ بنی نوع انسان کے ایک ایک فرد کو دنیاوی فراوانی و فرحت اور روحانی فوز و فلاح نصیب ہو گی۔ اس وقت مستقبل کا مورخ ہمیں یاد دلائے گا کہ:

مولانا مودودی نے جو ننھا سا بیج بویا تھا وہ ترجمان القرآن تھا۔

ترجمان القرآن تو ایک جوئے رواں ہے جس میں سے بے شمار ندیاں نکل کر ذہنوں کو اسلامی افکار سے سیراب کرتی اور سیرت و کردار کے معطر گُل کھلاتی ہیں۔ ترجمان القرآن کے پیغام کو لے کر آگے پہنچانے والے کچھ رسائل و جرائد ایسے ہیں جو اسی راہ میں ختم ہو گئے۔ ان میں سہ روزہ مسلمان اور کوثر، روزنامہ تسنیم اور قاصد، ہفت روزہ جہانِ نو اور ماہنامہ مشیر ہیں اور جو اب بھی اس مشن کو پھیلانے میں مصروف ہیں ان میں ماہنامہ چراغِ راہ، سیارہ، اسوہ، فاران اور منزل ہیں، ہفت روزہ ایشیا اور آئین ہیں۔ بھارت میں ماہنامہ زندگی اور تجلی، پندرہ روزہ الحسنات اور سہ روزہ دعوت اسی دعوت کو پھیلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بیسیوں ایسے اخبارات و رسائل ہیں جو اپنے اپنے حالات اور استطاعت، خیالات اور فکر کے مطابق دس سے پچاس فی صدی تک انہی خیالات کو پھیلا رہے ہیں جو ترجمان القرآن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ۳۲ء کی ترجمان کی فائل برِ صغیر پاک و ہند کی موجودہ صحافت پر نظر ڈالتی ہے تو زیرِ لب علامہ اقبال کا یہ شعر گنگناتی محسوس ہوتی ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

یہ تحریکِ اسلامی کے ارتقا کی داستان ہے

۳۲ء میں ترجمان شروع ہوا تو آغاز میں سید صاحب نے وہ مضامین سپردِ قلم کیے جو پہلی

دفعہ ۵۵ء میں جاکر اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے مسئلہ تقدیر کی وضاحت پر ایک رسالہ مسئلہ جبر و قدر قلمبند کیا۔ پھر وہ اسلامی مضامین لکھے جو تفہیمات کے نام سے مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئے۔ اب یہ نہایت عالمانہ مضامین قریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پہ محیط ہیں اور تفہیمات کے ۳ حصص ہیں۔ اسی زمانے میں حقوق الزوجین نامی کتاب لکھی۔ جماعت اسلامی کے متاثرین اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادی پر عام طور پر یہ کتاب اور "پردہ" جہیز میں دیتے ہیں۔

پردہ تو سیّد صاحب کی دوسری شاہکار کتاب ہے جو مغرب زدہ لوگوں کو اسلام کے معاشرتی اصولوں کی عظمت و حکمت کا قائل کر دیتی ہے۔ ہفت روزہ آئین کے مدیر مظفر بیگ صاحب کی طرح جماعت اسلامی میں بیسیوں لوگ ایسے ہیں جو اسی کتاب کو پڑھ کر کھنچے ہوئے اس پیغام کی طرف چلے آئے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ "الحجاب" عرب ممالک میں بہت مقبول ہوا ہے۔ لبنان وغیرہ مسلم ممالک میں اس کتاب نے بحث کے دروازے کھول دیئے۔ کچھ لوگ اس کتاب کے دلائل سے جھوم اُٹھے، پردہ اور مودودی صاحب کے قائل ہو گئے۔ اور کچھ مغرب زدہ لوگ اسی وجہ سے مولانا مودودی کو رجعت پسند کی گالیاں دینے لگے۔

پھر سید مودودی نے "اسلام اور ضبط ولادت" لکھی جس میں حامیان ضبط ولادت کے دلائل کو ایک ایک کر کے رد کیا ہے۔ تحریک ضبط ولادت کی تاریخ، نتائج اور ردِ عمل بتلا کر اسلام کی رو سے اس تحریک کو غلط ثابت کیا ہے۔ اس کتاب میں تازہ ترین اضافہ وہ مقالہ ہے جو سیّد صاحب نے خاندانی منصوبہ بندی کے محکمہ کی تحریک پر سپرد قلم کیا تھا۔ پاکستان میں یہ محکمہ غیر ملکی امداد کی پشت پناہی سے چل رہا ہے۔ اواخر ۶۶ء میں محکمہ خاندانی منصوبہ بندی نے لاہور میں ایک بڑے سیمینار کا اہتمام کیا اور منصوبہ بندی کے موافقین و مخالفین کو مقالے پڑھنے کی دعوت دی اور کہا کہ اپنے مقالے محکمے کو سیمینار سے پہلے بھجوا دیئے جائیں۔ سیّد صاحب کو بھی دعوت دی۔ انہوں نے اپنا مقالہ تیار کر کے بھجوا دیا۔ اب محکمے والے مخمصے میں پڑ گئے کہ اتنے مدلل، محکم اور پُر زور مقالے کے بعد تو منصوبہ بندی کا محکمہ ہی لوگوں

کی نظر میں مُخلِّ نظر ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو سیمینار کو ملتوی کیا، پھر پروگرام بالکل ہی ختم کر دیا۔ جماعت اسلامی والے بڑے تیز ہیں۔ انہوں نے اس پمفلٹ کو پچاس ہزار کی تعداد میں شائع کر کے پھیلایا اور پورے پاکستان میں ۷۶ء میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف تحریک چلائی۔ آخر حکومت پاکستان نے اس پمفلٹ کو خلافِ قانون قرار دیدیا۔ چنانچہ جذبۂ تجسس کی بناء پر جن لوگوں نے نہیں پڑھا تھا وہ بھی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھ رہے تھے۔

ماہنامہ ترجمان القرآن میں دو موضوع پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک تو تفہیم القرآن ہے جسے سیّد مودودی ۴۲ء سے لکھ رہے ہیں ہر ماہ اس تفسیر کا تھوڑا بہت حصّہ شائع ہوتا ہے اور دوسرا موضوع رسائل ومسائل ہے اس عنوان کے تحت آخری صفحات میں ان خاص خاص خطوط کے جوابات دیتے ہیں جو اسلام یا نظامِ اسلام یا تحریکِ اسلامی سے متعلق ہوں اور مستقل اہمیت کے حامل ہوں قریباً ڈیڑھ دو ہزار صفحات پہ مشتمل ان خطوط اور جوابات کو "رسائل ومسائل" نام کی کتاب کے چار حصص میں شائع کیا گیا ہے۔

خدا نے سیّد مودودی کو سائلین کو جس شگفتہ انداز میں جواب دینے کا ملکہ عطا کیا ہے وہ بس انہی کا حصّہ ہے۔ یہ چاروں مجموعے اس کا مظہر ہیں۔ جو آدمی سیّد صاحب کی کتابوں میں سے سب سے ہلکی پھلکی کتابیں پڑھنا چاہے اور صرف مسرتِ مطالعہ کے لیے پڑھنا چاہے وہ رسائل ومسائل کو پڑھ لے جن میں علمی وادبی اور تفسیری وفقہی مسائل بھی ہیں، ٹیڑھے سیدھے اعتراضات، پُرلطف چوٹیں اور مختصر سبک دلچسپ جوابات بھی ہیں۔

ترجمان القرآن کے ۳۳ء سے ۴۱ء تک کے آٹھ سال کے مضامین ومقالات کے بارے میں سیّد صاحب نے لکھا ہے کہ یہ پہلا مرحلہ تنقید اور تبلیغ وتلقین کا تھا ——

"اس وقت ہمارے سامنے اوّلین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر وفہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنایا جائے ...... کیونکہ ایک قوم کے اصل رہنما اس کے اہلِ دماغ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ زندگی میں جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں۔ عوام ان کے پیچھے اسی راستے پر ہو لیتے ہیں..... پھر اصلاح کے معاملے میں بھی ہم نے اخلاقی وعملی اصلاح پر فکری وذہنی اصلاح کو مقدم رکھا کیونکہ خیال ہی اخلاق وکردار کی جڑ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں

کوئی عملی تغیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نظریات نہ بدلیں اس کے سوچنے کا انداز نہ بدلے اور اس کی اقدار نہ بدل جائیں لے۔"

سوچنے کا انداز بدلنے کے لیے سیّد صاحب نے ترجمان القرآن میں ان دنوں معرکے کے مضامین لکھے جو اب "تنقیحات" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں "تنقیحات" بلاشبہ مولانا کا تیسرا شاہکار ہے جسے ہر تعلیم یافتہ مسلم نوجوان کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اسے پڑھنے کے بعد جدید تعلیم سے پیدا ہونے والے اسلام کے بارے میں اکثر شکوک و شبہات نہ صرف زائل ہو جاتے ہیں بلکہ اسلام پر یقین مستحکم ہو جاتا ہے "تنقیحات" مسلم نوجوان کی آنکھ کے لیے خاکِ مدینہ و نجف کا ایسا سرمہ مہیا کرتی ہے کہ پھر اسے جلوۂ دانشِ فرنگ خیرہ نہیں کر سکتا اس کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ایک نئے عزم اور ولولے سے سرشار کرتی ہے، علم و عمل پہ اُبھارتی ہے، عالمِ پیر سے بیزار کر کے جہانِ نو پیدا کرنے کی لگن اور تڑپ دیتی ہے۔ مثلاً ایک مضمون کے درج ذیل دو اقتباسات سے تنقیحات کے دو مضامین کی اُٹھان، ترنگ اور جوش کا اندازہ کریں جس کا عنوان ہے:

'کیشِ مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں'

"یہ شریعت بزدلوں کے لیے نہیں اُتری ہے نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ ہوا کے رُخ پر اُڑنے والے خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگے جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ یہ ان بہادروں اور شیروں کے لیے اُتری ہے جو ہوا کا رُخ بدلنے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمّت رکھتے ہیں، جو صبغۃ اللہ کو ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ تو دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد یہی ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔"

لے جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل: ص ۱۷

انقلاب یا ارتقا ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں ڈھال دینے کا نام ہے۔ مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے موڑ دینے کو کہتے ہیں دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ اپنا کوئی اصول کوئی مقصد حیات کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جو کسی بلند مقصد کے لیے کوئی قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جو خطرات اور مشکلات کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو، جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں، ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے۔ انہی نے اپنے جہاد اور قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رُخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں، منہاجِ عمل میں انقلاب برپا کیا ہے اور زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے[۱]۔"

پروفیسر خورشید احمد صاحب ترجمان القرآن کی ابتدائی تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں ——— "ان تحریروں کا ایک پہلو اور بھی ہے مولانا مودودی صاحب کی تحریر بالعموم منطقی اور غیر جذباتی ہوتی ہے لیکن ان تحریروں میں ہمیں دھڑکتا ہوا دل اور اشکبار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ یہاں داعی کی زبان اور دعوت کی پکار ہے اور یہ زبان، یہ پکار بڑی ایمان افروز اور حوصلہ پرور ہے اس کے مطالعہ سے تحریک اسلامی ہی نہیں بلکہ خود داعی کی شخصیت کے چھپے ہوئے گوشے بھی سامنے آتے ہیں[۲]۔"

اسی مذکورہ بالا مضمون میں انہوں نے ایک مغربی مبصر کا قول نقل کیا ہے جس میں اس نے ماہنامہ ترجمان القرآن کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے ——— "آئندہ کا مؤرخ اس پرچہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس پرچے کے صفحات پر تحریکِ اسلامی

---

[۱] تنقیحات ص ۱۷۵

[۲] ماہنامہ چراغ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ص ۹۰

کے آغاز و ارتقا کی پوری داستان ثبت ہے۔ اس کے اوراق پر وہ تمام مراحل نقش ہیں جن سے دعوتِ اسلامی کو گزرنا پڑا ہے[1]۔"

---

[1] ماہنامہ چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ص ۹۸

باب ۶

کانگرس اور مسئلہ قومیت

سلسلہ "سیاسی کشمکش" کا پس منظر

۳۵ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو ایک دستور دیا جو گویا ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دینے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس دستور کی رُو سے ۳۷ء میں ملک گیر انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں سات صوبوں میں انڈین نیشنل کانگرس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ہزاروں سالوں بعد ہندوؤں کو حکومت کرنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے کچھ اختیارات ملتے ہی مسلمانوں کی دلآزاری کے قوانین بنانے شروع کیے۔ بندے ماترم، پرنام، اگئو ماتا، جے ہند، بھارت ماتا اور ہندی نے قدم رنجہ ہونا شروع کر دیا جن سے یہ بات کھُل کر سامنے آگئی کہ کانگرس کے سامنے متحدہ ہندوستانی قومیت کی بجائے شدھی (مسلمانوں کو ہندو بنانے کی) تحریک ہے اور اب ہندو اکثریت قانون کے زور سے مسلمان اقلیت کا ہندوستان میں جینا دوبھر کر دے گی۔ اس وقت مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ہمیں آزادی کی جدوجہد تو کرنی چاہیئے لیکن ایسا نہ ہو کہ اس آزادی میں ہندوستانی

مسلم کی موت ہو۔ لیکن ہر آدمی تو اتنا باشعور نہیں ہو سکتا کہ اس حد تک اپنے نفع و نقصان کو پہچانے۔ اس لیے عوام کالانعام کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ہندوؤں کے اقتدار کا سورج طلوع ہوتے دیکھا تو وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی ذہنی غلامی کے حلقے میں آنے لگے۔

سیّد مودودی صاحب نے اپنا اس زمانے کا واقعہ بیان فرمایا ہے جس نے ان کے انداز فکر پہ گہرا اثر کیا اور انہوں نے قوم کو جھنجوڑنے کے لیے اثر آفریں مضامین لکھے۔ ایک دفعہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی زندگی میں کوئی خاص ایسا واقعہ گزرا ہے جس نے آپ کو اسلام کو ایک تحریک کی صورت میں پیش کرنے کا خیال دیا تو سیّد صاحب نے یہ جواب دیا:

"میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں کہ کوئی خاص واقعہ مجھے کسی طرف موڑ دے۔ میں سوچ سوچ کر، غور و فکر کر کے کسی چیز کی طرف بتدریج جاتا ہوں۔ صرف ایک خاص واقعہ تھا جس نے مجھے بہت زیادہ چونکایا۔ ۱۹۲۷ء میں حیدر آباد سے نو سال کے قیام کے بعد جب میں دہلی پہنچا تو محسوس کیا کہ اتنے عرصہ میں مسلمانوں کی اِسلام سے دُوری کی بڑی تیز رفتار رہی ہے۔ حیدر آباد میں وہ صورتِ حال نہیں تھی جو دہلی میں آ کر محسوس ہوئی۔ مسلمان شرفاء کی ان خواتین کو کُھلم کُھلا بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھا جن کے متعلق میں یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس چیز نے مجھے چونکا دیا۔ دہلی کے حالات کی بنا پر راتوں مجھے نیند نہ آتی کہ یہ کیا ہو گیا اور نو سال کے اندر اتنا بڑا تغیر؟ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ کانگرس کی وزارتیں تھیں اور ہر طرف ہندوؤں کا تسلّط نظر آتا تھا اور یہ چیز بڑی پریشان کُن تھی۔

جب میں ۱۹۳۷ء میں دہلی سے واپس حیدر آباد جا رہا تھا تو میرے ڈبّے میں ایک کانگرسی لیڈر بھی سفر کر رہے تھے ان سے کچھ مسلمان بات کرنے لگے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ جیسے اب کانگرسی لیڈر ہی اس مُلک کے حکمران ہیں اور مسلمان ان کی رعیت۔ گویا یہ مانگنے والے اور وہ دینے والے۔ ان لوگوں کی ساری گفتگو میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ میرے سامنے پورا نقشہ آ گیا کہ اب مُستقبل میں مسلمانوں کا کیا حشر

ہونے والا ہے۔ اسی واقعہ کے بعد میں نے 'سیاسی کشمکش' لکھی۔ حیدر آباد میں میں اخبارات کے ذریعے جن حالات کا ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ ان کو دیکھ کر اور چل پھر کر میں نے محسوس کیا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھے اجتماعی جدّوجہد کی تحریک کی ہے[1]"

سیّد صاحب کی یہ کتاب "سیاسی کشمکش" تین حصّوں میں شائع ہوئی۔ اب پہلے دو حصّوں اور مسئلہ قومیت کے مضامین کو پروفیسر خورشید احمد صاحب نے نئے سرے سے مدّون کیا ہے اور یہ کتاب "تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ان سیاسی مضامین نے جو اپنے ٹھوس اور محکم دلائل، راست فکر اور بے لوث جذبے سے لوگوں کے دِلوں میں گھر کر لیتے تھے، سینکڑوں اور ہزاروں پڑھے لکھے مسلمانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سیّد صاحب کے یہ مضامین ان کی علمی اور گہری بصیرت کا عظیم شاہکار ہیں جس کے ذریعے انہوں نے مجلسِ احرار، جمعیت العلمائے ہند، مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کے مقاصد، طریقِ کار اور قیادت کا تنقیدی جائزہ لیا اور ان سیاسی تحریکوں کے مقاصد کی خامی واضح کر کے بتلایا کہ اِسلام کا اصل نصب العین کیا ہے۔ ہمیں پہلے تو مسلمانانِ ہند کی حالت، ان کی کمزوریوں اور انحطاط کے اسباب کا کھوج لگانا چاہیئے، آنے والے انقلاب کا اندازہ کرنا چاہیئے، پھر اپنا سیاسی نصب العین متعین کر کے اپنی راہِ عمل کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ ان مضامین کی اُٹھان اور جذبے کا اندازہ مندرجہ ذیل ایک اقتباس سے کریں۔

"ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ مستقبل کا سوال ایک درشنی ہُنڈی کی طرح مسلمانوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کر دو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر مُنہ اُٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے اور جس کے ذہن میں جو بات آ رہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوہ کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سُنّت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور

---

[1] چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ص ۲۹۹

جواہر لعل کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی پرانی فہرست میں ایک نئے فرضِ جنگ آزادی کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے جا رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ اس لیے کہ منزلِ مقصود کوئی نہیں حرکت ہی فی نفسہٖ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلے میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے اور ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ ہے۔[1]"

کانگرس کی حقیقت

ان مضامین کے ذریعے کانگرس کو خاص طور پر ہدفِ تنقید بنایا جس نے نہ صرف سیدھے سادھے مسلمانوں کو آزادی کے نام پر اپنے ساتھ ملا لیا تھا بلکہ علماء کرام کی ایک تعداد بھی اپنے جلو میں لیے ہوتے تھی جو اس کے رام راج کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ سیّد صاحب کے ان مضامین نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور انہیں احساس دلایا کہ اگر آج انگریز ہندوستان کو آزاد کرتا ہے اور یہاں مغربی جمہوریت نافذ ہوتی ہے تو ہندوستان کی ہندو اکثریت دس کروڑ مسلمان اقلیت کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بُرا اور ظالمانہ سلوک کرے گی جو امریکی قوم اپنی جمہوریت میں سیاہ فام حبشیوں کے ساتھ کر رہی ہے یا جرمن نازی اپنی یہودی اقلیت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسی آزادی چاہیئے جو دس کروڑ مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ تنگ نظر، متعصب اور ظالم حکمرانوں کا غلام بنا کے نہ

---

[1] تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان، مسائل حاضرہ میں قرآن اور اسوۂ رسول کی رہنمائی۔

رکھ دے سید صاحب نے لکھا "ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگرس کا ہے یعنی ملک کی آزادی۔ لیکن سرِ دست ہم اس سے صرف اس لیے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے ہم کو جس اخلاقی قوّت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے سب سے پہلے ہم اپنی کمزوریوں کو دُور کرنا چاہتے ہیں[1]"۔

سیّد مودودی صاحب نے سوشلسٹ پنڈت نہرو کی مذہب دشمنی کا پردہ چاک کیا اور کانگرس کی "ماس کانٹیکٹ (رابطہ عوام)" تحریک کا تنقیدی تجزیہ کیا اور بڑے زوردار الفاظ میں کانگرس کا طلسم توڑ کے رکھ دیا اور لکھا "یہ دراصل شُدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں یہ مذہبی شُدھی نہیں سیاسی اور معاشی شُدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھُلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنہہ کو پہنچنے میں دِقّت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑپن سے کام لیا تھا انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آ جاؤ۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو اس پر بھڑک نہ اُٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو، تمھاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے، لہٰذا کسی چیز کے چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم کے فرد ہو۔ مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جُدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو اور اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصّہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ——— ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ مگر دیکھئے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں[2]"۔

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان : کانگرس اور مسلمان۔

[2] ایضاً : قوم پرستوں کے نظریات۔

سید صاحب نے اپنی تحریروں سے کانگریس، اس کے خفیہ عزائم اور اس کی پالیسیوں پر زبردست تنقید کی اور مسلمانوں اور علمائے کرام کو متنبہ کیا اور کانگریس کی ہمنوائی کرنے والے بڑے بڑے نامور مسلمانوں کو آنے والے خوفناک مستقبل کا حوالہ دے کر صحیح راہ پر چلنے کی اپیل کی۔ سید صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر نے تو کانگریس کو بے نقاب کر دیا جس میں انہوں نے ہندو مہاسبھا کے ساتھ اس کا موازنہ کیا ہے۔

"مہاسبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہو سکتا، نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے، نہ مسلمانوں میں جا کر ماس کانٹیکٹ (رابطۂ عوام) کر سکتی ہے، نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کر سکتی ہے، نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کر کے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ یہ "قومی وزارت" ہے، نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہد نامہ پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائے گا، نہ اس کو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہو سکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیریکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائیں اور اس کے آستانہ پر جھکا دیں، نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات میسر آسکتی ہیں کہ واردھا سکیم تیار کریں، نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۵ فیصدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فیڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت کا تابع بنا دیں جس کے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو، نہ وہ بہت سے علمائے کرام کی خدمات حاصل کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اس کے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتویٰ دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے، نہ اس کے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اس کے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں وہ "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں، نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کے ساتھ کرا سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے، نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اس کو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے

چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان سے پکڑ کر نکال دے ۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آسکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو سبھا نہیں انڈین نیشنل کانگریس ہے[۱]۔"

اور ان دو ٹوک الفاظ میں انہوں نے گویا کانگریس کے بارے میں اپنا فیصلہ سُنا دیا ۔

"نیشنلزم اور آزادئ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے ۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی ۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریقِ کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے بلکہ درحقیقت کُلی اختلاف ہے ۔ ایسا شدید اختلاف کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے ۔ ہمارا اور اس کا تباین اس نوعیت کا ہے جیسے مشرق اور مغرب کا تباین ہے کہ جو شخص مغرب کی طرف جانا چاہتا ہو اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے مُنہ موڑ لے[۲]۔"

آزادئ ہند اور مُسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا " اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادئ ہند کی تحریک کا رُخ حکومتِ کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمربستہ ہو جائیں جس کا انجام کامیابی ہو یا موت

ع یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید ۔

---

[۱] تحریک آزادئ ہند اور مسلمان، قوم پرستوں کے نظریات ۔

[۲] ایضاً ۔

ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ ہندوستانی کی نجات ہو اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ ہندوستانی کے ساتھ مسلم کی بھی نجات ہو۔[1]"

سیّد صاحب کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصّہ اسلام کا صحیح مفہوم نہ جاننے کی وجہ سے غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے انہیں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر مسلمان ہیں، کوئی کہتا ہے مسلمانوں کو دین اور دنیا میں امتیاز کرنا چاہیئے، کوئی تسخیرِ عناصر اور تمکّن فی الارض کو مقصد بنائے ہوئے ہے خواہ یہ مقصد ہٹلر کے اسوہ پر چل کر حاصل ہو۔ ایک بڑا گروہ مسلمانوں کے پرسنل لاء اور قومی حقوق کی حفاظت کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے متناسب نمائندگی اور مسلمانوں کی زبان اور رسم الخط کا تسلیم کر لیا جانا ان کی منزل ہے۔[2] سیّد مودودی صاحب نے کہا کہ مذہب کے بارے میں اسلام کا تصوّر یہ نہیں ہے کہ اگر مُلّا کو مسجد سے کی اجازت ہو تو اسلام بھی آزاد ہے۔ اس کے برعکس:

"آپ[3] نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہو۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جُز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی رُوح اور اس کی قوّتِ محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو۔ صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے۔ راہِ کج سے بچائے راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان: ہمارا قومی نصب العین۔

[2] ایضاً: اسلام کی جامع تہذیب۔

کے ساتھ گزارد ے ـــــــــ اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے[1]۔"

سید صاحب نے ہندوستان کی مختلف تحریکوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ایک نیا اندازِ فکر بھی دیا۔ انہیں ان کا قومی تشخص یاد دلایا اور اسلامی نصب العین کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے لکھا "میرے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو اول بھی مسلمان ہیں اور آخر بھی مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ہندوستانی ہیں یا پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں اور مَیں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزلِ مقصود دوسری ہے اور میری منزلِ مقصود دوسری۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعے سے مَیں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں۔ اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حاصل کروں اور ہندوستان میں مسلم قوم کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کے لیے ہندوستان کا سیاسی و معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے اور میرے لیے وہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے جو اگر حصولِ مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے نزدیک مقصدی اختلاف ہے[2]۔"

اس وقت ملک میں ہر طرف کانگریس کا طوطی بول رہا تھا اور آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ انگریز دشمنی کو جزوِ ایمان سمجھا جا رہا تھا۔ اس لیے علمائے کرام کا ایک معتد بہ حصّہ کانگریس کا ہمنوا تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر

---

[1] تحریک آزادئ ہند اور مسلمان

[2] ایضاً

پہلے انگریز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے۔ جب آزادی جیسی عظیم نعمت حاصل ہو جائے پھر ہندو مسلمانوں کے اختلافات تو گھر کا معاملہ ہے۔ انہیں مِل بیٹھ کر باہمی فیصلے سے طے کر لیا جائے گا۔ ان بزرگانِ دین میں مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، سید سلیمان ندویؒ، اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے قابلِ صد تکریم بزرگان تھے۔ مجلسِ احرار اور خصوصاً جمعیت العلمائے ہند تھی۔ یہ بزرگ اور یہ تنظیمیں ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے آزادی کی خاطر "ہندی قومیت" کے لیے قرآن و حدیث سے دلائل فراہم کیے، کانگرس کا ساتھ دینے کے لیے ترغیب دی، سندھی صاحب نے نیشنلزم (قومیت) کی تعلیم دی تو سید مودودی صاحب نے ان سب کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی عظمت اور خدمتِ دین کا اعتراف کرتے ہوئے اس مسئلے پر ان سے اختلاف کیا اور محکم دلائل سے اس خیال کو غلط ثابت کیا کہ ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ صاحب صدر دارالعلوم دیوبند نے "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس میں قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے" اس پر علامہ اقبالؒ نے یہ اشعار لکھے جن میں حیرت کا اظہار کیا کہ ایسے بزرگ سے ہم یہ کیا بات سُن رہے ہیں۔

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اور سید مودودی صاحب نے بھی اسی عنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" کے نام سے اس رسالے کی تردید میں ایک زوردار بسیط مقالہ لکھا۔

"پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کوئی قوم محض وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک قوم ہیں؟ کیا پولینڈ، روس، ترکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، لتھوانیا، فن لینڈ کسی جگہ بھی خاکِ وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو رُوئے زمین کے اطراف و اکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، مگیار، سلافی، مورادین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتہ اشتراک میں گم ہوئیں ہے[1]؟"

ایک دوسرے مضمون میں سید صاحب نے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا اور لکھا "اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف۔ بلکہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا معاون بن گیا ہے۔ باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوتے ہے اور گھر کا ساتھی اپنی رسیاں کھول کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اُٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے۔ مگر مولانا ان کو الٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دُور کیوں بھاگے جا رہے ہو، ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اس کے پھندوں میں دے کیوں نہیں دیتے[2]۔"

---

[1] مسئلہ قومیت: ص ۸۵

[2] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان

مسئلہ قومیت

سید صاحب کے یہ خیالات مدلل ہونے اور خلوص پر مبنی ہونے کی وجہ سے تیزی سے پھیلتے چلے گئے۔ اخبارات و رسائل نے ان مضامین کو بار بار اپنے ہاں نقل کیا اور شائع کیا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اوّل اور دوم اور مسئلہ قومیت یہ تینوں کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ بکیں خصوصاً آخری کتاب مسئلہ قومیت نے تہلکہ مچادیا۔ مسلم لیگ نے اس ہتھیار سے کانگرس کے ایک بہت بڑے قلعے یعنی ابوالکلام آزاد کے دلائل کو فتح کر لیا۔ پروفیسر سرور صاحب نے لکھا ہے :

"کانگرس کے معاملے میں بعینہ یہی حال مسٹر جناح اور مودودی صاحب کا ہے۔ مسلمانوں کا ان دنوں کانگرس سے بیزار ہونا یقینی تھا اور اس کے اپنے وجوہ تھے۔ مسٹر جناح سیاسی دلائل کے ذریعے مسلمانوں کو کانگرس سے بیزار کرتے تھے لیکن یہ دلائل عام مسلمانوں کو اپیل نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا مودودی نے اسلام کے نام اور قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کانگرس کی مخالفت کی اور چونکہ مذہب کی اپیل عام ہوتی ہے اسلیے مسلمان عوام پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا ——— واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے کانگرس کی معیت میں جمعیت العلمائے ہند اور مولانا آزاد کے بنائے ہوئے متحدہ قومیت کے قلعہ کو مسمار کرنے میں بڑا کام کیا ہے[1]"

سید صاحب نے مسئلہ قومیت پر قلم اٹھایا اور اپنے مؤثر و دلنشیں اندازِ بیاں میں بتلایا کہ مسلمان اس مفہوم میں قوم ہے ہی نہیں جس مفہوم میں آج کل قوم کا لفظ اور سیاسی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ یہ کسی ملک، خطے اور جغرافی حصے سے نہیں بلکہ ایک آئیڈیالوجی اور نظریۂ حیات سے قوم بنتی ہے۔ وہ کوئی زبان بولتے ہوں، کوئی سا رنگ رکھتے ہوں، کسی علاقے میں رہتے ہوں۔ اگر اسلامی نظریۂ حیات پہ ایمان رکھتے ہوں تو وہ سب ایک

---

[1] محمد سرور: مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی ص ۱۱۰

قوم ہیں ورنہ نہیں۔ اور ہندوستان میں ایک قومی، جمہوری، لادینی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم بننا قطعی غلط اور خلافِ اسلام ہے۔

مسئلۂ قومیت میں سید صاحب نے نسل، وطن، زبان، رنگ، معاشی اغراض اور نظامِ حکومت کے اشتراک پر بننے والی قومیتوں کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ ان کی بنیاد پائیدار نہیں ہے۔ اسلام نے جاہلیت کی ان تمام بنیادوں کو ڈھا کر خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی ہے۔ جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوعِ بشری کو دعوت دی۔ پھر کہا جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کرے وہ دوسری قوم سے ہے[1]۔"

"غور کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کو ایک بنیان مرصوص بناتی ہے۔ آپ میں سے ہر شخص اپنا الگ ایک وجود رکھتا ہے، ہر شخص کا جسم الگ ہے، جان الگ ہے، طبیعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، مزاج مختلف ہیں، خیالات مختلف ہیں۔ مگر اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو آپ کے درمیان مشترک ہے اور وہی ایک ایسا رشتہ بن گئی ہے جس نے مختلف دانوں کو جوڑ کر ایک تسبیح بنا دیا ہے۔ وہی ایک چیز کبھی آپ کو مسجد میں کھینچ لاتی ہے اور محمود و ایاز سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ وہی چیز کبھی آپ کو میدانِ جنگ میں کھینچ لے جاتی ہے اور ایک مشترک مقصد کے لیے آپ سے سرفروشی کراتی ہے۔ وہی چیز آپ کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم کراتی ہے۔ وہی آپ کو ایک دوسرے کا ہمدرد، رفیق اور غم گسار بنا دیتی ہے اور وہی آپ میں اور دوسری قوموں میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ مگر وہ کوئی رسی نہیں ہے جو لکڑیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر جکڑ دیتی ہو۔ وہ کوئی چونا نہیں جو اینٹوں کو جوڑ کر پیوستہ کر دیتا ہو۔ وہ

---

[1] مسئلۂ قومیت ص ۳۳

محض ایک کلمہ ہے جس کو میں کلمۂ جامعہ کے لفظ سے اس لیے تعبیر کرتا ہوں کہ اس میں انسانوں کو جمع کرنے کی خاصیت ہے[1]"

"کلمۂ جامعہ کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام مادّی اور حسّی اختلافات کے درمیان ایک عقلی، اخلاقی اور تہذیبی رابطہ پیدا کیا جائے جس کو نوعِ انسانی کے تمام افراد قبول کر سکتے ہوں اور جس کو قبول کر کے وہ سب اپنے جغرافی، نسلی، معاشی، لونی اور لسانی اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہوں۔ اسی مقصد کے لیے ایک جامع کلمے کیساتھ نماز میں جماعت کی تاکید کی گئی، تمام دنیا کے لیے ایک قبلہ مقرر کیا گیا، روزے اور حج کو اجتماعی صورت دی گئی، معاشرتی اور سماجی امتیازات کو مٹایا گیا، تمام مسلمانوں کو مساوی قانونی مرتبہ دیا گیا اور سب کو ایک عالمگیر تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ دین کا اتحاد تمام چھوٹے اختلافات پر غالب ہو جائے اور دنیا میں ایک ایسی قومیت بن جاتے جو تمام نوعِ انسانی کو اپنے دائرے میں لے سکتی ہو[2]"

فتنۂ قومیت

"مسلمانوں میں ہندیت، ترکیت، افغانیت، عربیت اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت کا احساس مٹنے اور اسلامی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کا مستلزم ہے اور یہ نتیجہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی وطنی یا نسلی تعصّبات پیدا ہوئے تو مسلمان نے مسلمان کا گلا فرو کاٹا اور

—— لاترجعون بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض ——

کے اندیشۂ نبوی کی تصدیق کر کے ہی چھوڑی۔ لہٰذا وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام

---

[1] مسئلۂ قومیت: ص ۶۱

[2] ایضاً، ص ۷۳

کرنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی عین ضد ہے[۱]۔"

"یہ فتنہ (قومیت) جس کے ظاہر ہونے کا سیّد الکونینؐ کو اندیشہ تھا حقیقت میں ویسا ہی مہلک ثابت ہوا جیسا آپؐ نے فرمایا تھا۔ قرنِ اوّل سے آج تک اِسلام اور مسلمانوں پر جو تباہی بھی نازل ہوئی ہے اسی کی بدولت ہوئی۔ وصالِ نبوی کے چند ہی برس بعد ہاشمی اقتدار کے خلاف اموی عصبیت کا فتنہ اُٹھا اور اس نے اِسلام کے اصلی نظامِ سیاست کو ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دیا۔ پھر اس نے عربی عجمی اور ترکی عصبیت کی شکل میں ظہور کیا اور اِسلام کی سیاسی وحدت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر مختلف ممالک میں جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں ان سب کی تباہی میں سب سے زیادہ اسی فتنے کا ہاتھ تھا۔ قریب ترین زمانے میں دو سب سے بڑی مسلمان سلطنتیں ہندوستان اور ٹرکی کی تھیں۔ ان دونوں کو اسی فتنے نے تباہ کیا۔ ہندوستان میں مغل اور ہندوستانی نے سلطنتِ مغلیہ کو ختم کیا اور ٹرکی میں ترک عرب اور کرد کی تفریق کا موجب ہوئی[۲]۔"

"مَیں مسلمان صرف اس وقت تک ہوں جب تک مَیں زندگی کے ہر معاملے میں اِسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب مَیں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہو گی اگر مَیں یہ سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آتی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی بات ہے۔ مسلمان نیشنلسٹ اور مسلمان کمیونسٹ ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے کمیونسٹ فاشسٹ یا جینی قصائی یا اشتراکی مہاجن یا موحّد بُت پرست[۳]۔"

---

[۱] مسئلۂ قومیت: ص ۵۸

[۲] ایضاً: ص ۵۳

[۳] ایضاً: ص

"نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے اور انسانیتِ عامہ کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت خود غرضی کی ہے اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت قوم پرستی کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرتاً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابلِ قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو" ——— اور چونکہ ایسی قوم کو کوئی اخلاقی ہدایت ضابطے میں رکھنے والی نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنی بے انصافیوں کی تلافی کرتے کرتے "اپنی حد سے گزر کر قیصریت، معاشی قوم پرستی، نسلی منافرت، جنگ اور بین الاقوامی بدامنی میں تبدیل ہو جاتی ہے[1]"۔

اور ایک آخری اقتباس "جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں آپ ان کو اسلامی حکومتیں کہتے ہیں محض اس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدّن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا آپ اسے اسلامی تمدّن کہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ ایک میت کو سپردِ خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تیار کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصّہ آبِ زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں

---

[1] مسئلۂ قومیت: ص ۱۳۳

لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام اسلامی تاریخ رکھ چھوڑا ہے بلکہ آپ اسے تاریخِ اسلام بھی کہ دیتے ہیں گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے[1]۔"

ردِّ عمل

آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری اور قائداعظم و لیاقت علی خاں کے دستِ راست مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے لکھا ہے "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے مسئلۂ قومیت کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جو اپنے دلائل کی محکمی، ندرتِ استدلال اور زورِ بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا اور جس کا چرچا بہت تھوڑے عرصے میں اور بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں ہو گیا۔ اس اہم بحث کی ضرب متحدہ قومیت کے نظریہ پر پڑی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کیساتھ پھیلنے لگا۔ قومیت کے مسئلہ پر یہ بحث محض ایک نظری بحث نہ تھی بلکہ اس کی ضرب کانگرس اور جمعیت العلمائے ہند کے پورے مؤقف پر پڑتی تھی۔ ہندوؤں کی سب سے خطرناک چال یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ان کی جداگانہ قومیت کا احساس کسی طرح ختم کر کے ان کے ملّی وجود کی جڑیں کھوکھلی کر دی جائیں۔ خود مسلم لیگ نے اس بات کی کوشش کی کہ اس بحث کا مذہبی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے تاکہ عوام کانگرس کے کھیل کو سمجھ سکیں اور اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں[2]۔"

چوہدری غلام محمد صاحب مرحوم نے بتلایا ہے کہ ان مضامین کا کیا ردِّ عمل ہوا اور ان کی وجہ سے سیّد مودودی صاحب کو آج تک کس طرح مولویوں کا ہدفِ تنقید بننا

---

[1] مسئلہ قومیت

[2] ظفر احمد انصاری: تحریکِ پاکستان اور علماء

پڑا ہے۔" ان مضامین کی اشاعت نے ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے سوچنے کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ یہ مضامین کتابی شکل میں لاکھوں افراد تک پہنچے۔ اس زمانہ میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کا آغاز ہو رہا تھا اور علمی میدان میں اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار کانگرسی علماء کو شکست دینے کے لیے مسلم لیگ کے پاس نہ تھا۔ انہوں نے اس کی خوب اشاعت کی۔ عام مسلمانوں میں کانگرسی نظریہ کا زوال اور جداگانہ قومیت کا احساس شدت کے ساتھ اُبھر آیا۔ بلاشبہ اللہ کے دوسرے بندوں نے بھی اس میدان میں کام کیا لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا مودودی کی ان کوششوں نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا احساس پیدا کر دیا[1]"

دوسری طرف "مولانا مودودی کو کانگرسی علماء کی اس روش پر تنقید کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اب تک ان کو معاف نہیں کیا گیا۔ مولانا مودودی کے خلاف جو فتوے اب تک شائع ہوتے ہیں اور جتنے بہتان لگائے گئے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر حصّہ انہی علماء کے متوسلین اور شاگردوں کا ہے اور یہ لوگ آج تک اپنے اکابر کی اس عظیم الشان غلطی کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس زمانہ میں ان لوگوں نے یہ بہتان لگایا کہ کانگرس کی مخالفت کے لیے انگریز نے مولانا مودودی کو پچاس ہزار روپیہ دیا ہے اور آج بھی پاکستان کے طول و عرض میں یہ گروہ سرگرمی کے ساتھ مولانا مودودی کی مخالفت کر رہا ہے اور طرح طرح کے بہتان لگا رہا ہے۔ جس صاحب نے یہ الزام لگایا تھا کہ جماعت اسلامی کو امریکہ سے مدد ملتی ہے وہ بھی اس گروہ کے ایک عالم تھے اور اب جو بزرگ یہ پروپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں کہ شاہ سعود نے ۳۲ لاکھ روپے دیئے ہیں وہ بھی اس گروہ سے متعلق ہیں[2]"۔

آخر میں پروفیسر سرور صاحب کی رائے اس لیے درج کی جاتی ہے کہ انہوں نے سیّد صاحب اور ان کی تحریک پر ایک مخالف کے نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے وہ ان مضامین کے بارے میں اعتراف کرتے ہیں:

---

[1] چراغِ راہ تحریک اسلامی نمبر ص ۱۳۳

[2] ایضاً ص ۱۳۲ فٹ نوٹ

"مودودی صاحب کا اسلامی قومیت کا یہ نکر باقی ہندوستان کے مسلمانوں میں کافی مقبول ہوا اور وہ اس لیے کہ اس وقت مسلمان یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی قومیت در اصل ہندو قومیت بن گئی ہے اور ایسی قومیت میں اپنے مِلّی وجود کو مدغم کرنا انہیں کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔ اس طرح اسلامی قومیت کا تصور قدرتی طور پر ان کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ کانگرس کے مخالف وہ تمام مسلمان جو جمعیت العلمائے ہند سے وابستہ علماء کے مذہبی مرتبے سے مرعوب تھے اب ان کو موقع ملا کہ وہ کانگرس کے حامی علماء کے مقابلے میں مولانا مودودی کو پیش کریں جو عالم بھی تھے اور صاحبِ قلم بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نام سے اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے نہایت معقول دلائل کے زور پر مولانا مودودی نے اس دور میں ہندوستانی قومیت سے محفوظ رکھنے میں بڑا کام کیا اور اسلامی قومیت کو بحیثیت ایک سیاسی اصول کے مسلمانوں سے متعارف کروایا۔"[1]

---

[1] محمد سرور: مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی: ص ۱۰۸

باب ۷

دارالاسلام

رسالہ دینیات

ان دنوں رئیس احمد جعفری صاحب نے سید مودودی صاحب سے ملاقات کی اور اس کے تاثرات قلم بند کر کے ان کی پہلی قلمی تصویر کھینچی ہے وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۷ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس (حیدر آباد دکن) کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، حیدر آبادی وضع کی شیروانی، داڑھی ندارد، غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئیں، انگریزی تراش کے بال، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کچھ خاموش خاموش، کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا آپ کی تعریف؟ فرمایا:

"ابوالاعلیٰ مودودی"۔

اس نام کا مسمیٰ آنکھوں کے لیے نیا تھا لیکن کانوں کے لیے نیا نہ تھا۔ بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ کے افکارِ دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا

تھا۔ اب عرصہ سے جس کی ادارت میں حیدر آباد سے رسالہ ترجمان القرآن نکل رہا تھا۔ جس کے مقالات اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ نظر اور اہلِ علم کے لیے باعثِ فخر و رشک تھے۔ باتیں کیں تو معلوم ہوا خدا نے ذہانت کے ساتھ ساتھ حلم، گہرائی اور تفکر کی نعمت بھی عطا کی ہے۔ باتوں میں لب و لہجہ میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ بے موقع تبسّم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں، خلا ملا سے پرہیز، تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی اور خاموشی۔ بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں اور مولانا ان سے پوری طرح مسلح تھے ہے۔"

ان ایام میں سید مودودی نے اپنا چوتھا شاہکار قلم بند کیا اس چھوٹی سی کتاب کا نام "دینیات" ہے۔ سہل انداز میں اسلام کی تعلیمات کو پیش کرنے میں یہ کتاب اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کتاب میں اسلام اور کفر کی حقیقت، ایمان اور اطاعت، نبوّت، ایمانِ مفصل، عبادات اور دین و شریعت کو عام فہم انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ، انسانوں، مخلوقات اور اپنی ذات کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ ایک دفعہ سیّد صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کے لٹریچر میں سے کون سی تین کتابیں ایسی ہیں جنہیں آپ دعوتِ اسلامی کے نقطہ نظر سے اہم ترین سمجھتے ہیں تو آپ نے اسی کتاب دینیات کو ان تین میں بھی سرِ فہرست رکھا۔

سیّد صاحب نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے "یہ مختصر رسالہ خصوصیت کیساتھ ان نوجوانوں کے لیے لکھا گیا ہے جو ہائی سکول کی آخری جماعتوں یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں تعلیم پاتے ہوں۔ ان کے علاوہ عام ناظرین بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے پہلے ہی ایڈیشن کو جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہندوستان کے بہت سے مدرسوں نے اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے بھی بہت سے سکولوں نے اپنی

لے رئیس احمد جعفری: دید و شنید

اُونچی جماعتوں کے نصاب میں شامل کر لیا۔ بائیس سال میں یہ اب انیسویں بار شائع ہو رہا ہے اور دنیا کی پانچ بین الاقوامی زبانوں میں ایک لاکھ سے زائد چھپ چکا ہے۔"

لیونارڈ بائنڈر نے لکھا ہے کہ سیّد مودودی کی ——— "دینیات ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ یہ ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوئی اور پورے ہندوستان میں میٹرک کے مسلمان طلباء کے لیے دینیات کے نصاب کی مطلوبہ کتاب بن گئی۔ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اخوان المسلمون نے مولانا کی دوسری کتابوں کے ہمراہ مصر میں اس کتاب کو خوب پھیلایا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا مودودی ہندوستان کے چوٹی کے ماہرینِ دینیات میں شمار ہونے لگے۔"[1] ——— انگریزی میں نیا اور زیادہ شگفتہ ترجمہ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے کیا ہے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ——— "Towards Understanding Islam" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

انگریزی اور عربی کے علاوہ اس کتاب کا ترجمہ جرمنی، فارسی، انڈونیشی، جاپانی، سواحلی، ہندی، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، ملیالم، تامل اور بنگلہ میں بھی ہو چکا ہے۔

اس کتاب کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوالخیر مودودی صاحب نے فرمایا "اسلامی کتب کے مصنف مناظر احسن گیلانی حیدر آباد دکن کی مشہور شخصیت ہیں۔ وہ دارالترجمہ میں تھے۔ جب کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کو دین کی بنیادی تعلیمات کو آسان، عام فہم اور دلنشین انداز میں سکھانے کی ضرورت ہے تو گیلانی صاحب نے کہا کہ یہ کام ابوالاعلیٰ مودودی ہی کر سکتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ایسا قلم دیا ہے کہ وہ دین کی مشکل اور فلسفیانہ باتوں کو بھی آسان مثالوں، سہل طرزِ ادا اور دل میں اُتر جانے والے الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں اور صرف وہی جدید نسل کی تشفی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد دکن کی نظامتِ تعلیمات کے کہنے پر ابوالاعلیٰ نے اپنی مشہور کتاب دینیات لکھی اور جس بات کا لوگوں کو علم نہیں وہ یہ ہے کہ ابوالاعلیٰ نے اسے صرف پندرہ

---

[1] "Religion and Politics in Pakistan". p. 82

روز میں مکمل کر لیا۔"[1]

خانگی زندگی

۱۹۳۷ء میں سیّد مودودی صاحب نے شادی کی۔

گویا اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ ان کا سسرال ایک بخاری سیّد گھرانہ ہے جو شاہجہاں کے دور میں بخارا سے دہلی منتقل ہوا اور خسر سیّد نصیر الدین صاحب دہلی کی کچہری میں تھے جن کی اپنی اچھی خاصی جائداد تھی۔ ان کے بیٹے اور خاندان والے اب کراچی میں مقیم ہیں۔ سیّد مودودی صاحب کی بیگم کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کوئین میری گرلز ہائی سکول دہلی میں حاصل کی پھر اردو آنرز کیا۔ بعد ازاں منشی فاضل کی تیاری کر رہی تھیں کہ ۳۷ء میں شادی ہو گئی۔ محمودہ بیگم صاحبہ ناز و نعم اور آرام و آسائش میں پلی تھیں۔ اس کے برعکس سیّد مودودی کی زندگی مسلسل محنت، سادگی اور جفاکشی کی زندگی تھی۔ بیگم صاحبہ کو اس بات میں یقیناً دشواریاں محسوس ہوئی ہوں گی کہ وہ اپنے آپ کو اس نئی زندگی سے مانوس کریں۔ لیکن سیّد مودودی صاحب نے انہیں کسی وعظ اور دباؤ کے بجائے عملی نمونے، موانست اور تحمل سے اپنا ہم خیال بنا لیا حتیٰ کہ وہ جماعت کی رکن بن گئیں اور اب وہ جماعت کے حلقہ ہائے خواتین میں درسِ قرآن اور خطابات کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ راہِ حق کے مصائب جھیلنے میں بھی یہ سیّد صاحب کی رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ دارالاسلام میں اس خاتون نے سخت زندگی کا سامنا کیا۔ دہلی شہر کی جگمگاتی زندگی چھوڑ کر گویا بن باس دیکھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ۴۸ء میں جب سیّد صاحب پہلی دفعہ گرفتار ہوئے اور ستر کتابوں کے مصنف کے گھر میں کچھ پس انداز نہیں تھا اور اس کی خودداری نے اپنی بیگم کو روک دیا تھا کہ وہ رشتہ داروں سے مدد کی خواہاں ہوں، تو کسے معلوم ہے کہ بیگم مودودی اور ان کے بچوں کے ساتھ کیا بیتی؟

سیّد مودودی صاحب کے سب سے بڑے بیٹے کا نام عمر فاروق ہے۔ غالباً سیّد صاحب

---

[1] ہفت روزہ آئین: ۱۷ اکتوبر ۶۸ء

کے ذہن میں حضرت عمر بن الخطاب فاروق اعظم رض ایک ہیرو کا مقام رکھتے ہیں۔ اسی لیے سید صاحب کے سب سے بڑے بیٹے کا نام عمر فاروق ہے اور باقی تمام بیٹوں کے نام میں فاروق کا لفظ ضرور شامل ہے۔ عمر فاروق مودودی ۱۲ اپریل ۴۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دارالاسلام میں نقی علی صاحب اور یحییٰ صاحب اس چھوٹی سی بستی کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ عمر فاروق نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۶۰ء میں مسلم ماڈل سکول لاہور سے میٹرک کیا، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا پھر ۶۲ء میں ایم اے عربی کیا اس کے بعد ترجمان القرآن کے کام میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان سے ایک سال چھوٹے ڈاکٹر احمد فاروق ہیں جنہوں نے ڈو میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا۔ چار سال سے امریکہ کے ایک ہسپتال میں ملازمت کر رہے ہیں وہیں طب کے ایک شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کی۔ ان کے بعد ان کی دو بہنیں حمیراء اور اسماء ہوئیں۔ سید صاحب ان چاروں بچوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ پھر چار بیٹے محمد فاروق، حسین فاروق، حیدر فاروق اور خالد فاروق ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں بچے زیر تعلیم ہیں۔ سب سے آخر میں سید صاحب کی بچی عائشہ ہے۔

پانچ دریاؤں کی سرزمین نے پکارا

مارچ ۳۸ء میں علامہ اقبال مرحوم کے کہنے پر سید صاحب دارالاسلام آگئے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ ان دنوں علامہ اقبال مرحوم مولانا سے کافی متاثر تھے اور مرحوم کے ایک نیاز مند سے جو آخری زمانے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا لوگوں نے مولانا مودودی کے متعلق علامہ مرحوم کا یہ جملہ سنا ہے کہ یہ مولوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلم سے ان کے دین کو پیش کر رہا ہے۔ بہر حال یہ روایت خواہ کتنی ہی صحت طلب کیوں نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو پنجاب بلوانے میں علامہ اقبال کا بھی ہاتھ تھا[1]"

---

[1] مولانا مودودی کی تحریک اسلامی۔

شورش کاشمیری صاحب کے ایک خط کے جواب میں سید صاحب نے ۳۰ مارچ ۵۱ء کو لکھا "ڈاکٹر اقبال مرحوم سے میرے تعلقات کوئی بہت زیادہ وسیع تو نہ تھے البتہ قلبی حیثیت سے گہرے ضرور تھے۔ میں جب حیدر آباد سے رسالہ ترجمان القرآن نکالا کرتا تھا اس زمانے میں مجھے خبر تک نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے واقف ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ برابر اس رسالہ کو منگوا کر میرے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھوا کر سنتے رہتے تھے۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کی دلچسپی کا علم اس وقت ہوا جب ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوینِ جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔

اس کے بعد کچھ مراسلت شروع ہوئی اور ۳۷ء کے آخر میں لاہور آ کر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔ ان ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور ان کی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے دل سے بہت قریب ہیں۔ یہاں میرے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارات میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق دار الاسلام تجویز کیا تھا ایک ادارہ قائم کروں جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میرے وہاں منتقل ہو جانے کے بعد وہ بھی ہر سال چند مہینے وہاں آ کر قیام فرمایا کریں گے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق میں نے حیدر آباد جا کر ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں[1]"

سید صاحب کے پنجاب آنے کے پس منظر پر عابد نظامی لکھتے ہیں "انہی دنوں مولانا مودودی ترجمان القرآن کے ذریعے سیکولر جمہوری سٹیٹ اور متحدہ قومیت وغیرہ نظریات کے خلاف جہاد کر رہے تھے جس کو علامہ اقبال مرحوم بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔ علامہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے پنجاب

---

[1] ہفت روزہ چٹان ۲۰ اپریل ۵۱ء

کو مرکز بنانا زیادہ مفید ہے۔ چنانچہ قائداعظم کے نام ان کے خطوط پڑھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ قائداعظم پر زور دیتے تھے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز پنجاب کو بنائیں۔ غالبًا اسی خیال کے تحت علامّہ اقبال نے مولانا مودودی کو مشورہ دیا کہ جو دعوت آپ پیش کر رہے ہیں اس کا کسی ریاست سے اٹھنا سود مند نہیں ہے۔ انگریز کسی وقت بھی والیٔ ریاست کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا سکتا ہے۔ اس لیے آپ غلامی در غلامی کے ماحول سے نکل کر انگریزی علاقے میں آجائیں۔

علامہ مرحوم کی دعوت پر مولانا کا پنجاب میں تشریف لانا ایک امرِ واقعہ ہے ہر چند یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے ان کی عظمت میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہو۔ تاہم اس واقعہ کی ایک تاریخی حیثیت ضرور ہے۔ اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ مولانا مودودی اور علامّہ مرحوم کی تعلیمات میں غایت درجہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے روحانی اور سیاسی امراض کے علاج کے لیے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ ایک ہی تھا یعنی اسلام[1]"۔

نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبال کی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے چوہدری نیاز علی صاحب جاوید منزل میں آئے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کو بتلایا کہ انہوں نے جمال پور میں ایک وقف قائم کیا ہے۔ آپ مشورہ دیں کہ اس وقف سے کیا کام لینا چاہیئے۔ مرحوم نے مشورہ دیا کہ موجودہ زمانے میں سیاسی و اجتماعی مسائل نے ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے اس لیے ہم روز بروز اسلام سے ہٹ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل ہے۔ حکیم الامت کے اس وقیع مشورے پر اتفاق ہو گیا تو اب سوال تھا کہ اس کام کے لیے علماء کہاں

---

[1] ہفت روزہ ایشیا ۱۳ مئی ۶۳ء۔

سے آئیں ؛ نیازی صاحب کے الفاظ ہیں :

"حضرت علامہ نے فرمایا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جہاں تک لوگوں کو جمع کرنے کا تعلق ہے شاید میں کچھ نام تجویز کر سکوں۔ سرِ دست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ مَیں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائلِ حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔"[1]

چنانچہ نذیر نیازی صاحب نے اس پوری گفتگو کے حوالے سے علامہ مرحوم کی طرف سے سیّد مودودی کو حیدر آباد میں خط لکھا۔ اِدھر چوہدری نیاز علی صاحب نے سیّد مودودی صاحب کے لیے دارالاسلام میں آنے کے جملہ انتظامات کر دیئے۔

علامہ اقبالؒ اور سیّد مودودی

غلام حسین اظہر صاحب نے سیّد صاحب سے ایک مفصّل انٹرویو لیا تھا اور دریافت کیا تھا کہ وہ کن حالات کی بنا پر حیدر آباد دکن کو چھوڑ کر پانچ دریاؤں کی سر زمین میں مستقل آباد ہوتے تھے۔ اس انٹرویو میں سیّد صاحب نے بتلایا کہ پنجاب میں ایک صاحب "چوہدری نیاز علی صاحب نے دین کی خدمت کے پیشِ نظر ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے زمین وقف کی اور عمارات بنانی شروع کیں۔ لیکن ان کے سامنے یہ متعین نہیں تھا کہ ادارہ کس قسم کا ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ کس قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہیئے۔ مَیں نے ایک خاکہ لکھ کر بھیجا جو ان خطوط پر تھا جو بعد میں مَیں نے دارالاسلام کے بارے میں شائع کیا۔

---

[1] ہفت روزہ ایشیا ۲۵ اپریل ۶۹ء

اسی دَوران میں انہوں نے علامہ صاحب سے بھی رہنمائی کی غرض سے خط و کتابت کی۔ مجھے چوہدری نیاز علی صاحب سے معلوم ہوا کہ میری تجویز کردہ سکیم انہوں نے علامہ مرحوم کو دکھائی تھی اور انہوں نے اسے پسند کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس وقت کرنے کے یہی کام ہیں۔ اس سلسلہ کی ساری خط و کتابت چوہدری نیاز علی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

تقریباً ۱۹۳۶ء ہی کا زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ علامہ صاحب نے مجھے نذیر نیازی صاحب یا میاں محمد شفیع صاحب کے ہاتھ سے خط لکھوایا تھا کہ مَیں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب میں منتقل ہو جاؤں۔ مگر اس وقت میں نے اظہارِ معذرت کر دیا تھا کیونکہ اس وقت میں حیدر آباد ہی میں رہنے کا خیال رکھتا تھا اور وہاں مَیں نے زمین بھی اس غرض سے خرید لی تھی کہ اس طرح کا ایک ادارہ قائم کروں جس کی تجویز انہوں نے کی تھی۔

۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے خود یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ جنوبی ہند میں کام کرنے کے مواقع روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے مستقبل کا فیصلہ بڑی حد تک شمالی ہند میں ہو گا۔ اسی زمانہ میں چوہدری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ مَیں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ میں شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے مَیں نے اواخر اگست ۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہؤا پٹھان کوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چوہدری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے مَیں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں جس کا خاکہ مَیں نے چوہدری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔

اس وقت جو گفتگو ہوئی وہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے لیے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں

تھے اور کام کا وہی خاکہ اِن کے پیشِ نظر تھا جو مَیں نے پیش کیا تھا۔ اسی کو عملہ جامہ پہنانے کی تدابیر ہی ہم اس گفتگو میں سوچتے رہے۔ اس وقت دو چیزیں پیشِ نظر تھیں ایک یہ کہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پُر کیا جائے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظامِ زندگی موجودہ زمانے کے لوگوں کو ناکافی اور ناقابلِ عمل نظر آ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔ ایک خالص اور جامع اسلامی تحریک کا تخیّل اس وقت واضح طور پر سامنے نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پٹھان کوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم اس جگہ آکر بیٹھ جاؤ تو مَیں بھی سال میں چھ مہینے وہاں گزارا کروں گا۔ اس بات میں ایسی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے مَیں نے فوراً ہی اس تجویز کو قبول کر لیا اور حیدر آباد سے پٹھان کوٹ چلا آیا۔ مگر اس ساری داستان کا المیہ یہ ہے کہ مارچ میں مَیں پٹھان کوٹ منتقل ہوا اور اپریل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مجھ پر اس حادثہ کا شدید اثر تھا اسی احساس نے مجھے (ترجمان القرآن میں) یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کیا (کہ)؛

اقبال میرا روحانی سہارا تھا۔"[1]

ہفت روزہ چٹان نے ۵۷ء میں اقبال نمبر شائع کیا تو سیّد مودودی صاحب کو اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال مرحوم لاہور میں آپ کی تشریف آوری کا سبب تھے؟ سیّد صاحب کے جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ پنجاب سے کیوں بدگمان تھے اور پھر یہاں کیوں آئے۔ سیّد صاحب نے جواب میں لکھا ——— "جی ہاں۔ میں پنجاب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ یہاں کی صحافت اور سیاست اور مذہبی مناظرہ بازیوں کا رنگ دیکھ کر دور ہی سے اتنا بدگمان تھا کہ پنجاب آنا پسند بھی نہ کرتا تھا۔ مگر ۳۶ء کے اواخر میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے

---

[1] ماہنامہ سیارہ مئی ۶۳ء

مجھے توجہ دلائی کہ دکن کو چھوڑ کر پنجاب میں قیام کروں۔ پہلی نگاہ میں تو مجھے اس تجویز نے کچھ زیادہ متاثر نہ کیا۔ مگر جب ۳۷ء کے اواخر میں میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدر آباد سے نکلا تو مرحوم سے مشورہ کرنے کے لیے لاہور حاضر ہوا اور ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ آئندہ میرے لیے پنجاب ہی میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔"

دارالاسلام کا تخیّل

سید مودودی صاحب نے ایک عرصے سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ لوگوں کے اسلام سے دُور ہٹنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ان کے سامنے اسلام کا اجتماعی نظام اور اجتماعی زندگی نہیں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کو اسلامی نظام کی اجتماعی زندگی کا عملی نمونہ دکھایا جائے۔ ایک بستی بسائی جائے جس کے باشندوں کی پاکیزہ زندگی، باہمی اخوت و مساوات اور ایثار و قربانی کو دیکھ کر لوگ اسلام کے اجتماعی نظام کو قابلِ عمل اور قابلِ رشک جاننے لگیں۔ چوہدری نیاز علی صاحب کو یہی خاکہ تجویز کیا۔ اسی خاکے پر علامہ اقبال مرحوم سے سید صاحب کا اتفاق ہوا یہی خاکہ دارالاسلام کا دھندلا تصوّر یا ابتدائی تخیّل تھا جو بعد کے غور و فکر اور تجربات سے مزید واضح ہوتا چلا گیا۔ اسی تخیّل نے اجتماعی کوشش کی شکل اختیار کی تو ادارۂ دارالاسلام کی بنیاد رکھی گئی اور ادارۂ دارالاسلام گویا جماعتِ اسلامی کی شاہراہ تک پہنچانے والی پگڈنڈی تھی۔

سید مودودی صاحب نے دسمبر ۳۷ء میں "مرض اور اس کا علاج" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مضمون لکھا جو "تنقیحات" کے مجموعہ میں شامل ہے۔ اس میں لکھا کہ اسلام میں عقائد کی وہی اہمیت ہے جو جسم میں قلب کی ہے۔ نظریۂ حیات اور مقصدِ زندگی گویا دماغ ہے۔ عبادات مختلف اعضاء ہیں۔ اجتماعی زندگی کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصول اعضائے رئیسہ ہیں۔ یہ سب باہم دگر قوّت و زندگی دیتے ہیں اور ہمارے یہاں یہ حال ہے کہ قوانینِ اسلامی قریب قریب معطّل ہیں، اجتماعی زندگی کے اسلامی

اصول نہ ہونے کے برابر نافذ ہیں، ماحول اور تربیت اور تعلیم سبھی غیر اسلامی ہیں، اسی لیے یہ غیر مؤثر، بیمار اور اعضاء بریدہ اسلام ہے۔ یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا کی بجائے مسلمانوں میں بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے اور مسلمان تیزی سے کمیونزم کی طرف لپک رہے ہیں چنانچہ:

"محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے۔ سارے مسائل خود بخود حل نہیں ہو جائیں گے۔ اسلام میں بالقوہ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کشمکش اور جدّ و جہد کی دنیا ہے۔ اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اس کو بدلنے کے لیے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے" ——— سید صاحب نے لکھا کہ انقلاب انگیز جد و جہد جو ہم چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس انقلاب کو رسولِ کریمؐ پہلے ہی برپا کر چکے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا، اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ادارۃ الاسلام کا تخیل اسی اسوۂ پاک کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔"

سید صاحب نے اس مضمون میں بتایا کہ مدینۂ نبویؐ کی حیرت انگیز تنظیم چار بڑے شعبوں پر مشتمل تھی۔ کہ پہلا گروہ دین میں تفقہ حاصل کر کے لوگوں کو بہترین طریقے سے اسلامی احکامات کی تعلیم دے، اسلامی معاشرہ دوسرے گروہ کو فکرِ معاش سے آزاد کر دے تاکہ وہ ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے اسلام کے نظامِ عمل کو قائم کرنے اور پھیلانے میں مصروف ہو جائے، تیسرا گروہ یعنی پوری جماعت کاروبارِ دنیا میں رہتے ہوئے اسلامی نصب العین کی خدمت کرتی رہے اور آخری یہ کہ باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ وہ دارالاسلام آئیں اور ایسے ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلامِ پاک کی عملی تفسیر ہو۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں رہ کر وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور زیادہ گہرا

اٹھا لے کر واپس جائیں گے چنانچہ:

"اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی و رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی۔ حتیٰ کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے .... اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں، ان کو پھر اسی طریقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ہندوستان سے نکل کر کہیں آزاد فضا نہیں پا سکتے تو کم از کم ہم کو اسی ملک میں ایسی تربیت گاہیں بنانی چاہیئں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔"

پھر وضاحت کی ــــــ "مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبے پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسول و اصحابِ رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلف صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں، جیسا طرزِ معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (Fossilized) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں۔

اسلام کی ہرگز یہ تعلیم نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں ــــــ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ رُوح دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں ہم

یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے۔ ہم کو خَیۡرَ اُمَّةٍ جو بنایا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم ارتقا کے راستہ میں آگے بڑھنے والوں کے "پیچھے عقب لشکر (Rear Guard) کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارے خیرامۃ ہونے کا راز اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

نبیؐ و اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقا اور قوانین طبیعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اوّل میں کی گئی تھیں۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں ہے، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔ ہوائی جہاز ناپاک نہیں ہے، ناپاک، وہ تہذیب ہے جو ہوا کے فرشتے سے خدائی قانون کے بجائے شیطانی اغوا کے تحت کام لیتی ہے۔ سینما ناپاک نہیں ہے، ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کا کام لیتی ہے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا۔"

پھر سیّد صاحب نے اس تصوّر دارالاسلام کی تصریح کرتے ہوئے اس مضمون کو ان الفاظ پہ ختم کیا ہے: "یہ تحریک جسے میں پیش کر رہا ہوں نہ تو کوئی ارتجاعی (Reactionary) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیش نظر صرف مادّی ارتقا ہو۔ میرے پیش نظر جو تربیت گاہ ہے اس کے لیے گروکل کانگڑی، سنیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے اور اسی طرح جس انقلابی پارٹی کا تصوّر میرے ذہن میں ہے، اس کے لیے اٹلی کی فاشسٹ اور جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی میں بھی کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اس

کے لیے اگر کوئی نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃُ الرسول اور اس حزب اللہ میں ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کیا تھا۔"

دارالاسلام

ادہر سیّد صاحب نے ترجمان میں یہ مضمون لکھا اور ادھر حیدر آباد سے ہجرت کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ دس سال سے حیدر آباد میں رہ رہے تھے لیکن جب نصب العین نے تقاضا کیا کہ وہ اپنے وطن سے ہجرت کر جائیں تو ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ گھر کا ساز و سامان، کتابوں کی الماریاں اور بیوی بچوں کو لے کر پہنچنا کارے دارد تھا۔ پھر یکدم شہری زندگی کی آسائشوں کو چھوڑ کر دارالاسلام جیسے گوشۂ تنہائی اور دیہاتی علاقے میں پہنچنا جہاں ضروریاتِ زندگی تک پوری مہیا نہیں تھیں، ان کے بیوی بچوں کے لیے ایک کٹھن امتحان تھا۔ زندگی بھر کے مراسم، تعلقات، دوست احباب اور اعزہ و اقربا کو چھوڑ کر ڈیڑھ دو ہزار میل دُور، جنگل کے درمیان دس بارہ کوارٹروں پر مشتمل ننھی سی بستی میں جانا، یقیناً ایثار اور قربانی کی درخشندہ مثال ہے۔ اگر ہم سیّد مودودی صاحب کی متعین کی ہوئی حکومت الٰہیہ کو آخری منزل سمجھ لیں جہاں ابھی پہنچ نہیں پائے ہیں تو اس منزل کے لیے اب تک جو سفر کر لیا ہے، اس راستے کے نمایاں سنگ ہائے میل پہ اگر ترجمان القرآن، جماعتِ اسلامی اور مطالبہ دستورِ اسلامی لکھا ہوا ہے تو ایک سنگِ میل پہ جلی قلم سے لکھا ہوا ہے ——

دارالاسلام!

ابُوالخیر صاحب نے ایک دفعہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "جب ابوالاعلیٰ نے حیدر آباد چھوڑ کر دارالاسلام کی بستی میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو مَیں نے تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جو سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے اِسی قسم کا قومی درد محمد علی جوہر کے دل میں بھی تھا۔ لیکن قوم نے انہیں کیا بدلہ دیا؟ حیدر آباد میں رہ کر عزت سے علمی کام کر سکتے ہو۔ ترجمان القرآن کے ذریعے اپنے پیغام کو پھیلا

سکتے ہو۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مجھے ابوالاعلیٰ کی کس کتاب نے متاثر کیا ہے؟ مجھے اس کی کتاب کردار نے متاثر کیا ہے! کہ اس نے حیدر آباد کی اس سستے زمانے کی ساڑھے آٹھ سو روپے ماہوار کی معقول تنخواہ کو اور اچھی زندگی کو ترک کر کے پردیس کے ایک گاؤں میں سو روپے ماہوار کی آمدن کو قبول کر لیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات اور پیغام کی خدمت کر سکے۔ آپ غور تو کیجیے کہ ہم میں سے کتنے فیصد اور کتنے فی ہزار نہیں کتنے فی لاکھ لوگ یہ قربانی دے سکتے ہیں؟

ابوالاعلیٰ کا یہ ایثار آج بھی میرے دل پر نقش ہے[1]!

پنجاب کے مردم خیز خطے میں آتے ہی سیّد صاحب نے عجیب تبدیلی محسوس کی۔ انہوں نے لکھا کہ پنجاب میں آتے ہی "میں نے اچانک محسوس کیا کہ قبرستان سے منتقل ہو کر زندہ انسانوں کی بستی میں آگیا ہوں جو مجھ سے میرا مقصد، پروگرام، لائحہ عمل اور طریق کار پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اطمینان حاصل ہونے پر تعاون کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں[2]"

سیّد مودودی حیدر آباد سے ہجرت کر کے دارالاسلام آ گئے۔ یہ جگہ ایک ریٹائرڈ ایس ڈی او نیاز علی صاحب مذکور کی تھی جن کے دل میں دینی و قومی جذبہ تھا۔ ان کے علامہ اقبال سے نیازمندانہ مراسم تھے۔ جب علامہ اقبال اور سیّد مودودی نے اسلامی بستی کے دھندلے تخیّل کو عملی حقیقت بنانے کا پروگرام بنایا تو نیاز علی صاحب نے ضلع گورداسپور میں پٹھان کوٹ کے قریب اپنی زمینوں پر دارالاسلام بنانے کی پیش کش کی۔ سیّد مودودی صاحب کی ہجرت سے ترجمان القرآن کی اشاعت دو ماہ کے لیے ملتوی ہو گئی۔ جن لوگوں کو ترجمان القرآن نے ایک نئے ذوقِ مطالعہ سے آشنا کیا تھا انہوں نے یہ عرصہ بے تابی سے گزارا۔ پھر وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ دارالاسلام کی تجویز کا کیا بنا اس لیے ترجمان کے

---

[1] ہفت روزہ آئین، ۱۷ اکتوبر ۶۸ء۔

[2] ہفت روزہ ایشیا ۲۵ اپریل ۶۹ء۔

دفتر میں خطوط کا ڈھیر لگ گیا۔ سید صاحب نے قارئین کی اس دلچسپی کو دیکھ کر انہیں نئے ماحول اور نئے جذبات سے آگاہ کیا:

"پنجاب کے ضلع گورداسپور میں پٹھان کوٹ ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس سے چند ہی میل کے فاصلہ پر کوہستانِ ہمالہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مناظر کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت فرحت بخش ہے، آب و ہوا اچھی ہے، زمین زرخیز ہے، پانی کی افراط ہے، اسی علاقہ میں پٹھان کوٹ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں جمال پور واقع ہے، جہاں چند بندگانِ خدا نے 'دارالاسلام' کی بنا رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس غرض کے لیے ساٹھ ستر ایکڑ زمین حاصل کر لی ہے۔ ایک مسجد، ایک کتب خانہ کی عمارت، ایک دارالاقامہ اور دو مکان تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔ نیز اطراف و اکناف میں پھیلنے کے لیے بھی کافی جگہ موجود ہے اور وقف کی زمین اتنی زرخیز اور شاداب ہے کہ اگر اسے صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدن دے سکتی ہے۔ یہ ان ابتدائی کاموں کے لیے کافی ہے جو پیشِ نظر ہیں۔ یہاں ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں اور اس کے ساتھ یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہم کو ایک آزاد ماحول میسر آ سکتا ہے جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔ اس الگ تھلگ با ہمہ و بے ہمہ مقام پر جس تخیل کو ہم عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں اس کے لیے دارالاسلام کے سوا اور کوئی نام جامع و مانع نہیں ہو سکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت جیسے کچھ حالات بھی ہندوستان کے ہیں، انہی میں کم از کم زمین کا ایک گوشہ ایسا ہم پہنچایا جائے جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکے۔"

پھر تصویر کا دوسرا پہلو بھی قارئین کے سامنے رکھ دیا اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اس اچھے کام کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا لکھا ——— "اصل چیز روپیہ نہیں ہے بلکہ عزم و ارادہ ہے۔ البتہ خدا کی سنت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ارادوں کی طاقت کا امتحان ضرور لیا کرتا ہے۔ سو ہم تو یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہیں اور پہلے سے کہے دیتے ہیں کہ جو لوگ ہماری رفاقت کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ ہمارے پاس نہ تنخواہیں ہیں نہ وظائف ہیں۔ نہ یہاں چندے کا کاروبار ہے

اور نہ جلوسوں اور نعروں کی بہار۔ جن لوگوں کو روزگار کی تلاش ہو یا جنہیں شہرت و ناموری مطلوب ہو ان کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ اپنی زندگی کا وہی مقصد رکھتے ہوں جو ہماری زندگی کا ہے تو ان کے لیے دارالاسلام میں جگہ موجود ہے۔ جس حد تک وہ اپنی روزی کا بندوبست کر سکتے ہوں وہ خود کریں اور جس حد تک ہم ان کی مدد کر سکیں گے اس میں دریغ نہ کریں گے۔ یہاں نہ کوئی معاوضہ دینے والا ہے نہ لینے والا۔ یہ ابتدا سے ہی ارادہ کر لیا گیا ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے گا۔[1]"

ابھی اس اداریئے کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ مئی ۳۸ء میں سیّد صاحب کو لکھنا پڑا "سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی، اقبال کا سہارا تھا۔ سو وہ بھی یہاں پہنچتے ہی چھین لیا گیا (رحمۃ اللہ وطاب ثراہٗ)" اس لیے کہ ۲۱ اپریل ۳۸ء کو علامہ اقبالؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے سیّد صاحب کو پانچ دریاؤں کی سرزمین میں بلایا اور دعوت دی کہ آپ دینِ حق اسلام کا پیغام یہاں آکر پھیلائیں کہ یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی، اور پھر سیّد صاحب کے آتے ہی علامہ مرحوم بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے کے لیے چلے گئے۔ یہ تو ایسے لگتا ہے جیسے کہ ایک نسل کے علم دار نے رخصت لینے سے پہلے نئی نسل کے پیشوا کو علم تھما دیا ہو جس پر لکھا ہوا ہے:

'مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ'

یا یوں کہیے کہ طلوعِ اسلام (علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم) کی نوید دینے والے چراغ کی زندگی کا تیل ختم ہو رہا تھا۔ اس نے تجدید و احیائے دین (سیّد مودودی کی شاہکار کتاب) کے دیئے کو روشن کر دیا تاکہ تجدیدِ دین کی جو روشنی شروع ہو چکی ہے وہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ اب یہاں تاریکی مسلّط نہ ہو۔ اس کی بجائے اب آفتابِ اسلام دنیا پر ضرور ہی چمکے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ جلد ۱۱ عدد ۴ ص ۲۸۴ تا ۳۰۵

یا یوں کہہ لیجئے کہ علامہ مرحوم نے اپنے بے مثال تغزّل، حبِ رسول اور افکارِ اسلامی سے ملتِ اسلامیہ کو ——— نیست ممکن جز بقرآں زیستن ——— کے پیغام سے گرما دیا تھا۔ انہوں نے اس گرم فولاد کو سیّد صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اب آپ اسے اپنی اردوئے مبین، اپنے سائنٹفک افکار، اعلیٰ کردار اور مضبوط تنظیم سے تیغِ اسلام میں ڈھال دیں اور پھر اس تیغِ اسلام سے ساری دنیا کو فتح کر لیں۔

باب ۸

ادارۂ دارالاسلام

دارالاسلام کی بستی

ان دنوں ایک نوجوان دارالاسلام کی بستی دیکھنے آیا۔

اس نوجوان کا نام فضل الرحمان تھا جو ضلع جہلم کے ایک چھوٹے سے گاؤں خانپور میں ۱۴ جون ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوا تھا۔ ترجمان القرآن میں دارالاسلام کے بارے میں سید صاحب کا مضمون پڑھا تو بے تابیٔ دل اسے کشاں کشاں اس بستی میں لے آئی۔ پھر جب اس نوجوان کو ایک صحیح اور بلند نصب العین ملا اور اس نے اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے بدلے میں بیچ دیا، ان تھک محنت کی، بامقصد مطالعہ کیا، نانِ جویں پہ گزارہ کیا تو وہ ایک مختلف انسان تھا۔ اس نے ذہنی زلزلے، شعلۂ خیال، معرکۂ دین وسیاست اور معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل جیسی کتابیں لکھیں۔ لگ بھگ بیس کتابوں کے اس مصنف کو آپ ابوالسلام نعیم صدیقی کے نام سے جانتے ہیں۔ جنھوں نے محنت اور جانکاہ محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے، جو ایک عرصہ ماہنامہ چراغِ راہ کے مدیر رہے ہیں اور اب ماہنامہ سیّارہ کے مدیر ہیں۔ جو

ادبِ اسلامی کے اولین نقیب ہیں اور ان سب باتوں سے بڑھ کر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "محسنِ انسانیت" جیسی کتاب کے مصنف ہیں۔

نعیم صدیقی صاحب جو اب جماعتِ اسلامی میں سیّد مودودی صاحب کے بعد صفِ اوّل کے رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے دارالاسلام میں اپنی پہلی آمد کا حال لکھا ہے اور اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں ——— "ایک رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا کیوں کہ اس میں محض ایک اسلامی نو آبادی دارالاسلام کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ (ایسی آبادیوں کے ایک تخیّل کا نقش میرے ذہن نے علامہ اقبال کے ایک مطبوعہ خطبے سے اخذ کیا تھا۔ اسی پس منظر کے ساتھ میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ واقعہ میں بھی یہی دارالاسلام کی سکیم کے پیچھے اقبال کا ذہن کام کر رہا تھا۔)

اس تحریر میں سادگیٔ بیان کا حسن تو تھا ہی۔ مگر اس کا خاص اثر جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کیے جاتے۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر صحافیانہ اور خطیبانہ لفّاظی سے مدد لیے، لکھنے والے نے اس میں پوری پوری ترغیبی رُوح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے بین السطور کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے میں قاصر تھا لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے اسی لمحہ ناآشنائی میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ سکیم کیا ہے؟

۱۹۴۰ء کے وسطی حصّے میں مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لیے

ہوتے پٹھان کوٹ کا عزم لے کر چلا۔ بس والوں نے اَپر باری دوآب کی نہر کے کنارے اتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب فقیریا ادھر سے گزرا اور جب اس کو معلوم ہُوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے۔ تو اس نے سُوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ پُل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں، درختوں اور سبز گھاس کے بنے ہوئے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اُوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔ نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہُوا تو بستی کی مختصر سی آبادی کے تین چار افراد مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔

اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہُوا۔ وائل کا کُرتہ، لٹھے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پہ وائل ہی کی ایک ٹوپی جو نماز کے لیے گویا خاص تھی، پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر، پُورا لباس نہایت اُجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سے نمایاں تھا۔ اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جو ہر سیرت کی مخفی سی دمک لیے ہوئے) جس پر سکّہ بند مذہبی معیار سے چھوٹی شوخ سیاہ رنگ داڑھی! کسی تعارف کے بغیر مَیں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے مَیں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے السلام علیکم کہی جو آج تک مَیں نے کسی اور میں نہیں پایا۔ مؤدبانہ جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر نماز کھڑی ہو گئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا۔ دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد نُدرت لیے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔"[1]

---

[1] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف ص ۳۵ تا ۳۹۔

بیگم سید مودودی صاحب نے ایک مضمون میں اپنے تاثرات اور دارالاسلام کے چند واقعات لکھے ہیں "کئی پشت سے دلی جیسے شہر میں رہنے کی وجہ سے شہری زندگی کی عادی تھی۔ جب مولانا حیدر آباد سے دارالاسلام منتقل ہوئے تو یہ میری زندگی کے لیے بہت بڑا انقلاب تھا۔ دارالاسلام اور اس کی آبادی صرف ہمارے گھر اور دو گھروں پر مشتمل تھی۔ گاؤں کا سادہ گھر، نہ بجلی، نہ نل، نہ زندگی کی دوسری سہولتیں، یہ پہلا صبر آزما مرحلہ تھا۔

ایک دفعہ ہمارے پاس لکڑی نہ تھی مولانا صبح ناشتہ کر کے دفتر چلے گئے۔ میں حیران بیٹھی تھی کہ کیا کروں۔ گھر آئے تو کہا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا لکڑی نہیں ہے۔ کھانا پکانے والی بیٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے کہا بس اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو؟ یہ کہا اور ہاتھ میں کلہاڑی لے کر باہر چلے گئے۔ گھر کے سامنے بغیر چری لکڑی پڑی تھی۔ خود جا کر پھاڑنے لگے۔ ابھی انہوں نے ایک دو ہاتھ ہی مارے تھے کہ آس پاس کے کئی آدمی دوڑے ہوئے آئے اور آن کی آن میں لکڑی کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

اسی طرح ایک روز پانی بھرنے والا کسی وجہ سے پانی نہیں لایا۔ گرمی سخت تھی۔ مولانا گھر میں آئے تو میں پریشان بیٹھی تھی۔ پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے کہا پانی نہیں ہے۔ سنتے ہی دو بالٹیاں اُٹھا کر کنوئیں پر پہنچ گئے اور پانی بھرنا شروع کیا۔ لوگ دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور ذرا دیر میں پانی ہی پانی تھا۔

مولانا میرے آرام کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں راہِ خدا کی سختیاں جھیلتی رہی۔ اگر مولانا بے پروا ہوتے تو میں راہِ خدا میں شاید ان کا ساتھ نہ دے سکتی۔ دارالاسلام کی دیہاتی زندگی کی تکالیف کی وجہ سے میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مولانا نے لاہور سے ڈاکٹر پہ ڈاکٹر بلائے اور تین مہینے تک میرے علاج اور آرام و آسائش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ پچاس کے قریب انجکشن لگنے تھے۔ ایک دن بیچ پٹھان کوٹ خود تانگہ چلا کر لے جاتے اور انجکشن لگوا لاتے۔ اس طرح ان کا پورا دن ضائع ہو جاتا اور لکھنے کا کام نہ کر سکتے[1]"

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۳۴، تا ۳۷

خطبات

سیّد مودودی صاحب نے لکھا "دارالاسلام پہنچ کر پہلا کام جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مسجد کو اس علاقے کے لیے مسجدِ جامع قرار دے کر پانچ پانچ میل تک دیہات میں اعلان کرا دیا گیا کہ آئندہ سے وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے یہاں آیا کریں۔ خطیب کے فرائض میں نے خود اپنے ذمّے لیے اور نہایت سہل زبان میں، جس کو ایک اَن پڑھ دیہاتی بھی سمجھ سکے، خطبات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ الحمدللہ کہ اس کا اثر خاطر خواہ رُونما ہوا۔ پہلے جمعے میں قریب قریب پچاس آدمی تھے۔ دوسرے میں ساٹھ آئے اور تیسرے میں ۵۳ اتک تعداد پہنچ گئی۔ اُردو کے خطبہ سے لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ پانچ میل کی حد سے باہر کے لوگ بھی خطبہ سُننے کے لیے آجاتے۔ اس سے زیادہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دیہات کے لوگ خطبات کو کافی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں، سمجھتے ہیں اور نماز سے واپس جا کر ان کا مفہوم دوسرے لوگوں سے بیان کرتے ہیں[1]۔"

ان خطبات کو تاج کمپنی نے بلاکوں کی حسین کتابت اور عمدہ طباعت کے ساتھ پانچ حصّوں میں شائع کیا۔ ناشر نے گزارش کے عنوان سے سیّد صاحب کے طرزِ تحریر اور دینی خدمات کی بے حد تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے: "یہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب کہ میں بہاولپور کے سرکاری مہمان خانہ میں اقامت پذیر تھا۔ وہاں میرے محترم دوست کرنل نذیر علی شاہ کا دم میرے لیے غنیمت تھا۔ کرنل صاحب نے میرا وقتِ فرصت گزارنے کے لیے مجلہ ترجمان القرآن کے چند پُرانے پرچے مرحمت فرمائے جس میں مولانا ابُوالاعلیٰ مودودی کے پانچ خطبات متعلقہ تعلیماتِ قرآن مندرج تھے۔ ہر سطر پڑھنے کے بعد دل نے کہا کہ ہاں! یہ ہیں وہ بزرگ جن کے دم سے اِسلام دنیا میں ہر وقت سربلند و سرفراز رہے گا۔ یہ خطبات جن سے میرا دل بے حد متاثر ہوا ان عنوانات

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۱ عدد ۶ ص ۴۵۶

کے ماتحت تھے۔ حقیقتِ اسلام۔ ۲۔ حقیقتِ صوم وصلوٰۃ۔ ۳۔ حقیقتِ زکوٰۃ۔ ۴۔ حقیقتِ حج۔ ۵۔ حقیقتِ جہاد۔ اللہ اللہ حقائق کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، معارف کا بحرِ بے پایاں، حقیقتیں ہی حقیقتیں! ایک لامتناہی سلسلۂ حقیقت۔"

تمام خطبات علمِ دین کا گنج گراں مایہ ہیں۔ لیکن پہلا خطبہ 'سوچنے کی باتیں' پڑھ کر شاید ہی کوئی مسلمان ہو جو متاثر نہ ہو۔ شیخ احمد اللہ ظفر صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے کہ دوستوں اور مولویوں سے سُن سُنا کر انہیں سیّد مودودی صاحب سے خدا واسطے کا بَیر ہو گیا تھا کہ "حقیقتِ اسلام میرے زیرِ مطالعہ آئی یہ پہلی ضرب تھی جو میرے برسوں کے قائم کیے ہوئے خیالات پر پڑی۔ مجھے اپنا نظریہ ہوا میں تحلیل ہوتا نظر آیا۔ ریت کے وہ محل جو میں نے مدتوں سے بنا رکھے تھے۔ مولانا کی تحریر کی آندھی سے بکھرنے شروع ہو گئے۔ مجھے اپنے احباب کی قائم کی ہوئی ہوا اُکھڑتی محسوس ہوئی۔ میں جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چونک پڑا ہے۔"

خطبات سیّد صاحب نے عوام کے لیے لکھی تھی لیکن اس سے خواص ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ خواص کے لیے سید صاحب نے "اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر" نامی کتاب لکھی۔ اگرچہ اس میں صرف عبادت، نماز اور روزے کی بحث کی گئی ہے اور کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ تاہم اتنی بحث بھی علم کا بحرِ بے کراں ہے۔

دارالاسلام کی یادیں

نعیم صدیقی صاحب لکھتے ہیں "دارالاسلام کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل لایا گیا۔ سرنا اسٹیشن سے اسے دو فرلانگ دُور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمّالی کا کوئی قابلِ حصول انتظام تھا نہیں۔ اس لیے ہم سب مدیر ترجمان القرآن (مولانا مودودی) سمیت اِس مہم کو نکلے۔ کُرسیاں، میزیں اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک

ل؎ مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۵۷۹

ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ اجتماعی ہم چاہتا تھا سو اسے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے ہوئے لے چلے جن میں خود مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی اِدھر سے سنبھالتے کبھی اُدھر سے سہارا دیتے۔ اس موقعہ پر مولانا نے خوب کہا:

ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی ننھی سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں، تصنیفی کاموں اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولانا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے مینجر اور کاتب، مولانا صدر الدین اصلاحی اور میں اور کوئی مہمان آجاتا، تو وہ بھی سب ساتھ جاتے۔ دین و سیاست کے اہم مسائل پر بحثیں ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس سے متعلق معاملات بھی چھڑ جاتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبہ کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔

اس 'بزمِ متحرک' کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا یکجائی ہو جاتا اور سلسلۂ گفتگو عشاء تک جاری رہتا۔ اس بزمِ متحرک کا نشہ دو ہی چار دن میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ سورج خدا کے واسطے ہو جا تلے تلے! ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے۔ البتہ وہ تاثرات بیان کر سکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لیے میں بعد کی تحریکِ اسلامی کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے مَیں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص مولوی نہیں ہے (یہ بات مولویت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں) پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنا دیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص مسٹر بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور مسلم اور دین کا رمز شناس ضرور تھا مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پُر تکلف اور پُر جہل فضا نام کو بھی موجود نہیں تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔

چند دوستوں کی مبلغانہ بحثوں نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تحریک پیدا کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر مَیں نے مشرقی صاحب کے نظریے اور ان کی پیدا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک لمبا سلسلۂ گفتگو ہماری بزم متحرک میں چھڑ گیا۔ مولانا نے نظریۂ ارتقا کی توضیح کر کے بتایا کہ درحقیقت علامہ صاحب نے اپنی فکر اور تحریک کی اساس اسی نظریئے پر رکھی ہے اور اوپر سے اسے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ سُنی سُنائی باتوں کی بجائے مجھے علامہ صاحب کے اصل لٹریچر کو خود دیکھنا چاہیئے اور ٹھوس طریق سے کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے۔

کتابیں مولانا کے پاس محفوظ تھیں جن میں سے تذکرہ اور اشارات کو مَیں نے پڑھا۔ دونوں کتابوں پر مولانا مودودی کے حواشی موجود تھے اور اِن کو مَیں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوقِ تجسّس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں تو کلمہ ہائے اعتراف اور کلمہ ہائے تحسین موجود تھے، کہیں بیزاری اور اختلاف کا اظہار اور کہیں کہیں فکری لغزشوں پر سخت درجے کی گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور

سیاسی میدان میں اگر کسی کے مخالف ہوں تو اندھے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو غالی حامی۔ لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے سمجھ لی کہ یہ شخص زمانہ ساز قسم کا آدمی نہیں ہے نہ جامد اور منفی اور منفعل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیت مبنی ہے۔ بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب مردانِ کار کی طرح "بازمانہ ستیز" کے حوصلے رکھتا ہے۔ تھوڑی سی معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک سفرِ حیات بامقصد قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی نقصانات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین تر مراحل ہیں لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی سکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی عملی صورت میرے ذہن میں مشخص نہیں ہو سکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور ٹھنڈا طریقِ کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے جو ہماری قوم کا موروثی روگ بن چکا ہے۔ یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاعِ فکر و عمل منڈی کا مال نہیں ہے۔

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی یا عملی، دینی یا سیاسی کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مولانا مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے یہ محسوس نہ کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے اور بڑے آدمیوں کے بارے میں میرا جو کچھ تصور چلا آ رہا تھا وہ مودودی صاحب کے حق میں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعدِ مراتب کے بجائے میں نے قربِ اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہوئی کہ مولانا پیرانِ کہن سے نو مید ہیں اور "برجوانان سہل کن حرف مرا" کی دعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف روئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لیے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا عنوان تجویز کرنا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا کردار ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کے بالکل خلاف یہ آنے والے وقتوں کا کردار تھا۔ یہ کردار مرعوب کن نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لیے محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کیے ہوئے میں نے دارالاسلام کو الوداع کہی[۱]۔"

ادارہ دارالاسلام

ان دنوں سیّد صاحب نے ترجمان القرآن کے قارئین کے لیے یہ سطور لکھیں: "اب ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق مضبوط بنیادوں پہ ایک تعمیری تحریک اُٹھے اور وہ پھیلنے کی اتنی حریص نہ ہو جتنی استحکام کی حریص ہو۔ ہم آگ ضرور لگانا چاہتے ہیں کہ بے حرارت کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔ مگر ہمیں وہ آگ درکار نہیں ہے جو گھر پھونکنے والی ہو بلکہ وہ آگ درکار ہے جس کا ٹمپریچر ضرورت کے مطابق گھٹایا یا بڑھایا جا سکے[۲]۔"

پھر سیّد صاحب نے دارالاسلام کی تجویز کی تفصیل دی کہ ہندوستان کے طول و عرض سے سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنے والوں کو رفتہ رفتہ ایک مرکز پہ جمع کیا جائے۔ دارالاسلام میں ان کی اجتماعی طاقت سے خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ پھر کام کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جائے۔ دینی علوم میں دستگاہ رکھنے والوں کو علومِ جدیدہ سکھائے جائیں اور علوم جدیدہ کے ماہروں کو عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دے کر ان سے زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل پہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسا

---

[۱] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف ص ۳۹ تا ۴۳

[۲] ترجمان القرآن: جلد ۱۱ عدد ۶ ص ۵۲۸

لٹریچر تیار کیا جائے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کرے۔ دوسرے شعبہ میں پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، ایثار پیشہ اور دھن کے پکے کارکن تیار ہوں۔ تیسرے شعبے میں عام مسلمانوں کو دارالاسلام میں تھوڑا عرصہ اسلامی تربیت دے کر اپنے ماحول میں کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

کافی غور و خوض اور حالات کا مطالعہ کرنے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ادارہ دارالاسلام کی اسکیم اور دستور العمل کا نظام مرتب کیا گیا۔ اس کی نقول تقریباً چالیس اصحاب کے پاس بھیجی گئیں۔ یہ اصحاب زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہوں نے اس تجویز سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ انہی میں ایک عطاء الرحمان ندوی صاحب تھے۔ انہوں نے سید صاحب کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے کہ ان کے والد صاحب کا خیال تھا کہ سیّد صاحب ایک انگریزی دان، اسلام پسند صاحب ہیں جن کے پاس عمل نہیں ہوتا۔ لیکن بعد کی کتابیں دیکھ کر انہیں معلوم ہوا کہ سیّد صاحب تو عربی کے بھی بہت بڑے فاضل ہیں۔ ندوی صاحب نے سیّد صاحب کو یہ تفصیلات لکھیں:

"یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مولانا پٹھان کوٹ آ چکے تھے۔ مولانا نے جواب کے ساتھ سیاسی کش مکش، رسالہ دینیات اور دستور العمل دارالاسلام بھی روانہ فرمایا۔ والد رحمۃ اللہ علیہ نے ان چیزوں کو اوّل تا آخر بڑے شغف سے پڑھا اور نہایت دلگیری سے بار بار فرماتے رہے۔ مجھے اس شخص کے متعلق بڑی غلط فہمی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ یہ تو علامہ ابن تیمیہ کا رنگ ہے۔ تعجب ہے کہ اس قحط الرجال کے زمانے میں اور وہ بھی ہندوستان میں ایسا شخص پیدا کیونکر ہوا۔ یہ شخص عملاً جب اس کام کو کرے گا تو اس کی مخالفت بھی بڑے شد و مد سے کی جائے گی کیونکہ دنیا میں اہلِ حق کے ساتھ ہمیشہ یہی برتاؤ ہوا ہے اور بہت ممکن ہے لوگ ان کو قتل بھی کر دیں[1]۔"

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۵۲۰

۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو دارالاسلام میں ایک مختصر اجتماع منعقد ہوا جس میں ادارۂ دارالاسلام کی سکیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے شرکت کی۔ بریلی سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، جالندھر سے عبدالعزیز شرقی صاحب، سلطان پور لودھی سے مستری محمد صدیق صاحب کے علاوہ باہر سے پانچ حضرات اور آئے۔ دارالاسلام کی بستی سے چوہدری نیاز علی خاں، سیّد محمد شاہ ایم اے، مولوی صدرالدین صاحب اور سیّد مودودی صاحب نے شرکت کی۔ باہر سے بہت سے حضرات نے اپنی تجاویز تحریری صورت میں بھیجیں جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا راغب احسن ایم اے کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ مشورت تین روز تک ہوتی رہی اور آخر کار دونوں مسودات "دستور العمل ادارۂ دارالاسلام" اور "توضیح مقاصد اور طریقِ کار" منظور ہو گئے۔ پانچ اشخاص نے اپنے آپ کو رکنیت کے لیے پیش کیا جن کے نام یہ تھے: شرقی صاحب، مستری صاحب، صدرالدین اصلاحی صاحب، محمد شاہ صاحب اور سیّد مودودی صاحب۔ ان سبھی نے حلفِ رکنیت اُٹھایا[1]

انہی پانچ ارکان سے مجلسِ شوریٰ کی ترکیب عمل میں آئی اور مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں، اس وقت تک عارضی طور پر سیّد مودودی صاحب صدارت کے فرائض سر انجام دیں۔ خیال تھا کہ مقررہ تعداد ارکان فراہم ہونے کے بعد مستقل صدر کا انتخاب کیا جائے گا۔ یہ ادارہ دارالاسلام جائیداد کے مکانات میں قائم کیا گیا۔ جسے چوہدری نیاز علی صاحب نے وقف کیا تھا اور اس جائیداد کے لیے ایک الگ ٹرسٹ قائم ہوا تھا ـــــ لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں سیّد مودودی اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو اس چھوٹی سی نئی بستی کو چھوڑنا پڑا۔ سیّد صاحب حیدر آباد دکن سے ساری کشتیاں جلا کر اور گھر

---

[1] ماہنامہ چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ص ۱۲۹ - ۱۳۰

پھُونک کر اس جنگل میں آئے تھے کہ خدا کے پیغام کو بڑھانے کے لیے خواہ کیسی ہی سختیاں سہنی پڑیں، سہیں گے۔ لیکن عشق کے امتحانات تو ابھی شروع ہوئے تھے۔ اس گھر کو بھی خیر باد کہنا پڑا چنانچہ ترجمان القرآن میں لکھا: "آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ادارۂ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان کا دفتر اس مقام سے جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا تھا منتقل ہو رہا ہے[1]۔"

دراصل دارالاسلام پٹھان کوٹ کی زمین اور جائیداد چوہدری نیاز علی صاحب نے وقف کی تھی۔ وہ سیّد صاحب کے دینی خیالات سے بہت متاثر تھے۔ اس لیے انہوں نے سیّد صاحب کو یہاں بُلایا تھا۔ لیکن وہ سیاسی لحاظ سے مسلم لیگی تھے۔ وہ مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتے تھے اور سیّد صاحب ان دنوں 'مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش' کے زوردار علمی و سیاسی مضامین لکھ کر کانگریس پر تنقید کر رہے تھے اور مسلم لیگ، خاکسار، احرار اور جمعیۃ العلماء سبھی کو اسلام کے اصل نصب العین کی طرف آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ نیاز علی صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ یہاں رہیں گے تو مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھیں گے۔ بہتر ہے کہ یہاں صرف درس و تدریس اور تبلیغ ہو اور سیاست کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے۔

سیّد صاحب کا طرزِ عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ افراد کی زیادتیوں، سختیوں اور بہتانوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ترجمان کے اداریئے میں انہوں نے نیاز علی صاحب سے کوئی تعرض نہ کیا اور لکھا "ہمارا مقصد پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ضرور ہے۔ سو اس مقصد کے لیے اس جزیرہ نما کے ہر خطے میں ادارۂ دارالاسلام قائم ہو سکتا ہے۔ رہا یہ مقامِ خاص تو اس کو میں نے بعض حضرات کی دعوت اور وعدۂ اعانت پر ایک ایسی نمونہ کی بستی کے لیے پسند کیا تھا جہاں دارالاسلام کا نصب العین رکھنے والے ہر

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۵

حقۂ ملک سے سمٹ کر مجتمع ہوسکیں اور اپنے مقصد کے لیے اجتماعی سعی وجہد کرنے کی قوت وقابلیت بہم پہنچا سکیں ۔ اسی خیال کو سامنے رکھ کر میں حیدر آباد سے ڈیڑھ ہزار میل پر اپنا گھر بار اُٹھا لایا تھا اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید یہی مستقر بھی ہوگا اور مستودع بھی ۔ لیکن جب ادارہ باقاعدہ قائم ہوا اور رفقائے کار جمع ہوئے تو تمام حالات کو سامنے رکھ کر بالاتفاق یہ رائے قائم کی گئی کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیشِ نظر ہیں ان کے تتبع میں کام کرنے کا یہاں موقع نہیں مل سکتا ۔ خود میرا اپنا دس مہینے کا تجربہ بھی اس پر شاہد تھا ۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ ادارہ کا مرکز یہاں سے کسی مناسب مقام پر منتقل کر دیا جائے اور اس کے لیے متعدد حیثیات سے لاہور کو پسند کیا گیا[۱] ،،

یوں سیّد صاحب نے لاہور کو اپنا مستقر بنایا ۔

---

[۱] ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۵

باب ۹

پروفیسر

سیّد مودُودی اور علماء کرام

حکیم الامت نے کہا تھا:

پیرِ حرم کو دیکھا ہے مَیں نے   کردارِ بے سوز گفتارِ واہی

آپ ذرا ان مولوی صاحبان پر نگاہ ڈالیں جنہوں نے سیّد صاحب کی مخالفت کو زندگی کا مشن بنا لیا ہے۔ جلسوں میں دُھواں دھار تقریریں کرتے اور غضب آلود کتابیں لکھتے ہیں۔ تو آپ کو حکیم الامت کا شعر ان پر پوری طرح چسپاں ہوتا نظر آئے گا۔ ایک عام آدمی بھی سیّد صاحب اور دو رکعت کے ان اماموں کا تقابل کرتا ہے تو اسے صاف محسوس ہوتا ہے کہ سیّد صاحب ان کے برعکس لباس، خوراک، رہن سہن، نشست و برخاست اور گفتگو میں شرافت، صفائی، نفاست، خوش ذوقی اور خوش سلیقگی کے مظہر ہیں۔

لیکن بنظرِ غائر دیکھیں تو آپ کو احساس ہو گا کہ سیّد صاحب کو عام علماء کرام سے نفرت

نے دو لحاظ سے منفرد مقام عطا کیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بطور ایک وحدت اور ایک نظامِ حیات کے مطالعہ کیا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور عربی زبان کو تفصیل سے پڑھا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ یہ اجزا مقصود بالذات ہیں بلکہ اس خیال سے پڑھا ہے کہ یہ دینِ حق کے مکمل و مربوط نظام کے اہم اجزا ہیں۔ اسی لیے قدرت نے انہیں وسعتِ نظر عطا کی ہے اور وہ ہر بات کی کنہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور ہر معاملے کو دین کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ چنانچہ سائل ان سے کیسا ہی ٹیڑھا تیکھا سوال کیوں نہ کرے، وہ ہمیشہ اسلام کی صراطِ مستقیم کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور نہایت مدلل، متوازن اور شافی جواب دیتے ہیں۔

دوسری بات سید مودودی کا عام فہم، سلیس و سادہ اور دلنشین اسلوبِ بیان ہے جو نہ صرف ہوش و خرد اور قلب و نظر کو شکار کرتا ہے بلکہ قلب کو گرما دیتا اور روح کو تڑپا دیتا ہے۔ اردو زبان انیسویں صدی کے وسط تک مغل دربار کی سرپرستی اور غالب جیسے نابغۂ روزگار لوگوں کے طفیل اظہارِ بیان کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کی حامل زبان بن چکی تھی۔ لیکن ہمارے علمائے کرام اپنے بسم اللہ کے گنبد سے باہر نکلنے کے لیے آج تک تیار نہیں ہیں۔ پاکستان کے قومی ترانے کی طرح کہ جو اردو میں لکھا گیا ہے لیکن جس کے ۹۵ فیصدی الفاظ فارسی کے ہیں، ہمارے علمائے کرام بھی عوام کے سوالات کا جواب دینے کے لیے ایسی اُردو استعمال کرتے ہیں جس میں ۹۵ فی صدی عربی الفاظ اور دقیق فقہی اصطلاحات ہوتی ہیں۔ جس سے علماء اور عوام کے درمیان علم کی ایک غیر مرئی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور عوام سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری آبادی کا ایک فی صدی قلیل حصہ جو علماء پہ مشتمل ہے کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے اور ان کی زبان ننانوے فیصدی عوام کے لیے نہیں بلکہ صرف علماء کے لیے ہے —————— سید مودودی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس دیوار کو ختم کر دیا ہے۔ وہ عوام کی زبان میں آکر گفتگو کرتے اور لکھتے ہیں گویا انہوں نے فلسفہ اور افکارِ عالیہ کی (Humanization) کی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ اپنی عظمت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی زبان میں ابتذال یا عامیانہ پن نہیں

آتا۔ ان کا عوامی اسلوبِ تحریر بھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ زبان آبِ زمزم سے دُھلی ہوئی ہو۔

علمائے کرام میں سے ایک بہت بڑے عالمِ دین کی تحریر کا نمونہ ملاحظہ کریں۔ انہوں نے ایک سائل کے جواب میں لکھا "اوّل ایک قاعدہ سمجھ لیا جاوے۔ فقہائے حنفیہ نے اس قاعدے پر بہت سے احکام کو متفرع کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو مباح یا مندوب درجۂ ضرورت و مقصودیت فی الشرع تک نہ پہنچا ہو اور اس میں کوئی مفسدہ باحتمال قریب متحمل ہو تو اس مباح یا مندوب کا ترک اور اس کا منع کرنا لازم ہے"[1] ———— اگر آپ نے کسی عربی مدرسے سے سندِ فراغت حاصل کی ہو تو اس عبارت کو ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے ہمارہ اٹھارہ فی صدی تعلیم سے بہرہ ور طبقہ اس عبارت کو سمجھ سکتا ہے جب کہ پاکستان کی مردم شماری میں ہر وہ شخص تعلیم یافتہ لکھا جاتا ہے جو صرف اپنے نام کے دستخط کر سکتا ہے؟

اگر انگریز، بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے اُردو زبان کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا تو اکثر و بیشتر عربی مدارس نے بھی اردو کی تعلیم و تدریس کو آج تک اپنے نصاب میں جگہ نہیں دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام عربی صَرف و نحو اور دینی علوم کے تو ماہر ہوتے ہیں لیکن جس معاشرے میں رہ کر انہیں تحریر و تقریر سے دینِ حق کی تبلیغ کرنا ہے، اس معاشرے کی مشترک زبان یعنی اُردو پہ پورا عبور حاصل نہیں ہوتا اور تقریر سے کام تو بے شک نکال لیتے ہیں لیکن ندوۃ المصنفین اور شاذ و نادر انفرادی مثالوں کو چھوڑ کر علماء کی تحریریں وہ دِلکشی، کشش اور رعنائی خیال نہیں ہوتی جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لے۔ دوسری طرف سیّد صاحب نے دل میں اُتر جانے والے اندازِ بیان سے تن تنہا اتنا وسیع اور ہمہ گیر لٹریچر پیدا کر دیا ہے اور پھر اس تحریر میں ایک ایسی چاشنی، لذّت اور لطف قائم رکھا ہے کہ عمیق علمی اور فلسفیانہ مباحث

---

[1] تفہیمات حصہ دوم ص ۳۹۰۔

پڑھتے ہوتے بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ جن لوگوں کو سیّد صاحب کی تحریر کا ایک دفعہ لُطف آگیا ہے وہ ان کی نئی تحریر کے متلاشی رہتے ہیں۔ ورنہ پُرانی تحریروں کو ہی بار بار پڑھ کر ذوق کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔

سیّد صاحب نے چونکہ دین کو ایک مکمّل و مربوط نظام کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے، تحقیق و تدبر اور غور و فکر کیا ہے۔ اس لیے وہ دینِ اسلام کی رُوح اور مزاج پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی رائے معتدل، متوازن اور وسعتِ نظر پہ مبنی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے مضامین "رواداری کا غیر اسلامی تصوّر ——— فتنۂ تکفیر ——— نماز کے متعلق ایک عام شبہ ——— لباس کا مسئلہ ——— دیہات میں نماز جمعہ اور مسلکِ حنفی" وغیرہ پڑھیں جو "تفہیمات حصّہ دوم" میں شامل ہیں تو اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ نوجوان سیّد مودودی کی رائے کتنی صائب اور صحیح تھی۔ مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اہلِ کتاب کے ذبیحہ کو حلال قرار دے چکے تھے جب سیّد صاحب کا مضمون شائع ہؤا کہ یہ حرام ہے اور یہ مضمون عرب ممالک میں ترجمہ ہو کر شائع ہؤا تو اکثر عرب علماء نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا۔ اسی طرح نکاح کتابیہ کا معاملہ ہؤا۔ لیکن اس ضمن میں خاص طور پر اس مضمون کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "نماز میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال۔"

لاؤڈ سپیکر کے بارے میں فتویٰ

آج کل مساجد اور مذہبی مجالس میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال اتنا عام ہو چکا ہے کہ ہماری نئی نسل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جب یہ ایجاد نئی نئی ہندوستان میں پہنچی تھی تو اس کا استقبال کس طرح کیا گیا تھا۔ سیّد مودودی اس وقت عنفوان شباب میں تھے لیکن لوگ ان کی علمیت، خلوص اور تحقیق و اجتہاد پہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ ایک صاحب نے پنجاب سے وسط ۳۸ء میں انہیں لکھا:

"یہاں عید الفطر کے موقعہ پر عید گاہ کے منتظم حضرات نے لاؤڈ سپیکر نصب

کرایا تھا۔ امام کی آواز تمام مقتدیوں تک صاف طور پر پہنچتی رہی اور نماز میں باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بد نظمی کی یہ حالت ہوتی تھی کہ صفوں میں انتشار ہوتا تھا، کوئی مقتدی رکوع میں ہوتا تھا اور کوئی سجدے میں۔ نماز کے بعد مقامی علماء نے اس کی مخالفت شروع کی اور باہر سے فتوے حاصل کر کے عوام سے کہا تھا کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں۔ علماء کی بودی اور کمزور باتوں سے تعلیم یافتہ طبقہ سخت بد دل ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیشوایانِ دین ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کو بھی اسی بغاوت پر مجبور کرنا چاہتے ہیں جس پر اتاترک اور رضا شاہ مجبور ہوئے۔ اس معاملہ میں ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ ہمیں آپ کی بصیرت اور اجتہاد پر پورا اعتماد ہے[۱]۔"

سیّد صاحب نے جواب میں اس بات پر زور دیا کہ دنیا کے ہر حصّے میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کی نئی نسلیں عصرِ حاضر کے حالات اور مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتیں۔ اس زمانے میں چھٹی صدی ہجری کی منطق کام نہیں دے سکتی۔ قدم قدم پر فتاویٰ عالمگیری اور تاتارخانی کو لا کر سدِّ راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانے کے مسلمان قرآن اور حدیث کو بھی پیچھے چھوڑ کر جدھر مُنہ اُٹھے گا چل نکلیں گے۔ جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان جدید تمدّنی زندگی میں اسلام کی شاہراہ پر آگے بڑھیں تو ان کی رہنمائی کے لیے علمائے اسلام میں وسعتِ نظر اور رُوحِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔

پھر اس خاص مسئلے کے بارے میں لکھا: "لاؤڈ سپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ غیر امام کی آواز نہیں ہے بلکہ بعینہٖ وہی آواز ہے جو امام کے منہ سے نکلتی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بجلی کی طاقت سے وہ زیادہ بلند ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے اس کی حیثیت قریب قریب اس گونج کی سی ہے جو مسجد کی محراب سے امام

۱۔ تفہیمات حصّہ دوم ص ۳۷۸۔

کی آواز پر بلند ہوتی ہے .... لاؤڈ سپیکر اس قدر کامل طور پر امام کے تابع ہے کہ جب تک امام نہ بولے گا وہ بھی نہ بولے گا جو آواز امام کی زبان سے نکلے گی ٹھیک ٹھیک وہی آواز بلا ادنیٰ تغیر اس سے بھی بلند ہوگی۔ حتیٰ کہ امام کا لہجہ اور اس کا تلفظ تک جُوں کا توں منتقل ہوگا اور جو شخص امام کی آواز پہچانتا ہو وہ لاؤڈ سپیکر کی آواز سُن کر پہچان لے گا کہ یہ امام ہی کی آواز ہے[1]۔"

اور ان الفاظ پہ اس گرانقدر مقالے کو ختم کیا" میں نماز میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ احسن سمجھتا ہوں اور میرا وجدان یہ گواہی دیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ آلہ موجود ہوتا تو آپ یقیناً اس کو نماز اور اذان اور خطبہ میں استعمال فرماتے جس طرح آپ نے غزوۂ خندق میں خندق کھودنے کا ایرانی طریقہ بلاتامل اختیار فرمایا[2]۔"

ان دنوں ہمارے اہل سُنّت والجماعت کے ایک بڑے جیّد عالم سے بھی لوگوں نے اسی بارے میں فتوے طلب کیا تھا جو اپنی تصانیف اور دینی خدمات کی بنا پر بلا مبالغہ برِّصغیر پاک وہند میں اپنے عہد کے چوٹی کے عالم تھے اور جن کا فیضِ عام اب تک جاری ہے۔ لیکن انہوں نے لاؤڈ سپیکر کے بارے میں مندرجہ ذیل فتوے دیا:" تبلیغِ صوت سامعینِ بعید تک شرعاً غیر ضروری ہے۔ کیونکہ بعیدین کو دوسرے غیر مخدوش ذریعہ سے تبلیغ ممکن ہے اور اس میں یہ مفسدہ محتمل ہے کہ لوگ اس سے گنجائش سمجھ جاویں گے اس آلہ کو لہو میں استعمال کرنے کی یا دوسرے آلاتِ لہو کے استعمال کرنے کی۔ لہٰذا ترک اور منع لازم ہوگا[3]۔"

ایک صاحب نے یہی فتویٰ اظہار رائے کے لیے بھیجا تو سیّد مودودی نے

---

[1] تفہیمات حصّہ دوم: ص ۳۸۵۔

[2] ایضاً۔ ص ۳۸۹۔

[3] ایضاً۔ ص ۳۹۱۔

لکھا: "یہ ایک ایسے جلیل القدر عالم کا فتویٰ ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء کی صفِ اوّل میں ہیں۔ میرے علم کو ان کے علم سے وہ نسبت ہے جو ذرّے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ اگر اس نسبت کا لحاظ کروں تو مجھے نہ صرف یہ کہ اس پر کلام نہ کرنا چاہیئے بلکہ اپنی تحقیق کو چھوڑ کر حضرت ممدوح کی تحقیق قبول کر لینی چاہیئے۔ لیکن جب میں سلف کے طریق پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہاں مَنْ قَالَ کو نہیں بلکہ مَا قَالَ کو دیکھنے کا قاعدہ جاری تھا۔ شاگرد استاد کی تحقیق کے مقابلہ میں اور چھوٹے بڑے کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے اور تحقیق بلا تکلف پیش کیا کرتے تھے[1]"۔

سلف کی پیروی کرتے ہوئے سید صاحب نے مذکورہ فتوے پر کلام کیا" اگر شیشے کا گلاس استعمال کرنے سے اس مفسدہ کا احتمال نہیں ہے کہ لوگ اس کو شراب نوشی میں استعمال کی گنجائش نکال لیں گے اور اگر مسجدوں میں بجلی کی روشنی اور پنکھا لگانے سے یہ مفسدہ پیدا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے لیے رقص خانوں میں جانے کی گنجائش نکل آئے گی تو مکبّر الصوت کے استعمال میں بھی ایسے کسی مفسدہ کا احتمال نہیں ہے ....

اس میں شک نہیں کہ مکبّر الصوت اس زمانے میں زیادہ تر معروف کے بجائے منکر کی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن آج کون سی چیز ہے جو منکر کی خدمت نہیں کر رہی ہے؟ قلم و دوات سے لے کر چھاپہ کی مشین، ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو تک ہر چیز کا غالب استعمال آج فحشا و منکر ہی کے لیے ہو رہا ہے۔ ہر چیز سے ظلم و عصیاں کی خدمت لی جا رہی ہے[2]"۔

اور سید صاحب کے ان الفاظ میں وہ شخص بول رہا ہے جو اسلام کا علم ساری دنیا میں لہرانا چاہتا ہے، جو سرتاپا مجاہد ہے اور باطل کو مٹا کر اسلام کی بادشاہی قائم کرنا چاہتا ہے اور اتنی بات پہ اہلِ مسجد کی طرح مطمئن نہیں ہے کہ چونکہ

---

[1] تفہیمات حصّہ دوم: ص ۳۹۱۔

[2] ایضاً: ص ۳۹۲۔

سجدے کی اجازت ہے اس لیے اسلام آزاد ہے۔ آپ نے لکھا "جو تہذیب مشینوں کے زور سے پھیل رہی ہو اس کے مقابلے میں وہ تہذیب کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو تمام کارگر ذرائع اور طاقت ور اسباب سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موٹر پر دوڑنے والے کا مقابلہ چھکڑے پر چلنے والا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سیکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچا دیں اور کروڑہا کروڑ انسانوں کے خیالات کو ایک جنبشِ زبان سے مسموم کر کے رکھ دیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسہ کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی ایک طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں؟

منکر کی آواز بلند کرنے والے تو ایک شخص کو بھی اپنی بات سنائے بغیر چھوڑنا پسند نہ کریں اور معروف کی آواز بلند کرنے والوں کا اندازِ فکر یہ ہو کہ سامعینِ بعید تک تبلیغِ صوت شرعاً ضروری تو ہے نہیں لہٰذا کیوں اس کی کوشش کی جائے؟ اس طرزِ عمل کا انجام جو کچھ ہو گا بلکہ ہو رہا ہے، اس کو ہر شخص بادنیٰ تامّل جان سکتا ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ ہم ایک ایک ہتھیار کو یہ کہہ کر پھینکتے جائیں کہ دشمن کے استعمال سے وہ گندہ ہو گیا ہے اور دشمن ان سب ہتھیاروں کو اٹھا کر ہم پر حملہ کرتا چلا جائے[1]۔"

اور ان الفاظ پر اس مقالے کو ختم کیا "میرا مقصد یہ ہے کہ سائنٹفک ایجادات اور تمدنِ جدید کے آلات و وسائل کے متعلق مسلمان اپنا رویہ بدلیں۔ یہ آلات بجائے خود ناپاک نہیں ہیں۔ اصل میں طریقِ استعمال ناپاک ہے جو مغرب کی باغیانہ تہذیب نے اختیار کر رکھا ہے۔ خداوندِ عالم نے جن چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے وہ بالیقین پاک اور مطہر ہیں اور ان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ ان سے خدائی قانون

---

[1] تفہیمات حصّہ دوم: ص ۳۹۳۔

کے مطابق کام لیا جائے۔ مگر ان پر دوہرا ظلم ہو رہا ہے کہ جن کے پاس خدائی قانون موجود ہے وہ ان سے کام نہیں لیتے اور جو ان سے کام لے رہے ہیں وہ شیطانی قانون کے متبع ہیں۔[1]"

——— سیّد صاحب کے اس مضمون سے کئی سال بعد ایک جیّد مفتی صاحب نے مضمون لکھ کر لاؤڈ سپیکر کے بارے میں اپنے فتوے کو واپس لے لیا۔ آج مساجد تک میں لاؤڈ سپیکر کے عام استعمال نے اس بات کی گواہی دے دی ہے کہ نوجوان سیّد مودودی کی رائے بالکل صحیح اور صائب تھی کیونکہ اس کی بصیرت خدا کی دین ہے کہ

ع این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا

ان دنوں سیّد صاحب نے ترجمان کے اشارات قلم بند کیے جو نہ صرف ان کی اس وقت کی ذہنی حالت کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ان کی سیرت کو نکھار کر ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ "یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ سال سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں۔ مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ مگر وہ کم یاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دُور نظر آتے ہیں۔ ان کی دھن میری دھن سے الگ، ان کی گرویدہ گیری کے مرکز میرے مرکزِ گرویدگی سے جُدا۔ ان کی روح میری روح سے نا آشنا،

---

[1] تفہیمات دوم۔ ص ۳۹۵۔

ان کے کان میری زبان سے بیگانہ۔ یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے، سب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر مجبور ہوں۔

مَیں اس کے اجزا میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ مَیں ترمیم کا خواہش مند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کُلّی و ہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا۔ ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بُت خانے کے کسی نہ کسی بُت سے لَو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بُتوں کو توڑ دو مگر میرے بُت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کُلّی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کمیاب ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانہ پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا[1]۔"

انہی دنوں سیّد صاحب نے اپنا ایک اہم مقالہ 'نیا نظامِ تعلیم' لکھا!

ڈاکٹر محمد عطاء الرحمٰن ندوی لکھتے ہیں "دسمبر ۱۹۴۰ء کی آخری تاریخوں میں دارالعلوم کے قدیم طلبہ کی ندوی کانفرنس تھی۔ مَیں نے ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم ندوہ سے سند فراغ حاصل کیا تھا اس لیے مَیں بھی کانفرنس میں شریک ہونے کی غرض سے لکھنؤ گیا۔ ایک خاص محرک اس کانفرنس میں شرکت کا یہ تھا کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس زمانے میں لکھنؤ تشریف لانے والے تھے اور میری طرح ندوہ کے بہت سے فراغت یافتہ طلبہ کو مولانا سے ملاقات و تبادلۂ خیالات کا شوق تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب کانفرنس کے اختتام کے بعد ندوہ کے مہمان خانے میں تشریف لائے۔ تمام اساتذہ اور

---

[1] ترجمان القرآن مارچ ۳۹ء۔

ندوہ کے فارغ التحصیل حضرات نے مولانا سے تبادلۂ خیالات کیا۔

مختلف نشستیں مہمان خانے اور مسجد میں ہوئیں بعض نشستوں میں مجھے بھی تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اربابِ ندوہ نے مولانا سے اصحابِ تعلیم و طلبہ سے خطاب کرنے کی خواہش کی۔ لکھنؤ کی انجمن اتحادِ طلبہ کی جانب سے جس میں ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ شامل تھے جلسے کا انتظام کیا گیا تھا اور مولانا مودودی صاحب نے اپنا مقالہ "نیا نظامِ تعلیم" اپنے خاص طرزِ ادا اور اسلوب میں ارشاد فرمایا۔ صدرِ جلسہ ہمارے محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تھے۔ فریضۂ تعارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے ادا کیا۔ حضرت سید صاحب قبلہ نے مولانا مودودی صاحب کا تعارف جن الفاظ میں کیا تھا اب تک میرے کان ان صداؤں سے گونج رہے ہیں اور وہ نقشہ میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔

علامۂ محترم نے فرمایا "میں اس وقت ایک نوجوان لیکن ایک بحرِ ذخّار کا تعارف آپ حضرات کے سامنے کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔ مولانا مودودی صاحب سے علمی دنیا پورے طور پر واقف ہو چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے متکلمِ اسلام اور ایک بلند پایہ عالمِ دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا جو سیلاب ہندوستان میں آیا تھا، قدرت نے اس کے آگے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے جو خود یورپ کے جدید و قدیم خیالات سے نہایت ہی اعلیٰ طور پر کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے اور یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندوستان اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔[1]"

"حضرت سید (سلیمان ندوی) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ خاص کر اس فتنے کی طرف تھا جو نیاز فتح پوری نے دینی عقائد اور وحی و قرآن کے متعلق برپا کیا تھا اور نوجوان

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں: ص ۵۳۱ تا ۵۳۳

طبقہ اس کی طرف بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مولانا مودودی نے اس سلسلے میں متعدد مضامین سپردِ قلم فرمائے ازاں جملہ 'تجدد کا پائے چوبیں' (تنقیحات) ہے جو ہماری ندوی جماعت میں بہت پسند کیا گیا تھا[۱]۔"

انہی دنوں سید مودودی صاحب کی مولانا عبید اللہ سندھی صاحب مرحوم سے پہلی اور دلچسپ ملاقات ہوئی۔ سندھی صاحب اپنے انقلابی افکار کی وجہ سے ایک معروف شخصیت ہیں۔ جلاوطنی کا دور گزار کر اور روس ترکی وغیرہ کا دورہ کر کے ہندوستان واپس لوٹے تو ایک موقعہ پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ ان کے بے شمار عقیدت مند لاہور اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے گئے۔ علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب (جو آج کل پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) اور سید مودودی صاحب نے بھی ملنے کا پروگرام بنایا۔ سوچا کہ لاہور شہر سٹیشن پہ ہجوم زیادہ ہو گا اس لیے اس سے پہلے سٹیشن لاہور چھاؤنی پر سندھی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ دونوں حضرات لاہور چھاؤنی سٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آئی سندھی صاحب کا ڈبہ تلاش کیا۔ یہ سندھی صاحب مرحوم اور سید مودودی صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔ سید صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سلام علیکم کہی تو سندھی صاحب جیسے قیافہ شناس بزرگ نے کہا "آپ مولانا مودودی ہیں نا؟" صدیقی صاحب کو حیرت ہوئی کہ سندھی صاحب نے ابوالاعلیٰ مودودی کو بغیر تعارف یا ملاقات کے کیسے پہچان لیا۔ سندھی صاحب مرحوم نے بتلایا کہ انہوں نے مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر جس قسم کا سراپا اپنے ذہن میں سوچا تھا وہ عین اس کے مطابق نکلے ہیں۔ اس لیے انہیں پہچاننے میں تامل نہیں ہوا۔ نعیم صدیقی صاحب نے کتنی سچی بات لکھی ہے "پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک شخصیت کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔ ص ۵۳۳۔

باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے[1]۔"

اس زمانے کے بارے میں سیّد صاحب نے ایک دفعہ ایک سوال کے جواب میں کہا "صحت کی طرف سے میں ایک مدت تک بے پرواہ رہا ہوں بلکہ ایک زمانہ میں تو یہ سمجھتے ہوئے کام کر رہا تھا کہ بہر حال مجھے اپنی طاقت لگا دینی ہے خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ مَیں اس زمانے میں تقریباً (Desprate) ہو کر کام کر رہا تھا۔ کوئی پرواہ نہ تھی کہ کتنا بوجھ پڑ رہا ہے اور صحت پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ ۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک مَیں اسی طرح کام کرتا رہا۔ کوئی مددگار نہ تھا تنہا کام کر رہا تھا۔ مَیں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ کام چلے یا نہ چلے اس لیے جو کچھ مَیں کر سکتا ہوں وہ تو کر ڈالوں۔ کیونکہ یہ یقین نہیں تھا کہ ساتھی مل جائیں گے اور جس کام کے لیے مَیں کوشش کر رہا ہوں اس میں کامیابی بھی ہو گی[2]۔"

سیّد صاحب کے مسلسل لکھتے رہنے اور میز پر کُہنیاں ٹیکنے سے کُہنیاں شل ہو جاتیں۔ ایک دفعہ سیّد صاحب نے بتلایا "برسوں میرا معمول رہا کہ مَیں عشاء کی نماز پڑھ کر کام کرنے بیٹھتا اور صبح کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے "سیاسی کشمکش حصّہ دوم"، رمضان رمضان میں ہی لکھی تھی۔ پورے رمضان میں یہ معمول رہا کہ تراویح پڑھ کر بیٹھتا تو پھر سحری کے لیے ہی اٹھتا۔ چنانچہ اس رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے اب حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص رات کے کسی حصّے میں جگا کر مجھ سے وقت پوچھے تو میں فضا دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ رات کے کتنے بجے ہوں گے[3]۔"

ایسے ہی لوگوں کے لیے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا کہ انکا مقام ثریا سے بھی بلند ہے۔

واقف ہو اگر لذّتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریّا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار

---

[1] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف۔ ص: ۳۴

[2] ہفت روزہ آئین۔ ۱۷ اگست ۶۵ء

[3] ایضاً

پروفیسر

لاہور کے اس سوا تین سالہ قیام (جنوری ۳۹ء تا اپریل ۴۲ء) کے دوران سیّد مودودی صاحب نے بہت زیادہ محنت کی۔ کئی ایک اہم کتب تحریر کیں، جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اسی عرصے کے درمیان اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ سیّد صاحب وہاں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے قوم کے نوجوانوں کو اپنا پیغام دیتے رہے۔ سیّد صاحب اعزازی طور پر پڑھاتے تھے۔ ایک سال بعد آقایانِ کالج نے تنخواہ دینے پر اصرار کیا تاکہ وہ اس مردِ آزاد پر کچھ پابندیاں لگا سکیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیّد صاحب کو یہ سلسلہ ہی منقطع کر دینا پڑا۔

اسی دوران علی گڑھ یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج پشاور کے نوجوان طلبہ نے سیّد صاحب کو دعوت دے کر اپنے ہاں بلوایا اور ان کے فکر انگیز مقالات سُنے۔ دار العلوم ندوۃ میں سیّد صاحب کے مضمون "نیا نظامِ تعلیم" کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ دینی تعلیم کے طلبہ سے خطاب تھا۔ جب پشاور اسلامیہ کالج کے طلبہ کو جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر خطاب کیا تو انہوں نے جدید مغربی تعلیم کو سمِ قاتل قرار دیا۔ نوجوان طلبہ اور اساتذہ نے سیّد صاحب کی صاف گوئی کو وسیع القلبی سے سُنا۔ سیّد صاحب نے کہا کہ

"یہاں جو تعلیم و تربیت آپ کو ملتی ہے، جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے، جو خیالات، جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے ہیں، جو عادات و اطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں اور جس طرزِ فکر، رنگ، طبیعت اور طریقِ زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں۔ کیا وہ سب مِل جُل کر اس زمین، اس آب و ہوا اور اس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرزِ زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں کو آخر کون سا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا

جینا اور مرنا ہے اور اس تمدن کے ساتھ ہے جو آپ کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے، آپ کی شخصیت اس ماحول میں کس قدر بیگانہ ہے اور ماحول آپ کی شخصیت کے لیے کتنا اجنبی ہے۔"

۱۳ اپریل ۳۹ء کو ٹاؤن ہال لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے بعد پہلے یوم اقبال پہ تقریر کرتے ہوئے سید صاحب نے "جہاد فی سبیل اللہ" کے موضوع پر اپنا فکر انگیز مقالہ پڑھا۔ یہ چھوٹی سی کتاب اختصار اور جامعیت کا مرقع ہے اور بتایا ہے کہ جہاد تو خدا کے پیغام کو اپنی پوری کوشش سے دنیا میں پھیلانے (جدوجہد) کا نام ہے۔ اس میں مدافعانہ جنگ اور جارحانہ جنگ یا ان دو اقسام کے درمیان تمیز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اکتوبر ۳۹ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہُڈ لاہور کے ایک جلسے میں "اسلام کا نظریہ سیاسی" کے عنوان سے ایک انتہائی اہم مقالہ پڑھا۔ اس میں بتایا کہ اسلامی ریاست کا مقصد کیا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ اسلامی ریاست قانون اور قوتِ نافذہ کے زور سے لوگوں کو برائی سے روکے، نیکی کا حکم دے اور نماز و زکوٰۃ کا نظام قائم کرے۔ پھر اختصار سے بتایا ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت کن کن امور میں جمہوریت، پاپائیت، اشتراکیت اور فاشیت سے اتفاق و اختلاف کرتی ہے۔

مئی ۱۹۴۰ء کو ریاست کپور تھلہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے تقریر کی۔ اس میں وجود باری تعالیٰ، توحید اور صراطِ مستقیم کو آسان اور سہل زبان میں بتایا اور واضح کیا کہ اسلام ہی انسانیت کے لیے سلامتی کا واحد راستہ ہے۔ یہ تقریر "سلامتی کا راستہ" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

پھر ۱۲ ستمبر ۴۰ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک پُر مغز مقالہ پڑھا جو "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالے کو پڑھتے ہوئے اس کا یہ پس منظر ذہن میں رکھیں کہ اس زمانے میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا مسلمانوں میں عام چرچا تھا۔ سید صاحب کے اس مقالے سے ان کی سیاسی بصیرت اور دینی فہم کے حسین امتزاج کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

جب اس کتاب (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے) کا ترکی زبان میں ترجمہ ہوا تو ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوئی۔ ترکی میں یہ قانون ہے کہ اگر کوئی شائع شدہ کتاب یا دیگر مواد حکومت کے نزدیک قابلِ اعتراض ہو تو اس کے شائع ہونے کے چھ ماہ کے اندر اندر اس پر پابندی لگا دینی چاہیئے۔ اگر چھ ماہ کے عرصے میں یہ پابندی نہ لگائی جائے تو پھر اس کی اشاعت کو از روئے قانون نہیں روکا جا سکتا۔ اس کتاب کا ترکی ترجمہ شائع ہوا تو شائع ہونے کے چھ ماہ بعد حکومت کے نوٹس میں یہ بات آئی۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ کتاب کی اشاعت روکی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے کتاب کی خوب اشاعت ہوئی۔

ان دنوں سید صاحب نے آل انڈیا ریڈیو لاہور سے چند تقاریر نشر کیں۔ ۴۱ء میں ۱۰ر اپریل کو سرورِ عالم ؐ کے بارے میں، جون میں زندگی بعد موت پر، ۲۰ر اگست کو معراج کی رات پر، اور ۲۹ر دسمبر کو عید قربان پر آپ کی تقاریر نشر ہوئیں۔ ۲۰ر مارچ ۴۲ء کو میلاد النبیؐ پر اور ۳۰ر جولائی ۴۳ء کو معراج کے سفر نامے پر تقاریر نشر ہوئیں۔ یہ سب ریڈیائی تقریریں اب "نشری تقریریں" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔

۲۳ر فروری ۴۱ء کو مجلس اسلامیات اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر ایک مقالہ پڑھا جو اب "اسلام اور جاہلیت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں خالص جاہلیت، جاہلیت راہبانہ اور جاہلیت مشرکانہ کے مقابلے میں انسانیت کے ابدی مذہب اسلام کو رکھ کر واضح کیا ہے کہ صحیح اسلام کیا ہے اور آج ہمارے مذہب میں مختلف جاہلیتوں کی کس حد تک آمیزش ہو چکی ہے۔ اس مقالے کے سامعین میں صوبہ سرحد کی جماعت کے مشہور و معروف رکن فضلِ معبود صاحب بھی تھے جو اس مقالے کو سننے کے لیے خاص طور پر راولپنڈی سے پشاور آئے تھے۔ تحریکِ اسلامی کے اس سپاہی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ۴۸ء میں جب پہلی دفعہ حکومت نے جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں کو گرفتار کیا تو ان سے بھی پہلے فضلِ معبود صاحب کو صوبہ سرحد میں گرفتار کیا گیا۔ گویا انہیں سوئے قفس جانے کی افضلیت حاصل ہے۔

پھر انہی دنوں سید صاحب نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" لکھ کر رب، الٰہ، دین اور عبادت کی علمی اور فاضلانہ تشریح کر کے ان کا وسیع اور صحیح مفہوم بتلایا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ سید صاحب کی یہ مختصر لیکن جامع کتاب بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن ان تمام کُتب میں ممتاز ترین کتاب جو ان دنوں میں لکھی گئی اور جو سید صاحب کی ایک شاہکار کتاب ہے اس کا نام ہے:

"تجدید و احیائے دین۔"

باب ۱۰

تجدید و احیائے دین

کارِ تجدید کی نوعیت

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے رسالہ "الفرقان" لکھنؤ کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالا تو سیّد مودودی صاحب نے عدیم الفرصتی کے باوجود اس کے لیے ایک بسیط مضمون "تجدید و احیائے دین" لکھا جو مستقل کتاب ہے۔ نعمانی صاحب نے دوسرے ایڈیشن کے ادارتی اشارات میں لکھا "ایک صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ سیّد ابوالاعلیٰ صاحب کسی مدرسہ کے فارغ التحصیل عالم نہیں ہیں اس لیے انہیں شرعی مسائل میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ بعینہٖ یہی تنقید کسی زمانے میں بعض درسی حلقوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کہی جاتی تھی۔ حقیقتِ اسلام اور مقتضیاتِ اسلام کے ادراک اور پھر ان کی تبیین کے بارے میں ان (سیّد مودودی) پر حق تعالیٰ کی خاص نوازش ہے۔ اگرچہ وہ باقاعدہ فارغ التحصیل نہیں ہیں تاہم علومِ دین (تفسیر، حدیث، فقہ) کو انہوں نے ابتداءً باضابطہ اہلِ درس علماء سے ہی پڑھا ہے۔"[1]

سیّد مودودی صاحب نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے "جن ناموں کیساتھ حضرت، امام، حجۃ الاسلام، قطب العارفین، زبدۃ السالکین اور اسی قسم کے الفاظ لگ

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص ۱۷، ۱۸

جاتے ہیں ان کی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کاموں کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک مشخص کر سکے کہ کس نے اس تحریک کے لیے کتنا اور کیسا کام کیا ہے اور اس خدمت میں اس کا حصّہ کس قدر ہے۔ عموماً تحقیق کی نپی تُلی زبان کے بجائے ان بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر پڑتا ہے اور شائد لکھنے والے کے ذہن میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ فردِ کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری مرتبے پر پہنچا ہوا تھا۔ حالانکہ اگر اب ہم کو تحریکِ اسلامی کی تجدید و احیار کے لیے کوئی کوشش کرنی ہے تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑے گا اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہو گا کہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کتنا کام کس کس طرح کیا ہے۔ ان کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور ان سے کیا چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے۔"[۱]

مریدانہ ذہنوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ بزرگوں کے کاموں کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھا جائے!

پہلے باب 'اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش' میں سیّد صاحب نے بتایا ہے کہ زندگی کے چار بڑے بڑے نظریئے ہیں خالص، مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں کے بعد اسلام کی مختصر لیکن جامع تعریف کی ہے۔ پھر انبیار علیہم السلام کا مشن اور نبی کے کام کی نوعیت لکھنے کے بعد بتایا ہے کہ رسول اکرم صلعم نے یہ کام مکمل کیا۔ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے اسے جاری رکھا۔ عثمان غنیؓ کے عہد میں ابتداءً چند سال تک وہ نقشہ بدستور جما رہا جو رسول کریمؐ نے قائم کیا تھا۔ بعدازیں جب علمائے کرام سیّد مودودی

---

[۱] تجدید و احیائے دین۔ ص ۷

صاحب سے ناراض ہوئے تو انہوں نے فتوے دیئے کہ اس سے حضرت عثمانؓ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ سیّد صاحب نے لکھا "میرا مدعا صرف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ میں بعض ان اوصافِ حکمرانی کی کمی تھی جو سیّدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما میں بدرجہ کمال پائے جاتے تھے۔ یہ تاریخ کا مسئلہ ہے جس کے بارے میں تاریخ کے طالب علم مختلف رائیں ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی فقہ و کلام کا مسئلہ نہیں ہے کہ دارالافتاؤں سے اس کے متعلق کوئی رائے بصورت فتویٰ صادر کی جائے"۔[1]

کتاب کا دوسرا باب "کارِ تجدید کی نوعیت" ہے۔ یہی صرف تیرہ صفحات کا باب پوری کتاب کا حاصل ہے۔ اسی باب میں انہوں نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو چونکا دینے والے ہیں۔ ایک طرف جدید مسلمان کا ذہن اس کی طرف لپکتا ہے دوسری طرف انہی تیرہ صفحات کی عبارتوں پر کچھ خاص علمائے کرام نے مخالفت کا طومار باندھ دیا ہے۔ پاکستان میں پچاس سے زائد اور ہندوستان میں پچیس سے زائد کتابوں میں جو سیّد مودودی کو غلط اور گمراہ ثابت کرنے کے لیے شائع ہوئی ہیں اس باب پر ضرور لے دے کی گئی ہے۔ اس باب میں کارِ تجدید کی ایسی تفصیل دی ہے جو کچھ لوگوں کے نزدیک بظاہر سیّد صاحب اور جماعت اسلامی کے کام پر تھوڑی بہت منطبق ہوتی ہے اور مجدد کامل اور امام مہدی کے بارے میں کچھ ایسے خیالات پیش کیے ہیں جو ان کی اپنی شخصیت کے ایک حد تک قریب ہیں لیکن ان کی ایسی شخصیت ۱۹۵۰ء یا اس کے بعد اُبھر کر کھلی اور سیّد صاحب نے یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں گویا گیارہ بارہ سال پیشتر لکھی۔ اس لیے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے اور مخالفین اس خطرے کی گھنٹی بجاتے رہتے ہیں کہ شاید سیّد مودودی مجدد کامل یا مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔ حالانکہ

جس شخص نے پھانسی کے سانحے میں اپنے لیے کوئی دعویٰ نہیں کیا وہ اب کیا دعویٰ کرے گا!

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۳۶۔

اس باب میں سیّد صاحب نے مجدّد کی تعریف لکھی ہے "مجدد نبی نہیں ہوتا مگر اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک، بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں تکمیل شرح صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت میں تمیز کرنا اور مدت ہائے دراز کی اُلجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص مجدد نہیں ہو سکتا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں[1]۔"

مجدّد کامل کا کام

پھر یہ بتایا ہے کہ مجدّد اور نبی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ نبی کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی اُترتی ہے۔ دوسرے وہ دعوے سے کام کا آغاز کرتا اور لوگوں کو اپنی نبوّت کی طرف بلاتا ہے۔ اسے نبی ماننا یا نہ ماننا مدارِ کفر و ایمان ہوتا ہے۔ مجدّد ان خوبیوں کے برعکس ہوتا ہے۔ پھر سیّد صاحب نے 'کارِ تجدید' کے عنوان کے ذیل میں یہ بتایا ہے کہ ایسے مجدّدِین کو جو رسول اکرم صلعم کی حدیث کے مطابق ہر صدی کے بعد مسلمانوں میں دینِ اسلام کو جاہلیتوں کی آمیزشوں سے دُور کرنے کے لیے پیدا ہوتے رہیں گے کیا کام کرنا ہو گا۔

"اس کارِ تجدید کے مختلف حسبِ ذیل شعبے ہیں:

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۴۶

۱۔ اپنے ماحول کی صحیح تشخیص یعنی حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں، کس حد تک سرایت کر گئی ہے۔ کن کن راستوں سے آئی ہے، اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

۲۔ اصلاح کی تجویز۔ یعنی یہ تجویز کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

۳۔ خود اپنے حدود کا تعین یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستہ سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

۴۔ ذہنی انقلاب کی کوشش یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علومِ اسلامی کا احیا کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سرِ نو تازہ کر دینا۔

۵۔ عملی اصلاح کی کوشش یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباع شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

۶۔ اجتہاد فی الدین۔ یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصول شرع کے ماتحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح رد و بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں اور تمدن کے صحیح ارتقا میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

۷۔ دفاعی جدوجہد۔ یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے اُبھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

۸۔ احیائے نظامِ اسلامی۔ یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سرِ نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا، جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۹۔ عالمگیر انقلاب کی کوشش۔ یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں

مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا۔ بلکہ ایک ایسی طاقتور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظامِ تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو اور عالمِ انسانی کی اخلاقی و فکری اور سیاسی امامت و ریاستِ اسلام کے ہاتھ میں آجائے۔

ان شعبوں پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے۔ لیکن باقی چھ مدیں ایسی ہیں جن کا جامع ہونا مجدد ہونے کے لیے شرط نہیں ہے۔ بلکہ جس نے ایک دو تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا وہ بھی مجدد قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد جزوی مجدد ہوگا کامل مجدد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کر دے[1]۔

اس کارِ تجدید کو پڑھنے کے بعد جب لوگوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ نمبر ۴ تا ۶ یعنی ذہنی انقلاب اور عملی اصلاح کی کوشش اور اجتہاد فی الدین کے شعبوں میں تو سید مودودی اور جماعتِ اسلامی پوری طرح سرگرمِ عمل ہے اور ساتویں شق دفاعی جدوجہد، ان کی جمہوری اور سیاسی اور دستوری جدوجہد ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ضرور یہ بھی مجدد ہونے کا دعوےٰ رکھتا ہے ——————— دشمنوں اور مخالفوں میں بھی ایک بہت قلیل تعداد کے کچھ لوگوں کا یہی خیال ہے۔ لیکن سید صاحب نے اس خیال کو کبھی تقویت نہیں ملنے دی۔ کتاب کے شائع ہونے کے بعد ۱۹۴۱ء میں مناظر احسن گیلانی اور پھر سید سلیمان ندوی نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ شاید سید مودودی صاحب مجدد ہونے کے مدعی ہیں۔ سید صاحب نے جواب لکھا کہ کسی کام کو تجدیدی کام کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو تجدیدی کام کرے وہ مجدد کے لقب سے بھی ملقب ہو۔ صدی کا

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۴۸ تا ۵۰۔

مجدد ہونا تو اس سے بلند تر بات ہے۔ اینٹیں چُن کر دیوار بنانا بہر حال ایک تعمیری کام ہے۔ مگر کیا یہ لازم ہے کہ جو چند اینٹیں چُن دے وہ انجینئر بھی کہلائے اور پھر انجینئر بھی معمولی انجینئر نہیں بلکہ اپنی صدی کا انجینئر۔[1]"

"مجدد کامل کا مقام" کے تحت سیّد صاحب نے لکھا ہے کہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجدد کامل کا مقام ابھی خالی ہے۔ عقل، فطرت اور رفتارِ زمانہ تقاضا کرتے ہیں کہ ایسا لیڈر پیدا ہو۔ خواہ اس دَور میں پیدا ہو یا ہزار گردشوں کے بعد۔ بہرحال اسی کا نام امام مہدی ہوگا جس کی طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نے واضح اشارات کیے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہوگی پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی۔ آخر میں پھر نبوت کے طریقے پر خلافت ہوگی۔ اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔ سیّد صاحب نے لکھا ہے "تین دَور گزر چکے ہیں اور چوتھا اب گزر رہا ہے آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے ازم آزمائے جا چکے ہیں اور بُری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔[2]"

کیا سیّد مودودی امام مہدی ہیں؟

پھر سیّد صاحب نے امام مہدی کے بارے میں لکھا ہے کہ "لوگ سمجھتے ہیں کہ امام

---

[1] تجدید و احیائے دین ۔ ص ۱۷۳

[2] ایضاً فٹ نوٹ ۔ ص ۵۳

مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع و قطع کے آدمی ہوں گے۔ تسبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے۔ علماء و مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کریں گے۔ پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائے گا، چلّے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے بقیۃ السلف ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہوگا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے، جس کافر پر نظر ماریں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے[1]۔"

تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور عملیات پہ اندھا یقین رکھنے والے لوگوں اور قدیم خیال کے مسلمانوں کا امام مہدی کے بارے میں سُنا سُنایا تصوّر کچھ اسی قسم کا ہے۔ سیّد صاحب نے اس تصوّر کی جڑ ہی کاٹ دی اور دنیا کو دار الاسباب سمجھنے والے جدید ذہن کو ایک نیا تصوّر دیا: "میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکّہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدّتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی اُمید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اسے تاڑ لیا جائے[2]۔"

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۵۴

[2] ایضاً۔ ص ۵۵

معترضین نے اس عبارت پر دو اعتراضات کیے ہیں۔ سید صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :" میں نے یہ بات جو کہی ہے کہ مہدیٔ موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ داڑھی منڈوائے گا، کوٹ پتلون پہنے گا اور اپ ٹو ڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانہ میں بھی پیدا ہوگا اس زمانہ کے علوم سے، حالات سے اور ضروریات سے پوری طرح واقف ہوگا۔ اپنے زمانہ کے مطابق عملی تدابیر اختیار کرے گا اور ان تمام آلات و وسائل سے کام لے گا جو اس کے دور میں سائنٹفک تحقیقات سے دریافت ہوں۔ یہ تو ایک صریح عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر نبی اکرمؐ اپنے زمانہ کی تدابیر مثلاً خندق، دبابہ، منجنیق وغیرہ استعمال فرماتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ کسی دور میں جو شخص حضورؐ کی جانشینی کا حق ادا کرنے اٹھے گا وہ ٹینک اور ہوائی جہاز سے، سائنٹفک معلومات سے اور اپنے زمانہ کے احوال و معاملات سے بے تعلق ہو کر کام کرے گا۔ کسی جماعت کے حصولِ مقصد اور کسی تحریک کے غلبہ کا فطری راستہ ہی یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو کام میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم و فنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے۔[1] "

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بہت سی احادیث میں واضح طور پر مہدی کی علامات دی ہوئی ہیں۔ پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ وہ جسمانی ساخت میں عام انسانوں سے مختلف نہیں ہوگا۔ "ظہورِ مہدی کے متعلق جو روایات ہیں ان کے متعلق ناقدینِ حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ بالا علامات کو

---

[1] رسائل و مسائل حصہ اول - ص ۷۳

چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہورِ مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں۔ لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے اور اہلِ غرض نے شائد بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشادِ نبوی پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدیٔ موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انہی روایات نے بہم پہنچایا ہے۔[1]"

سیّد صاحب نے مہدی کے بارے میں لکھا "مجھے اس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات اور چلّوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جدّوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (School of Thought) پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائے گا۔ جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو اُلٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی سٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری رُوح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔[2]"

نعمانی صاحب نے شاہ ولی اللہ نمبر کے اداریئے میں کہا کہ سیّد مودودی صاحب نے "مجدّدِ دین" کے کارناموں پر اپنے مخصوص محققانہ انداز میں تبصرہ فرمایا ہے اور اپنے عندیہ کو پوری جرأت سے پیش کیا ہے۔ خود راقم السطور کو بھی اس کے بعض اجزا سے پورا اتفاق نہیں ہے تاہم ان (سیّد مودودی) کے ان افکار پر بار بار ہم کو غور کرنا اور ٹھنڈے دل اور آزاد ذہنیت سے غور کرنا چاہیئے۔ محترم مولانا کے مقالہ کا یہ حصّہ عصرِ حاضر میں خدمتِ دین کا صادق جذبہ رکھنے والوں کے لیے خاص طور پر قابلِ غور ہے اگرچہ اس کے

---

[1] رسائل و مسائل حصّہ اوّل۔ ص ۶۴۔ [2] تجدید و احیائے دین۔ ص ۵۶۔

بعض حصے انہی پر زیادہ گراں گزریں گے۔[1]

اس کتاب کو شائع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ جماعت اسلامی سے سیاسی اختلاف رکھنے والے علماء نے سیّد صاحب کو ہدفِ تنقید بنانے کے لیے اسی عبارت کو آڑ بنایا۔ شروع میں دبی دبی زبان سے کہا جاتا رہا کہ سیّد مودودی صاحب خود مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔ لیکن ۵۰ء میں غالباً مسلم لیگ کی مالی پُشت پناہی سے ملتان کے چند معروف علماء کا ایک گروپ سیّد صاحب کو لاہور میں ملا اور اس عبارت کی وضاحت مانگی اور تابڑ توڑ سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر کے اصرار کیا کہ آپ اعلان کریں کہ آپ مہدی نہیں ہیں۔ واپس لوٹ کر ایک کتابچہ لکھا جس کا نام "خطرے کی گھنٹی" رکھا جس میں مسلمان قوم کو متنبہ کیا کہ یہ شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا اس خطرے سے آگاہ رہیں۔

انہی دنوں سیّد صاحب ملتان میں انتخابی مہم کے سلسلے میں پہنچے۔ ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا۔ ایک شخص نے چِٹ پر یہ سوال لکھ کر دیا کہ یہاں سے "خطرے کی گھنٹی" نام کی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں فلاں عالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ مستقبل میں مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔ سیّد صاحب نے چِٹ پڑھ کر سامعین کو سُنائی۔ اطمینان سے اسے دوسری طرف رکھ دیا۔ اور یوں گویا ہوئے "میں مہدی ہونے کا دعویٰ کروں گا یا نہیں کروں گا یہ تو بعد کی بات ہے۔ جس شخص نے یقین کے ساتھ خلقِ خدا کو میرے بارے میں یہ بتا دیا کہ مَیں مستقبل میں یہ دعوےٰ کروں گا، اس نے بہرحال اپنے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ ضرور کر دیا ہے۔" سیّد صاحب کی اس حاضر جوابی سے سامعین میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

پھر سیّد صاحب نے کہا اور یہ جواب وہ مسلسل اپنے معترضین کو دیتے آئے ہیں اور یہ جواب سب سے پہلے جون ۴۶ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہُوا تھا "جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعتِ اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ مَیں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۱۷-۱۸

ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرت خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں[1]۔"

تاریخِ تجدید کا تنقیدی مطالعہ

"کارِ تجدید کی نوعیت" کے بعد سیّد صاحب نے حضرت عمر بن عبدالعزیز، ائمہ اربعہ، امام غزالی، ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی رحمہم اللہ اجمعین مجدّدین اُمّت کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ آخری باب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تعمیری و تنقیدی کام اور سیّد احمد شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان بزرگانِ دین کی خدماتِ جلیلہ کا ایسا جامع نقشہ کھینچا ہے کہ ان کی عظمت دلوں پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ آخر میں سیّد صاحب کہتے ہیں کہ اس ذکر اذکار سے اگر ہمیں اپنے بزرگوں کو صرف خراجِ تحسین ہی ادا نہیں کرنا ہے اور آئندہ تجدیدِ دین کے لیے سبق بھی حاصل کرنا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ اس کے بعد سیّد صاحب نے تحریکِ مجاہدین کی ناکامی کے تین اسباب گنوائے ہیں کہ تصوف، اسلامی حکومت کے علاقے (صوبہ سرحد) کی آبادی میں پہلے سے اخلاقی اور ذہنی انقلاب کی کمی اور یورپ کی علمی، فکری، مادی، فوجی ترقی کا ٹھیک وقت پر نوٹس نہ لینا یہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر ایسی شاندار اسلامی مجاہدانہ تحریک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

چنانچہ "اب جس کسی کو تجدیدِ دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات سے، رموز و اشارات سے، لباس و اطوار سے، پیری مریدی سے اور ہر اس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو

---

[1] ترجمان القرآن جون ۴۶ء

اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابطیس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے[1]۔"

اور "اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں، وہ نقش برآب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد میں ان دونوں شہیدوں کا اور ان کے کام کا کوئی اثر ڈھونڈے نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ وہاں کے لوگ ان کے ناموں سے اب کچھ اردو لٹریچر کی بدولت واقف ہونے لگے ہیں[2]۔"

تیسرے سبب ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں انگریز بنگال پر چھا گئے اور الہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے زمانے میں دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خور ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے۔ ہندوستان میں اس وقت اصل طاقت انگریزوں کی تھی نہ کہ سکھوں کی جن سے وہ برسرپیکار تھے۔ ان بزرگانِ دین نے انگریزوں کی طاقت اور اس کے پیچھے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ، انقلابِ فرانس، بے شمار فلاسفہ کے افکار، سائنسی ترقیات اور نئے علوم وفنون اور نئے غالب تمدن کے اسباب کے بارے میں کھوج لگانے کی فکر نہ کی "سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دُور رس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا تھا اس کے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کرتے اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دُور کرنے کی فکر کرتے۔ بہر حال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اس عالمِ اسباب میں ایسی چوک کے

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۱۳۴

[2] ایضاً ص ۱۳۶۔ اور فٹ نوٹ۔

نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے[1]"

بزرگانِ دین کو انبیاء کی طرح معصوم اور تنقید سے بالاتر سمجھنے والے عقیدت مند صاحبان کو یہ بات ناگوار گزرتی آئی ہے کہ سیّد مودودی صاحب نے ایسے ایسے عظیم مجدد دین کے کارنامے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کاموں پہ تبصرہ کیوں کیا ہے۔ اس بات کو وہ کُھلم کھلا تو تسلیم نہیں کرتے، لیکن یہ کہہ کر کہ یہ شخص اسلاف پہ نکتہ چینی کرتا ہے اور ان کے نقائص ڈھونڈتا ہے، ایسے صاحبان نے سیّد صاحب کو ہر قسم کی گالیوں سے نوازا ہے۔ سیّد صاحب نے ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"مجددین امت کے کام پر مَیں نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہر حال میری اپنی رائے ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ میری جس رائے سے چاہے اختلاف کرے۔ مَیں نے جن دلائل کی بنا پر کوئی رائے قائم کی ہے ان پر آپ کا اطمینان ہو تو اچھا ہے۔ نہ اطمینان ہو تو مضائقہ نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کسی رائے کو رد یا قبول کرنے کا انحصار دلیل اور تحقیق پر رکھیں۔ اکابر پرستی کے جذبے سے متاثر نہ ہوں[2]"

اگرچہ سیّد صاحب نے اس مضمون یا کتاب کو ایک رسالے کے خاص نمبر کے لیے لکھا تھا۔ لیکن یہ مختصر سی کتاب ان کا عظیم شاہکار ہے جو قاری کے ذہن کو متاثر کرتی ہے اور اسے نئے انداز پہ سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ سیّد صاحب نے کتاب کے پانچویں ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھا:

"حال میں اس کتاب کو بعض حضرات نے خاص طور پر اپنی عنایات کا ہدف بنایا ہے۔ اس لیے مَیں نے نظرِ ثانی کر کے اس کی تمام عبارتوں کو واضح کر دیا ہے جن سے

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۱۴۱۔

[2] ایضاً۔ ص ۱۵۱۔

طرح طرح کے نقشے نکالے جا رہے تھے اور ان تمام بیانات اور منقولہ عبارات کے حوالے درج کر دیئے ہیں۔ جنہیں یہ سمجھتے ہوئے نشانۂ اعتراض بنایا گیا تھا کہ شاید یہ سب میرے طبع زاد ہیں[1]۔"

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ ص ۹۔

حصّہ دوم

تنظیم اور ہجرت

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے عجیب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل
مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ

اقبالؒ

باب ۱۱

جماعت اسلامی (۱)

آوازِ رحیلِ کارواں

"اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقعہ نہیں اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نظریہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے۔ جس کے لیے نوعِ انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔"

اپریل ۴۱ء کے ترجمان القرآن میں سید مودودی صاحب نے 'ایک صالح جماعت کی ضرورت' کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ اس میں تفصیل سے شرک، رہبانیت اور مغرب کے جدید مادہ پرستانہ نظام ہائے حیات کی ناکامی کے ذکر کے بعد مذکورہ بالا عبارت لکھی کہ اب انسانیت کی نجات صرف اسلام میں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس آپ اسلام

کی دعوت شائع کردیں اور دنیا مفتوح ہو جائے گی۔ ہر موجود تہذیب کی شکست و ریخت کے لیے ایک قوت اور ایک گروہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر نئی تہذیب لانے کے لیے بھی ایک فکر اور ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔" پس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔"

پھر یہ بتانے کے بعد کہ اس گروہ کے افراد کو ایمان و عمل میں انتہائی بلند ہونا چاہیئے۔ لکھا ہے جسے اگر پیشین گوئی نہیں کہا جا سکتا تو یہ پیش بینی اور دُور بینی ضرور ہے کہ ان افراد کو ——— "اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہو گی۔ اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہو گا۔ ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہو گا جو اس نظام سے وابستہ ہوں اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدّوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہو گا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صَرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا اور قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیٔ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔

ایک صحیح نظریہ کی پُشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے، اسی قدر ان انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور ان کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ

کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت، سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک انسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔"

مصائب کی بھٹی میں سے گزرنے والے اعلیٰ سیرت و کردار والے لوگوں کے بارے میں لکھا ــــــ "ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس ایک مبارک دَور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں۔" پھر نازی ازم، کمیونزم اور فلسفۂ گاندھی کے جوشیلے اور جانفروش پیروکاروں کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے ــــــ "اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاکِ وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرّب میں اتنی بھی کشش نہیں ہے؟"

جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے عنوان سے سیّد صاحب نے لکھا ـ ـ ـ

"میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں جو بڑی بڑی جماعتیں اس وقت قائم ہیں وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی تبدیلی کر لے جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت نہ رہے۔ مگر افسوس کہ ہمیں اپنی اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں ہم نے اُن لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے جماعتِ اسلامی قائم کی جس کا دستور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔"

جماعتِ اسلامی کا یہ دستور جو تشکیل جماعت کے وقت ۲۶ر اگست ۴۱ء کو مکمل ہوا تھا، قریب قریب اب بھی وہی ہے۔ اس کے عقیدے اور نصب العین میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ البتہ پاکستان بننے کے بعد حالات کی تبدیلی کی وجہ سے طریق کار اور نظمِ جماعت کی ضروریات کے مطابق ۲۶ر اگست ۵۲ء سے دوسرا دستور نافذ کیا گیا جس کے بعد ۵۷ء میں اور اس سے بھی زیادہ دسمبر ۶۵ء میں اس میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ اولیں دستور کے مطابق ارکان کو اوّل، دوسرے اور تیسرے درجہ کے ارکان میں رکھا گیا۔ لیکن بعد ازیں اس درجہ بندی کو زیادہ باوقار انداز میں بدل دیا گیا۔ اب اسی ترتیب سے رکن، منفق اور ہمدرد (یا متاثر) ہوتے ہیں۔ گویا تشکیلِ جماعت کے وقت سے پہلے ہی سیّد مودودی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جماعت میں شامل ہونے والوں کے لیے ایک معیار ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اس طرح آغاز میں یہ نہیں ہوتا تھا کہ مختلف تنظیمی حلقوں کے ارکان اپنے خفیہ ووٹوں سے اپنے امیرِ حلقہ کو چُنیں اور پھر وہ اپنے لیے ایک قیّم (سیکرٹری) نامزد کرے بلکہ ان دونوں عہدوں کے کام کے لیے امیرِ جماعت حلقے کا قیّم نامزد کرتا تھا۔

یہ دستور اسلامی تحریک کی اہم دستاویز ہے جس کی دفعہ ۳ یوں ہے ــــــــ

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے یعنی یہ کہ اللہ ہی ایک الٰہ ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں[1]"۔ پھر اس کی تشریح میں لکھا ہے ــــــــ "لازم آتا ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی و ناصر نہ سمجھے کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے۔ کسی سے پناہ نہ ڈھونڈے۔ کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زوردار اور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہو۔ کیونکہ

---

[1] دستور جماعت اسلامی۔ ص ۲۱

خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے۔ کسی کی پرستش نہ کرے۔ کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے[۱]۔"

۲۵ اگست ۱۹۴۱ء: لاہور

اسلامی تحریک کی تشریح اور اس کے لیے کام کرنے والی ایک جماعت کی ضرورت ظاہر کی جا چکی تھی۔ اور اس مطلوبہ جماعت کی تشکیل کا نقشہ بھی پیش کر دیا گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد ترجمان القرآن (ماہ صفر ۶۰ھ) میں عامۃ الناس کو دعوت دی گئی کہ جو لوگ اس نظریہ کو قبول کر کے اس طرز پر عمل کرنا چاہتے ہوں وہ دفتر کو مطلع کریں۔ پرچہ چھپنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اطلاعات آنی شروع ہو گئیں اور معلوم ہوا کہ ملک میں ایسے آدمیوں کی ایک خاص تعداد موجود ہے جو جماعت اسلامی کی تشکیل اور اس کے قیام اور بقا کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ یہ طے کر لیا گیا کہ ان تمام حضرات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک جماعتی شکل بنائی جائے اور پھر اسلامی تحریک کو باقاعدہ اٹھانے کی تدابیر سوچی جائیں۔ اس غرض کے لیے ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو اجتماع کی تاریخ مقرر ہوئی اور جن لوگوں نے جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ان سب کو ہدایت کر دی گئی کہ جہاں ابتدائی جماعتیں بن گئی ہیں وہاں سے صرف منتخب نمائندے آئیں اور جہاں لوگ ابھی انفرادی صورت میں ہیں وہاں سے حتی الامکان ہر شخص آجائے۔ ۲۳ اگست سے ہی لوگ آنے شروع ہو گئے اور ۲۵ اگست تک تقریباً ساٹھ آدمی آ چکے تھے۔ باقی کچھ لوگ بعد میں آئے شرکائے اجتماع کی کل تعداد ۷۵ تھی[۲]۔

---

[۱] دستور جماعت اسلامی۔ ص ۲۲ تا ۲۴۔

[۲] روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۷۔

سیّد مودودی صاحب ان دنوں لاہور میں پونچھ روڈ کی شبلی سٹریٹ اسلامیہ پارک میں رہتے تھے۔ ان کا مکان مبارک مسجد سے متصل تھا اور اس کے مالک مستری محمد عبداللہ صاحب تھے۔ اسی مکان میں سیّد صاحب نے ترجمان القرآن کا دفتر بنا رکھا تھا۔ یہیں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ ڈیڑھ سو آدمیوں کو آنے کے لیے دعوت دی گئی تھی۔ اس وقت آنے والوں میں الفرقان بریلی کے مدیر مولانا محمد منظور نعمانی، الاعتصام کے ایڈیٹر مولانا محمد اسحاق، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا جعفر شاہ پھلواری اور حکیم محمد عبداللہ روڑی ضلع حصار (بہت سی طبّی کتب کے نامور مصنف) تھے۔ ایک صاحب مستری محمد صدیق بھی تھے جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ دس بارہ سال گزارے تھے۔ انہوں نے دستور جماعت کے سلسلے میں ایک دلچسپ بحث چھیڑی تھی۔

اس روز اللہ کے صرف ۷۵ بندوں کی مختصر تعداد ایک مشن کے لیے اکٹھی ہوئی تھی۔ ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کا انوکھا تجربہ کرنے کی تڑپ نے انہیں جمع کیا تھا۔ ان کے پیشِ نظر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی تحریک و تنظیم کا کامیاب تجربہ تھا۔ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے تاریخِ اسلام کے کئی ایک (اسلامی حکومت کے مستقل قیام کے نقطۂ نظر سے) احیائے دین کے تجربات بھی تھے۔ جن کی آخری کڑی حضرت سیّد احمد شہید کی بالاکوٹ والی تحریک تھی۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس نئی تحریک کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ناکامی ہوگی تو بھی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنا فرض تو پورا کریں گے اور اگر کامیابی ہوئی تو پھر اسلام سربلند ہوگا، خدا کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچے گا، مسلمانوں کی قوم دوبارہ عظمت و سطوت حاصل کرے گی اور کائنات پر خدا کی نہ صرف تکوینی حکومت ہوگی بلکہ اس کی تشریعی حکومت بھی ہوگی۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا اور ناکام ہو جانا بھی کسی طرح کامیابی سے کم نہیں ہے۔

سیّد مودودی صاحب نے مسلسل نو سال سے اپنی دعوت کو ترجمان کے ذریعے

اسلام پسند افراد تک پہنچایا، ان کے افکار کی تطہیر کی، انہیں اسلامی نصب العین کی طرف پکارا۔ گویا پیغام بھی انہوں نے دیا، داعی بھی وہی تھے اور اس وقت میزبان بھی وہی تھے۔ سرِ شام "دستور جماعت اسلامی" کے رَف مسودے کی طبع شدہ کاپیاں تمام شرکاء میں تقسیم کر دی گئیں۔ ان کاپیوں کے صفحات کے درمیان سفید کاغذ لگے ہوئے تھے تاکہ ان پہ اپنی آراء اور تجاویز لکھی جا سکیں۔ دستور کی یہ رَف کاپی سید صاحب کی ہی تحریر کردہ تھی۔ رات کا وقت شرکاء کو اس پہ غور و فکر اور باہمی مشورے اور گفتگو کے لیے دیا گیا۔

دوسرے روز ۲۶ اگست ۴۱ء کو صبح آٹھ بجے دفتر کے ایوان میں پہلا اجتماع ہوا۔ سید صاحب نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا ——— "ایک وقت تھا کہ مَیں خود روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اس پر عمل پیرا تھا۔ جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے۔ آخر کار کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسولُ اللہ کی طرف متوجہ ہوا اور اسلام کو از سرِ نو سمجھا اور اس پہ ایمان لایا۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے قلب کو اس طرف سے مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا، اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اس مقصد کے لیے ترجمان القرآن جاری کیا۔ ابتدائی چند سال اُلجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کی۔ ادارۂ دار الاسلام کا قیام اس سلسلہ کا پہلا قدم تھا۔ اس وقت صرف چار رفیقِ کار بنے۔ اس چھوٹی سی ابتدا کو اس وقت حقیر سمجھا گیا۔ مگر الحمدللہ کہ ہم بددل نہ ہوئے اور اسلامی تحریک کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کے لیے نظری حیثیت سے ذہن ہموار کرنے کا کام لگاتار کرتے چلے گئے۔"[1]

---

[1] رُوداد جماعت اسلامی حصّہ اوّل۔ ص ۱۰

جماعتِ اسلامی ملت سے الگ فرقہ نہیں ہے

انہوں نے کہا " زمانۂ نبوت کے بعد جب کبھی ایسی کوئی تحریک دنیا میں اٹھی ہے اس کو دو زبردست اندرونی خطرے پیش آئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی جماعت بننے اور ایسی تحریک لے کر اٹھنے کے بعد بہت جلدی لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ ان کی جماعت کی حیثیت وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں اسلامی جماعت کی تھی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ جو اس جماعت میں نہیں ہے وہ مومن نہیں ہے اور مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔ یہ چیز بہت جلدی اس جماعت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ بنا کر رکھ دیتی ہے اور پھر اس کا سارا وقت اصل کام کے بجائے دوسرے مسلمانوں سے الجھنے اور مناظرے کرنے میں کھپ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایسی جماعتیں جس کو اپنا امیر یا امام تسلیم کرتی ہیں اس کے متعلق ان کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس کی وہی حیثیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاءِ راشدین کی تھی۔ یعنی جس کی گردن میں اس امام کی بیعت کا قلادہ نہیں، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار ان کی ساری تگ و دو بس اپنے امیر یا امام کی امارت و امامت منوانے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ ہم کو ان دونوں خطرات سے بچ کر چلنا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے۔ بلکہ ہماری حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظامِ جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے۔ مگر بعد میں اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اٹھیں ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی

کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیر المومنین ہے۔ اس معاملہ میں تمام ان لوگوں کو جو جماعت میں شامل ہوں، غلو سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بہرحال ہم کو مسلمانوں میں ایک فرقہ نہیں بننا ہے۔ خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم اس کے دین کے لیے کچھ کام کرنے کے بجائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کے موجب بن جائیں[1]۔"

اور تقریر کے خاتمے سے پہلے کہا ——— "میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ جب دعوت میں نے دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی میں اپنا ہی حق سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ نہ میں اس کا خواہش مند ہوں، نہ مجھے اپنے متعلق گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے اور نہ اس کام کی بھاری ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ حماقت کر سکتا ہے کہ اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر لادے جانے کی خود تمنا کرے۔ درحقیقت میری غایت تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظام جماعت موجود ہو اور میں اس میں شامل ہوں۔ اسلامی نظامِ جماعت کے ماتحت ایک چپڑاسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظام میں صدارت اور وزارت عظمیٰ کا منصب مجھے حاصل ہو۔

لہٰذا اس مفروضے پر نہ چلیئے کہ جس طرح تشکیلِ جماعت سے پہلے سارے کام میں اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا ہوں، اسی طرح تشکیلِ جماعت کے بعد بھی میں ہی آپ سے آپ امارت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لوں گا یا لینا چاہوں گا۔ جماعت بن جانے کے بعد میری اب تک کی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ آئندہ کے کام کی پوری ذمہ داری جماعت کی طرف منتقل ہوتی جاتی ہے اور جماعت اپنی طرف سے اس ذمہ داری کو جس کے بھی سپرد کرنے کا فیصلہ کرے اس کی اطاعت اور خیر خواہی اور اس کے ساتھ تعاون کرنا ہر

---

[1] رُوداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۱۳ تا ۱۵۔

فردِ جماعت کی طرح میرا بھی فرض ہو گا[1]"

ارکان جماعت اسلامی کا عقیدہ وعمل کیا ہونا چاہیئے؟ اس کی تشریح ہیں دستورِ جماعت میں اسلام کی ایسی واضح تصویر کھینچی گئی ہے جس سے باطل کے وہ تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں جو مختلف صورتوں میں مسلمانوں کی زندگیوں میں کُھل چکے ہیں۔ عقیدہ کی تشریح یُوں کی گئی ہے ——— "انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہشِ نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک و مختار نہ سمجھے بلکہ ہر چیز حتٰی کہ اپنی جان، اپنے اعضا اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی مِلک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمّہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اللہ کی رضا اور اس کے قُرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائے۔

تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے۔ خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی یا قومی و وطنی یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبّت و عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبّت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدِّ مقابل بن جائے۔ رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے کہ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہو۔"

فرشی نشست تھی۔ خود سیّد مودودی صاحب اس دستور کی ایک ایک شق پڑھنے

---

[1] رُوداد جماعت اسلامی حصّہ اوّل۔ ص ۱۷ تا ۱۸

جہاں کسی کو اعتراض ہوتا یا اختلاف ہوتا، رک جاتے - اس فقرے یا شق پر بحث ہوتی۔ ترمیم اور اضافے کے بعد آگے بڑھتے - سید صاحب نے (موجودہ دستور جماعت کی) دفعہ نمبر ۴ پڑھی ــ ــ ــ ”جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود عملاً اقامتِ دین یعنی حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام اور حقیقتہً رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہوگا۔“

گویا جماعت اسلامی کا مقصد اقامتِ دین ہے۔

یہ نہایت اہم بات ہے اس لیے دستورِ جماعت میں ہی اس کی وضاحت پڑھتے ہیں ـــــ ”اقامتِ دین سے مقصود دین کے کسی خاص حصّے کی اقامت نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اقامت ہے۔ خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدّن و سیاست سے، اسلام کا کوئی حصّہ بھی غیر ضروری نہیں ہے۔ پورے کا پورا اسلام ضروری ہے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اس پورے اسلام کو کسی تجزیہ و تقسیم کے بغیر قائم کرنے کی جدّ وجہد کرے۔ اس کے جس حصّے کا تعلق افراد کی اپنی ذات سے ہے ہر مومن کو اسے بطور خود اپنی زندگی میں قائم کرنا چاہیئے اور جس حصّے کا قیام اجتماعی جد و جہد کے بغیر نہیں ہو سکتا اہل ایمان کو مل کر اس کے لیے جماعتی نظم اور سعی کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اگرچہ مومن کا اصل مقصدِ زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مومن کا عملی نصب العین اقامتِ دین اور حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامتِ دین کی سعی کے نتیجے میں حاصل ہوگی۔“

ایک دِلچسپ بحث

پہلے دستور میں ہندوستان پر انگریزی نظامِ حکومت کی وجہ سے کچھ باتیں ایسی تھیں جو جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ دستور سے حذف ہو چکی ہیں۔ لیکن جن کا تذکرہ خالی از

دلچسپی نہ ہوگا ــــــــــــــ " اگر رکنِ جماعت کسی ایسی حکومت کا صدر یا رئیس یا گورنر یا وزیر یا جج ہو جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے۔ اگر وہ کسی مجلسِ قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ جو مجلس قرآن اور سنت رسولؐ کو اساس اور منبع قانون تسلیم نہ کرے اسلام کی رُو سے اس کو انسانی زندگی کے لیے قوانین بنانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اس کی رکنیت قبول کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں۔ اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور ان وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔"

مستری محمد صدیق صاحب نے اسی سابق دستور کی شق پر بحث کا دروازہ کھولا تھا جو یہ تھی ــــــــــــــ " ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں") سیّد صاحب کا موقف یہ تھا کہ انگریز کی قائم کردہ عدالتیں اسلام کی نظر میں طاغوتی عدالتیں ہیں اس لیے جماعت کا کوئی رکن ان عدالتوں میں کبھی مقدمہ لے کر نہ جائے گا۔ مستری صاحب ڈٹ گئے۔ کہنے لگے کہ ارکانِ جماعت کو نہ صرف مدعی کی حیثیت میں انگریز کی عدالت میں نہیں جانا چاہیے بلکہ مدعا علیہ کی حیثیت میں بھی نہیں جانا چاہیے (خواہ عدالت سمن جاری کر دے یا وارنٹ گرفتاری بھیج دے) سیّد مودودی صرف مفکر یا انقلابی نہیں تھے۔ وہ عملی انسان تھے۔ وہ ایسے کمانڈر تھے جو اپنی فوج اور اسلحہ اکٹھا کرنے سے پہلے لڑائی چھیڑ دینے کے نتیجے کو جانتے تھے۔ اس لیے وہ مستری صاحب سے اتفاق نہ کر سکے۔

مستری صاحب نے کہا کہ جب ہم انہیں طاغوتی عدالتیں مانتے ہیں تو پھر مدعا علیہ کی حیثیت میں بھی کیوں ان کے سامنے جائیں۔ سیّد صاحب نے عملی مشکلات گنوائیں اور بتایا کہ: ــــــــــــــ

اونچے مقصد کے لیے بنی ہے وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ لیکن انقلابی مستری صاحب نہ مانے (وہ جلد ہی جماعت کو چھوڑ گئے کیونکہ جماعت ان کے معیار پر پوری نہیں تھی) وہ قرآن اور حدیث سے استدلال مانگتے تھے۔ کہنے لگے یہ مت سمجھیے کہ اس کی زد مجھ پر نہیں پڑے گی بلکہ سب سے زیادہ اس کی زد مجھ پر پڑے گی۔ کیونکہ عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر کے جب میں گرفتار ہوں گا تو میری نیم فاتر العقل بیوی کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہوگا جو میرے بغیر نہیں رہ سکتی جسے میں ہر دم ساتھ لیے رہتا ہوں ——— اور مستری صاحب موصوف کی یہ بات بالکل صحیح بھی تھی۔ حاضرین کو ان کی طلبِ صداقت کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

اس بات سے سبھی متاثر ہوئے اور سید مودودی صاحب سے عملی مشکلات کی دلیل کے بجائے قرآن و حدیث کا استدلال مانگنے لگے۔ سید صاحب نے غور کے لیے ایک رات کا وقفہ مانگا۔ دوسری صبح سارے جمع ہوئے تو سید صاحب نے سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۷۲ پڑھی۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ۔ کہ مومن وہ لوگ ہیں جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے ہیں۔ پھر سید صاحب نے کہا یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی اس میں جو کہا گیا ہے کہ ان میں جھوٹی گواہی نہ دو کیا وہ مکی کافروں کی طاغوتی عدالتیں نہیں تھیں؟ ان میں سچی گواہی نہ چھپانے کا حکم دے کر گویا مدعا علیہ اور گواہ کی حیثیت میں جانے کی اجازت دی ہے۔ مستری صاحب سمیت سبھی سید صاحب کے اس مسکت جواب سے نہ صرف خوش ہو گئے بلکہ ان کے فہمِ قرآن سے بھی بے حد متاثر ہوئے[1]۔

طریقِ کار

جماعت اسلامی کے طریقِ کار کے بارے میں موجودہ دستور میں لکھا ہے ———

"وہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھے گی کہ خدا اور رسول کی ہدایت

---

[1] روایت مولانا حکیم محمد عبد اللہ صاحب سلمانی جہانیاں۔

کیا ہے۔ دوسری ساری باتوں کو ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھے گی جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہوگی۔ اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔ جماعت اپنے پیشِ نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیش نظر ہیں۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی بلکہ کھُلم کھُلا اور علانیہ کرے گی[۱]۔"

وہ باتیں جو جماعت کے پہلے دستور میں درج نہیں تھیں لیکن تجربے کی بنا پر اعادے کے وقت انہیں دستور میں شامل کیا گیا ہے یہ ہیں کہ جماعت کی ایک مجلسِ شوریٰ ہے جسے ارکان خفیہ رائے دہی سے منتخب کرتے ہیں۔ شوریٰ کا انتخاب تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ امیرِ جماعت اس کے مشورے سے کام کرتا ہے۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کی موجودہ شوریٰ کے پچاس ارکان ہیں۔ عام طور پر جماعت کے اہم امور کا فیصلہ یہی مجلس کرتی ہے۔ چونکہ ہنگامی حالات میں اتنے لوگوں کو اکٹھا کرنا مشکل اور بار بار پوری شوریٰ کو جمع کرنا مہنگا پڑتا ہے اس لیے امیرِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ ارکانِ شوریٰ میں سے صرف بارہ ارکان کی مجلسِ عاملہ کو نامزد کر دے۔ عام طور پر یہ جماعت کے تنظیمی حلقوں کے امراء پر مشتمل ہوتی ہے۔

اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ جماعتِ اسلامی کی قیادت کتنے تعلیم یافتہ اور دانشور لوگوں کے ہاتھ میں ہے تو جماعتِ اسلامی پاکستان کی مجلسِ شوریٰ جو نومبر ۶۸ء میں تین سال کے لیے منتخب ہوئی ہے، کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جماعتِ اسلامی کی تنظیم جدید و قدیم علوم کا سنگم ہے۔ خصوصاً اس کی شوریٰ کے ارکان

---

[۱] دستورِ جماعتِ اسلامی۔

تو اپنی طویل جدوجہد، وقف شدہ زندگیوں اور سیّد مودودی کی مسلسل تربیت سے اپنی ذات میں چھوٹے چھوٹے مودودی ہیں۔ جس سے یہ امید بندھتی ہے کہ سیّد مودودی نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ ان کے بعد قیادت کے بحران کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا اور تنظیم کو قحط الرجال کا سامنا نہیں ہوگا۔ اس منتخب شوریٰ میں پندرہ حضرات جیّد علماء ہیں جنہوں نے دیوبند وغیرہ سے درسِ نظامی کی فضیلت حاصل کی ہوئی ہے اور ۱۹ حضرات ایسے ہیں جن کی کم از کم تعلیم بی اے یا بی ایس سی ہے ان میں سے اکثر ایم اے ہیں۔

امیرِ جماعت کا انتخاب پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔ اسے بار بار بھی منتخب کیا جاسکتا ہے۔ وہ شوریٰ کے مشورے سے قیّم جماعت کا تقرر کرتا ہے جو جماعت کے تمام شعبوں کا نگران اور امیرِ جماعت کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ شوریٰ کی اکثریت امیرِ جماعت کے خلاف عدمِ اعتماد کا اظہار کر دے تو جماعت کے ارکان سے استصواب کیا جائے گا۔ اگر ارکان نے امیرِ جماعت کو بحال رکھا تو شوریٰ معزول ہو جائے گی ورنہ برعکس صورت ہوگی۔ قیّم عام طور پر ہمہ وقتی کارکن ہوتا ہے اور وہ رکنِ جماعت ہوتا ہے۔ عہدے کی بنا پر مجلسِ شوریٰ کا رکن ہوتا ہے۔ ارکانِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ، عُشر، اور صدقات لازماً جماعتِ اسلامی کے بیت المال میں جمع کریں۔ عام طور پر جماعت کی مقامی آمدنی کو مقامی، ضلعی، حلقہ کی اور مرکزی جماعت کے لیے برابر برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شہر، ضلع اور حلقہ میں مرکزی نظام کی طرح امیرِ جماعت، قیّم اور مجلسِ شوریٰ ہوتی ہے۔

رسمِ تجدیدِ ایمان

۲۶ اگست ۴۱ء کو دستورِ جماعت پاس ہونے کے بعد تجدید ایمان کی رسم ادا ہوئی یہ ایک مؤثر اور رقت انگیز تقریب تھی۔ سیّد صاحب نے اس رسم کی وضاحت کرتے ہوئے بعد ازیں کہا "تجدیدِ ایمان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو شخص آج تجدید کر رہا ہے وہ اب تک کافر تھا اور اب اسلام لا رہا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو عہد اس کے اور خدا کے درمیان

پہلے سے موجود تھا آج وہ اسے تازہ اور خالص اور مضبوط کر رہا ہے۔ تجدیدِ ایمان کے موقع پر یہ بات ہر نئے داخل ہونے والے رکن کے ذہن نشین کر دینی چاہیئے کہ یہ دراصل زندگی کے ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ آج سے تمہاری ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ آج سے تم ایک پابندِ نظام مومن کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کر رہے ہو۔ آج سے تمہاری زندگی ایک بامقصد زندگی بن رہی ہے اور تم خدا اور مومنوں کو گواہ بنا رہے ہو کہ تمہاری سعی و جہد اس مقصد کے لیے اس نظام کی پابندی میں صرف ہو گی۔"

رسم تجدیدِ ایمان کے لیے سب سے پہلے سیّد مودودی اُٹھے اور کلمۂ شہادت کا اعادہ کیا اور کہا کہ لوگو گواہ رہو کہ مَیں آج از سرِ نو ایمان لاتا ہوں اور جماعتِ اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور تجدیدِ ایمان کا اعلان کیا۔ بعد ازاں حاضرین میں سے باری باری کر کے ہر شخص اُٹھا اور اس نے کلمۂ شہادت ادا کیا[1]۔ اس اجتماع میں میاں طفیل محمد صاحب بھی تھے انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے "مَیں جماعت اسلامی میں کس طرح آیا"۔ اس میں بتایا ہے کہ وہ جماعت کے لٹریچر سے مستری محمد صدیق صاحب اور اوکاڑہ کے چوہدری عبد الرحمان صاحب کی معرفت متعارف ہوئے تھے۔ جب تشکیلِ جماعت والا اجتماع لاہور میں منعقد ہوا تو وہ بھی شریک ہوئے۔ سیّد مودودی نے جماعت اسلامی میں شرکت کے لیے اپنا نام پیش کیا پھر......

"چھ سات آدمیوں کے بعد مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان دنوں داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ کوٹ پتلون پہنے ہوتے تھے۔ سر پر ہیٹ تھا۔ مَیں نے کہا کہ مَیں بھی اپنے آپ کو جماعت میں شریک ہونے کے لیے پیش کرتا ہوں۔ مولانا منظور نعمانی صاحب نے کہا کہ اس کرنٹے کو ہم کیسے لے سکتے ہیں؟ اس کی شکل و صورت، اس کا حلیہ کوئی چیز بھی تو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کو جماعت میں لیا جائے۔ میرے اوپر اس کا سخت ردِّعمل ہوا اور فی الواقع مَیں رونے لگا۔ مَیں نے کہا جب مَیں اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے

---

[1] چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر۔ ص ۱۱۹

پیش کر رہا ہوں تو آخر آپ کیوں مجھے جماعت میں شامل ہونے کا موقع نہیں دیتے؟ داڑھی کوئی ایک دن میں تو اُگ نہیں سکتی اور کپڑے اُتار کر یہاں ننگا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے موقع دیجئے۔ مولانا مودودی نے جن سے اب تک میری کوئی شناسائی نہیں تھی کہا کہ اسے موقع دینا چاہیئے۔ ایک مدّت مقرر کر لیں اگر اس مدّت میں خلافِ شریعت چیزوں کو ترک کر دے تو ٹھیک ورنہ خارج کر دیا جائے چنانچہ چھ ماہ کی مدّت مقرر کی گئی اور مجھے جماعت میں داخل کر لیا گیا۔[۱]"

نتیجہ؟ یہ کرنٹا اس وقت سیّد مودودی کا (بظاہر) جانشین ہے!

اور مولانا منظور نعمانی صاحب؟ خیر ان کا ذکر جلد ہی آئے گا!

بعد ازاں حاضرین میں سے ایک ایک کر کے ہر شخص اٹھا کلمۂ شہادت ادا کیا اور جماعت میں شریک ہؤا۔ اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بلکہ بعض لوگوں پر تو رونے روتے رقت طاری ہو گئی تھی۔ قریب قریب ہر شخص کلمۂ شہادت ادا کرتے وقت ذمّہ داری کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ سید مودودی نے اسلامی جماعت کی حیثیت، اس کے منشا اور نصب العین پر پھر روشنی ڈالی اور حاضرین کو آگاہ کیا کہ انہوں نے آج کتنا بڑا عہد کیا ہے اور اسے کس طرح نباہنا چاہیئے۔ آیئے ہم سب مل کر رب العالمین سے دعا کریں کہ وہ ہماری جماعت کو استقامت اور استقلال بخشے اور ہم کو اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کی سنّت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔[۲]"

رب العالمین نے اپنے مخلص اور بے لوث بندوں کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا!

---

[۱] چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر۔ ص ۱۱۹

[۲] رُوداد جماعت اسلامی حصّہ اول۔ ص ۲۰

باب ۱۲

جماعتِ اسلامی (۲)

زمانہ اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

دستور دو روز میں مکمل ہوگیا۔ جماعت کا نام جماعت اسلامی رکھا گیا۔ اب جماعت کے امیر کا انتخاب ہونا تھا۔ جب کچھ لوگوں نے یہ کہا مولانا اب آپ ہی اس کے امیر بھی ہوں تو سیّد مودودی صاحب نے اُٹھ کر کہا کہ میں اسے جماعت کی بدقسمتی سمجھوں گا کہ اگر آپ کو مجھ سے بہتر آدمی نہ ملا۔ اس موقع پر اختلافِ رائے ہوگیا آخر فیصلہ یہ ہوا کہ پانچ چھ آدمیوں کی کمیٹی بنادی جائے اور وہ امیر جماعت کے لیے کسی ایک نام کو تجویز کرے۔ اس کمیٹی میں سیّد صاحب خود نہیں تھے۔ مولانا محمد منظور نعمانی، مستری محمد صدیق، سید صبغۃ اللہ، نذیر الحق میرٹھی اور جعفر شاہ پھلواری کے علاوہ لکھنؤ کے محمد ابنِ علی علوی کاکوروی بھی اس کمیٹی میں تھے جو کمیٹی کی تشکیل سے پہلے اس بات کے خلاف تھے کہ سیّد مودودی کو امیرِ جماعت بنایا جائے۔ اس طرح گویا مخالف نقطۂ نظر کی ترجمانی بھی ہوگئی تھی۔ دوسری صبح کمیٹی نے غور و فکر کے بعد اپنا خیال پیش کیا اور سبھی نے اتفاق رائے سے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو امیرِ

جماعتِ اسلامی منتخب کیا۔[1]

یہ لمحہ ہماری قومی و ملّی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دینی لحاظ سے اس لیے کہ ایک ایسی اصولی جماعت کی بنیاد رکھی گئی جس نے دین و سیاست کا حسین امتزاج کرکے دکھایا، جو ایک طرف سیاست میں جدید ترین اصولوں اور ہتھیاروں سے مسلح ہے تو دوسری طرف اسلام کے ابدی اخلاقی اصولوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے اور قومی لحاظ سے اس لیے کہ دین کی تجدید کے لیے ایک ایسی سرفروش یکسو اور باعمل جماعت وجود میں آئی جس نے اپنے اتحاد، افکار اور عمدہ تنظیم سے ایک نئی طرح ڈال دی ہے۔ جس نے مذہبی رواداری، مربوط نظامِ حیات اور خیالات میں قدیم و جدید کی متوازن آمیزش کی نئی راہ دکھائی ہے اور ایک ایسی تحریک نے جنم لیا ہے جس نے ایک ایک کرکے ایثار پیشہ اور اعلیٰ اسپرٹ و کردار کے مالک صالح افراد کو تنظیم کی لڑی میں پرو کر ایک عظیم طاقت بنا دیا ہے۔

اور یہی لمحہ سیّد مودودی صاحب کی زندگی کا بھی ایک سنگِ میل ہے کہ جب انہوں نے الجہاد فی الاسلام لکھی تو وہ گویا ایک غنچہ تھے۔ ترجمان القرآن شروع کیا تو پھول بنے جس کی خوشبو اور مہک دُور دُور تک پھیلنے لگی اور اب انہوں نے اپنے آپ کو جماعت اسلامی میں منتقل کر لیا اور ان کا سوزِ دروں گرمیٔ محفل بن گیا تو وہ گلستان ہو گئے جس میں سینکڑوں اور ہزاروں غنچے چٹکتے اور پھول کھلتے رہتے ہیں اور جوں جوں جماعت کی دعوت و تنظیم بڑھتی جائے گی اللہ کی یہ زمین رحمتِ اسلام سے گلستانِ ارضی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔

سیّد صاحب نے اپنے خیالات، افکار، جذبہ، تڑپ اور مشن کو تحریک کی شکل دے کر اسے مہمیز لگائی۔ ان کا پیغام چند افراد کے دلوں کی آماجگاہ سے نکل کر زبانوں پہ آیا اور ایک دعوت کی شکل میں سینکڑوں، سینکڑوں سے ہزاروں اور ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچنے لگا اور پھر لاکھوں افراد سے پھیل کر دنیائے اسلام میں پھیلنے لگا۔ سیّد صاحب

---

[1] روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ص ۲۷ تا ۳۱۔

ایک دینی، سیاسی اور قومی شخصیت بنے اور اب وہ عالمِ اسلام کی معروف ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ اس لمحے انہیں ایسا منصب ملا کہ قدم قدم پہ مشکلات، رکاوٹیں اور مخالفتیں ان کا مقسوم ہو گئیں۔ ان کے لیے خوف و ہراس، الزام تراشیاں، طعنے، کفر و فسق کے فتوے، قید اور پھانسی کا تختہ تیار ہونے لگے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میرِ کارواں کے لیے کہ جس کے پاس نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پُرسوز تھی عظمت، سربلندی، ناموری اور کامرانی بھی مقدر ہو چکے تھے۔

اس بات کا اظہار اکرم ملک صاحب ایم اے نے بھی اپنے دو مضامین میں کیا ہے۔ انہوں نے علم دست شناسی کی رُو سے قائد اعظم اور دوسرے لیڈروں کے ہاتھ دیکھے ہیں۔ سیّد صاحب کا ہاتھ دیکھ کر ۵۳ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کے ہاتھ پر پھانسی پانے کی کوئی علامت نہیں ہے۔ ہفت روزہ چٹان میں ان کے یہ مفصّل مضامین شائع ہوئے۔ انہوں نے سیّد صاحب کی سیرت کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ دست شناسی کی "دریافت" سے زیادہ اب ہمارے لیے امرِ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس کا اعتراف سیّد صاحب کے دشمن بھی کرتے ہیں۔

مثلاً ملک صاحب نے لکھا ہے کہ سیّد مودودی کے ہاتھ میں دماغی لکیر سہ شاخہ ہے "یہ ایک عظیم الشان نشان ہے ان لوگوں کے ذہن میں بے پناہ وسعت، ہمہ گیر بوقلمونی اور موزونیت پائی جاتی ہے اور بیک وقت مختلف اور بہت سی صفات اور صلاحیتوں کا نفیس اور متناسب امتزاج ہوتا ہے۔ یہ امتزاج عموماً کامیاب کیریئر کی تخلیق کرتا ہے اور اس سہ شاخہ لکیر والے اپنی زندگی میں بہت سے عزائم کی تکمیل کر لیتے ہیں[1]۔"

پھر لکھا ہے "ایسے لوگ متعدد شعبہ ہائے حیات میں نظریاتی انقلاب بپا کرتے ہیں، انسانوں کے ایک گروہ کثیر پر اپنے فکری اور ذہنی نقوش اور تاثرات چھوڑ جاتے ہیں، تمام عمر جنگی اور ہنگامی سی صورتِ حالات کا سامنا رہتا ہے، انتہا پسند عناصر و تحریکات

---

[1] ایم اے ملک: ہاتھ کی زبان۔ ص ۳۷۵۔

سے جنگ آزما رہتے ہیں، اقتدار سے خطرہ رہتا ہے، تمام عمر ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں اور اصول و ضابطہ کے پابند رہتے ہیں[1]۔"

اکرم ملک صاحب کی اس بات کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکتا ہے: "ایک اور امتیازی نشان جو شاید کسی اور کے ہاتھ پر تو نہیں مگر مودودی صاحب کے ہاتھ پر دیکھ کر ایک پامسٹ کو یقیناً حیرت ہوتی ہے۔ مریخ کے بالائی اُبھار کا بلند اور نمایاں ہونا ہے۔ یہ جرأت اور شجاعت، تہوّر اور مردانگی، جارحیت اور مدافعت کا اُبھار ہے اور عموماً بڑے بڑے جنگی جرنیلوں، سپہ سالاروں، کمانڈروں اور فنونِ حربیہ کے ماہروں کے ہاتھ پر پایا جاتا ہے ــــــــــ جن کی فتوحات سے تاریخ کے اوراق مزیّن ہیں[2]۔"

اکرم صاحب کے مضمون کا آخری اقتباس ــــــــــ "مریخ مثبت کی جانب سے عمر اور قسمت کی لکیروں کو قطع کرتی ہوئی تین بڑی لکیریں تیسری مخالف لکیر قسمت کی لکیر کو اس وقت منقطع کرتی ہے جب وہ دل کی لکیر سے آکر ملتی ہے۔ یہ کسی تیسری بڑی رکاوٹ کی آئینہ دار ہے جس کا اندازہ تقریباً ۵۸، ۶۰ برس کی عمر کے لگ بھگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے قسمت کا اصلی خط یک لخت ختم ہو جاتا ہے۔ قطعی طور پر بتانا ذرا مشکل ہے کہ یہ کیفیت آخر کس واقعہ کی مظہر ہے۔ میرے نزدیک ایسی علامت یقیناً خطرناک تصوّر کی جاتی اگر کچھ فاصلے پر ایک اور قسمت کی لکیر زحل کے اُبھار پر دکھائی نہ دیتی۔ صحیح مفہوم تو ان علامات کا صرف خدائے علیم و برتر ہی جانتا ہے۔ مگر میری ریڈنگ یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب ۵۸، ۶۰ سال کی عمر کے دَور سے بخیریت گزر گئے تو

دنیا کی کوئی عظمت ایسی نہیں جس کو وہ پا نہ سکیں[3]۔"

---

[1] ایم اے ملک: ہاتھ کی زبان - ص ۳۷۵

[2] ایضاً - ص ۳۷۹

[3] ایضاً - ص ۳۹۴

امیرِ جماعت کی حیثیت سے پہلا خطاب

امیرِ جماعت کے بارے میں دستورِ جماعت میں لکھا ہے ——— "اس کی حیثیت امیر المومنین (باصطلاحِ معروف) کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس کے رہنما کی ہوگی۔ جماعت کے ارکان اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علمِ دین میں بصیرت، اصابتِ رائے، عزم و جزم اور مفادِ جماعت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی دعوت اپنے عقیدہ اور نصب العین کی طرف ہوگی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف[1]۔"

امیرِ جماعت کے انتخاب کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ سبھی کے ہاتھ اُٹھ گئے۔ ہتھیلیوں کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ نعمانی صاحب نے خدا سے دعا کی کہ اے اللہ العالمین! چند حقیر بندوں نے تیرے پیغام کو ساری دنیا میں پہنچانے کا عزم کیا ہے، معاشرے کو تبدیل کرنے کا تہیّہ کیا ہے، اسلام کو باطل کی آلائشوں سے پاک کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہم حقیر ناچیز اور کمزور بندے ہیں۔ ہم تیری رضاجوئی کے لیے اتنے بلند نصب العین کو لے کر اُٹھے ہیں تو ہمیں توفیق دے کہ ہم ساری زندگی اسی نصب العین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں اور اسلام کو اس کی صحیح صورت میں دوبارہ لاسکیں۔ نعمانی صاحب نے اتنے خلوص، حضورِ قلب اور عاجزی سے یہ طویل دعا کی کہ شرکاء پہ ایک جذباتی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھیں نم آلودہ ہوگئیں اور ان کے دلوں میں تحریکِ اسلامی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

حکیم مولانا محمد عبد اللہ صاحب جہانیاں فرماتے ہیں ——— "اس دعا اور شرکاء کے تاثر کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی ایک اور بات مجھے ساری عمر یاد رہے گی کہ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو سید القوم خادمھم کے مصداق یا نشاید

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصّہ اول۔

ان کے دل پہ تحریکِ اسلامی کے آغاز کی خوشی میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے شرکاء کی پس خوردہ ہڈیوں کو اُٹھا اُٹھا کر جمع کیا اور ہٹایا۔"

سب لوگوں نے کلّی اتفاق سے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اپنا امیر منتخب کیا تو بیعت کا رسمی طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری جماعت نے ایک ساتھ عہد کیا کہ مذکورہ بالا تصریحات کے تحت وہ امیر کی اطاعت اور اس کے حکم کی پابندی کریں گے۔ اس بیعتِ عام کی ادائیگی پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی جو ایک روز قبل تجدیدِ ایمان کے موقع پر طاری ہو چکی تھی۔ لوگ پھر خدا کے حضور میں روئے اور گڑگڑاتے اور التجا کی کہ وہ اس جماعت کو اس کے نصب العین کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔[1]

سیّد مودودی صاحب نے امیرِ جماعت اسلامی کی حیثیت سے پہلی دفعہ خطاب کرتے ہوئے کہا ——— "میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی۔ نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت تھی۔ بہرحال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دُعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں اپنی حد تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خدا ترسی اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ چلاؤں۔ میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم کی پیروی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر بدگمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کر رہا ہوں بلکہ حسنِ ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

جب تک میں راہِ راست پر چلوں آپ میرا ساتھ دیں، میرے حکم کی اطاعت

---

[1] رودادِ جماعت اسلامی حصّہ اول۔ ص ۳۱

کریں، نیک مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں۔ مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے جس کی قیادت اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے اور زمانۂ نبوت گزر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کو لے کر اُٹھتے رہے ہیں جو نسلِ انسانی کے گُلِ سرسبد تھے۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں۔ بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کارِ عظیم کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائضِ امارت کی انجام دہی کے ساتھ میں برابر اس تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کام کا بار اُٹھانے کے لیے مل جائے اور جب میں اس کام میں کامیاب ہو گیا تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ نیز میں ہر اجتماعِ عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پا لیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کر لے اور میں اس منصب سے بخوشی دست بردار ہو جاؤں گا۔ بہرحال میں انشاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستہ میں سدِّ راہ نہ بننے دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس لیے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ کامل آئے اور یہ مقام جو آپ نے میرے سپرد کیا ہے ہر وقت اس کے لیے خالی ہو سکتا ہے۔ البتہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو چلانے کے لیے نہ اُٹھے تو میں بھی نہ اُٹھوں۔

میرے لیے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اِس کے لیے ہے۔ کوئی اس راہ پر چلنے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو بہرحال مجھے تو اس راہ پر چلنا ہے اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تنِ تنہا اس سے لڑنے

میں باک نہیں ہوگا۔[1]"

آئندہ لائحۂ عمل

جماعت اسلامی کا یہ تاریخی اجتماع ختم ہوا تو امیرِ جماعت نے اصحابِ شوریٰ کا انتخاب کیا۔ دوسرے روز اس کا پہلا اجلاس ہوا اور آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تجویز کیا گیا۔ ——— "ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا ایسے مسلمان ہوں جو اپنے دینی فرائض اور دینی نصب العین سے غافل ہیں) ان کو بالعموم حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیتِ رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ بعد میں جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظام اطاعتِ غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرے دین (نظام اطاعتِ الٰہی) کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔" اور آگے واضح طور پر راستے کی نشان دہی کی ہے ——— "اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے۔ لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں[2]۔"

اور اتنا بڑا ایثار ہر کوئی نہیں کر سکتا اس لیے جماعت اسلامی کا رکن بننا آسان نہیں ہے۔ جو لوگ جماعت کے لٹریچر کا کچھ حصہ پڑھ کر اور اس سے متاثر ہو کر قریب آتے ہیں انہیں ہمدرد یا متاثرین کے زمرہ میں رکھا جاتا ہے۔ جو لوگ اس سے زیادہ سرگرمی دکھاتے ہیں، پابند صوم و صلوٰۃ ہو جاتے ہیں، زندگی کو اسلامی اصولوں کا پابند بناتے ہیں، جماعت کے ہفتہ وار اجتماعات میں باقاعدگی سے آتے ہیں، جماعت کے لیے پورے خلوص سے وقت

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۳۱ تا ۴۲

[2] ترجمان القرآن ستمبر ۴۱ء

کی اور مالی امداد دیتے ہیں۔ لیکن کسی مجبوری مثلاً ملازمت وغیرہ کی بنا پر یا کسی عذرِ شرعی کی بنا پر رکن نہیں بن سکتے۔ وہ جماعت اسلامی کی تنظیم میں متفق اور کارکن سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو جماعت کے خیالات اور لٹریچر کو پھیلاتے ہیں، تندہی سے تنظیم کے لیے کام کرتے ہیں وہ بھی متفقین اور کارکن ہیں جن کی تعداد پاکستان میں پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔

ارکانِ جماعت تو وہ قابلِ رشک لوگ ہیں جنہوں نے اپنی آسائشوں کو، اپنے نصب العین کے لیے تج دیا ہے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا جماعت اسلامی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ جماعت کے 'فدائی' ہیں۔ ایک متفق کارکن جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دیتا ہے، پھر وہ جماعت کی چیدہ چیدہ کتابیں پڑھ کر اپنے طرزِ فکر کو جماعت کے طرزِ فکر میں ڈھال لیتا ہے، تربیت گاہوں میں شرکت کرتا ہے جو دس پندرہ دن کے لیے کبھی کبھی منعقد ہوتی رہتی ہیں، ان میں فرض نمازوں کے علاوہ تہجد، نوافل، درسِ قرآن و حدیث میں شریک ہو کر اسلامی زندگی کا خوگر ہوتا ہے، ان تربیت گاہوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے حالاتِ حاضرہ، سیاسیات اور معاشیات کے علاوہ دستور اور قانون جیسے مسائل بھی بتائے جاتے ہیں، جماعت اسلامی کے لٹریچر میں سے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے ذہن و فکر کو جماعت سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ مقامی یعنی شہر کی جماعت کا امیر اس درخواست دہندہ کارکن کی، جماعت کے کام سے دلچسپی اور اسلامی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے اور مطمئن ہونے کے بعد اسے رکن بنا لیے جانے کی سفارش کرتا ہے۔ اسی طرح وقفوں کے بعد امیرِ ضلع پھر امیرِ حلقہ اور آخر میں امیرِ صوبہ منظوری دے کر اسے رکن بناتے ہیں۔ اس طرح بہت کم لوگ ان کڑے معیار پہ پورے اُتر کر اور اس چھلنی میں سے گزر کر رکن بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کے ارکان کی تعداد کم ہے۔ دوسرے جو لوگ بھی نظم جماعت میں آجاتے ہیں انہیں پھر شاذ ہی خارج کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی رائے، سیرت اور زندگی پہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بارے میں یقین ہوتا ہے کہ یہ راہِ حق کے مصائب،

تکالیف، بے روزگاری، طعن و تشنیع، نقصانِ مال و اولاد، قید زنداں حتیٰ کہ پھانسی تک سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔

جماعت اسلامی کا مزاج

جماعت اسلامی اپنے کارکنوں اور ارکان کا ایک خاص مزاج بنا دیتی ہے۔ آپ انہیں گفتگو کرتے سُنیں، ان کی نشست و برخاست اور رہن سہن دیکھیں تو اس پر جماعت اسلامی کی چھاپ صاف دکھائی دے گی۔ آپ کسی مقرر کو مدلل، غیر جذباتی اور ایک لیکچرر کی طرح مربوط و مسلسل تقریر کرتے سُنیں جو اپنے موضوع سے اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔ اس مقرر کا چہرہ متشرع ہو اور لباس میں صفائی اور شائستگی ہو تو آپ کے دل میں بغیر تعارف کے خیال آئے گا کہ یہ انداز اور مزاج جماعت اسلامی کا ہے۔ آپ کسی متدین اور صاف ستھرے انسان کو دیکھیں تو آپ کا یہ اندازہ نوّے فی صدی درست ہو گا کہ یہ انسان جماعت اسلامی کے زیر اثر ہے۔ لیونارڈ بائنڈر جیسے غیر ملکی نے اس کا اعتراف کیا ہے "جب آدمی جماعت اسلامی کے عہدہ داروں سے ملتا ہے تو اُسے ان لوگوں کی اپنے مقصد سے لگن، اپنے اوپر اور اپنے کام پر اعتماد، اور ان کے لباس، نشست و برخاست اور رکھ رکھاؤ میں صفائی، ترتیب اور عمدگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کے دفاتر اور تنظیم اعلیٰ پیمانے کی ہیں۔ حسابات باقاعدہ رکھے ہوئے ہیں۔ جماعت کی کتابوں کی تعداد کافی زیادہ ہے اور ان میں سے بیشتر اچھی کتابت و طباعت کی حامل ہیں[1]"۔

سیّد مودودی صاحب نے پہلے ہی اجتماع میں کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے جماعتی لٹریچر کے مطالعہ، سیرت النبیؐ اور قرآن پاک کے مطالعہ کی تاکید کی، سیرت و اخلاق کی پاکیزگی کی فکر کرنے کی نصیحت کی، دور از کار اور غیر متعلق سرگرمیوں سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا، بحث و مناظرہ سے اجتناب کرنے کے لیے کہا۔ "میری ذات پر حملے کیے جائیں تو ہرگز

ل[1] "Religion and Politics in Pakistan."

مدافعت نہ کیجئے میں نہ خود اپنی مدافعت کرتا ہوں نہ اپنے رفیقوں کو چاہتا ہوں کہ وہ اس فضول کام میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کریں...... جب بحث میں گرمی آتی محسوس ہو تو سلسلۂ بحث بند کر دیجئے کیونکہ مناظرہ وہ بلا ہے جس سے ہزار فتنے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی ایک فتنہ بھی فرو نہیں ہوتا۔[1]"

پھر خاص طور پر کہا "تحریکِ اسلامی اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے اور اس کا ایک مخصوص طریقِ کار ہے جس کے ساتھ دوسری تحریکوں کے طریقے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے۔ جو لوگ اب تک مختلف قومی تحریکوں میں حصّہ لیتے رہے ہیں اور جن کی طبیعتیں انہیں کے طریقوں سے مانوس رہی ہیں، انہیں اس جماعت میں آکر اپنے آپ کو بہت کچھ بدلنا ہوگا۔ جلسے اور جلوس، جھنڈے اور نعرے، یونیفارم اور مظاہرے، ریزولیشن اور ایڈریس، بے لگام تقریریں اور گرما گرم تحریریں اور اس نوعیت کی تمام چیزیں اُن تحریکوں کی جان ہیں۔ مگر اس تحریک کے لیے سمِّ قاتل ہیں۔ یہاں کا طریقِ کار قرآن اور سیرت محمدی اور صحابہ کی سیرتوں سے سیکھئے اور اس کی عادت ڈالیئے۔

آپ کو زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے پاس آجائیں اور آپ انہیں ہانکتے پھریں۔ آپ کو ان میں حقیقتِ اسلامی کی معرفت پیدا کرنی ہے اور عرفانِ حقیقت کے بعد ان میں یہ عزم پیدا کرنا ہے کہ اپنی انفرادی زندگی اور گرد و پیش کی اجتماعی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق بنائیں اور جو کچھ باطل ہو اس کو مٹانے میں جان و مال کی بازی لگا دیں۔ لوگوں کے اندر یہ گہری تبدیلی ساحری اور شاعری سے پیدا نہیں ہوا کرتی۔ آپ میں سے جو مقرر ہوں وہ پچھلے اندازِ تقریر کو بدلیں اور ذمہ دار مومن کی طرح جچی تُلی تقریر کی عادت ڈالیں اور جو محرر ہیں انہیں بھی غیر ذمہ دارانہ اندازِ تحریر بدل کر اس آدمی کی سی تحریر اختیار کرنی چاہیئے جو لکھتے وقت احساس رکھتا ہے کہ اسے اپنے ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہے۔[2]"

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصّہ اول۔ ص ۴۵

[2] ایضاً۔ ص ۴۹-۵۰۔

آخر میں اسی تقریر کا ایک اور اقتباس دیا جاتا ہے جس سے تحریک کے مزاج کا پتہ چل سکتا ہے "اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے۔ اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا فرض عبادات کے ماسوا نفل عبادات کا بھی التزام کریں۔ نفل نماز، نفل روزے اور صدقات وہ چیزیں ہیں جو انسان میں خلوص پیدا کرتی ہیں اور ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ کرنا چاہیئے تاکہ ریا نہ پیدا ہو۔ نماز سمجھ کر پڑھیئے اس طرح نہیں کہ ایک یاد کی ہوئی چیز کو آپ زبان سے دُہرا رہے ہیں۔ بلکہ اس طرح کہ آپ خود اللہ سے کچھ عرض کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ان تمام مجاہدوں، ریاضتوں اور مشاغل و اوراد سے پرہیز کریں جو احادیث صحیحہ سے ثابت نہ ہوں[۱]۔"

جماعت اسلامی کی قوّت

کینیڈا کی ایک یونیورسٹی نیو برنزورک کے پروفیسر خالد بن سعید (جو دراصل حیدرآباد دکن کے ہیں اور انہوں نے کینیڈا کی شہریت حاصل کی ہوئی ہے) نے مجلّہ "Pacific Affairs" کے مارچ ۵۷ء کے شمارے میں لکھا ——— "اگر جماعت کی رکنیت عام کر دی جائے تو ارکان کی تعداد میں دوگنا چوگنا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن مولانا کا مقصد دراصل تربیت یافتہ قائدین اور کارکن پیدا کرنا ہے نہ کہ محض لوگوں کا ہجوم اکٹھا کرنا۔"

یہی وجہ ہے کہ جماعت کے ارکان کی تعداد سوا دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔

یہ جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان کی تعداد ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد سے بھارت کی جماعت اسلامی الگ ہو گئی ہے۔ وہ بھی اسی مقصد اور طریق کار کے مطابق کام کرتی ہے سوائے اس کے کہ ملک کے سیکولر دستور کی وجہ سے وہ سیاست اور انتخابات میں حصّہ نہیں لیتی۔ اس نے بھارت کے کونے کونے میں جماعت کی دعوت کو خوب پھیلایا ہے اور

---

[۱] روداد جماعت اسلامی حصّہ اول - ص ۴۷

وہاں کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں میں سے ایک ہے۔ عرب ممالک میں جہاں جہاں اخوان المسلمون ہے یا اس کے متاثرین ہیں۔ وہ سید مودودی کی کتابوں کے عربی ترجمے بڑے ذوق شوق سے پھیلاتے ہیں۔ انہی کی کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ عالم اسلام کا بچہ بچہ سید مودودی کو جانتا ہے۔

چونکہ مقبوضہ کشمیر کا علاقہ بین الاقوامی طور پر ابھی تک متنازعہ فیہ علاقہ ہے اس لیے یہاں کی تنظیم بھارت کی جماعت اسلامی سے الگ ہے اور وہ اس کی شاخ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کے ارکان کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ اپنا ایک ہفت روزہ "اذان" بھی نکالتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقے میں کام کی رفتار اچھی ہے۔ آزاد کشمیر میں افکارِ اسلامی کے نام سے ایک تنظیم کام کر رہی ہے اور اس کا مقصد اور طریق کار بھی وہی ہے جو جماعت اسلامی کا ہے۔ نیپال اور سیلون میں جماعت اسلامی کی اپنی اپنی تنظیمیں ہیں۔ باقی مسلم ممالک اور دنیا میں جماعت کے مقصد اور پیغام سے اتفاق رکھنے والے افراد انفرادی طور پر حسبِ توفیق اور حسبِ حالات کام کر رہے ہیں۔ لوگ جماعت اسلامی کے ارکان کی مختصر سی تعداد سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں جماعت کے پیغام کی وسعت کی صحیح تصویر قائم نہیں ہوتی۔ حالانکہ صورتِ حال یوں نہیں ہے۔ میاں طفیل محمد صاحب نے ایک دفعہ بجا کہا تھا کہ پانی گھاس کے نیچے نیچے بہت دور تک پہنچ چکا ہے۔

جماعت اسلامی نے خواتین کے لیے جماعت کے اندر ہی حلقۂ خواتین قائم کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنے طور پر اور اپنی تنظیم کے تحت پردے کی پابندیوں میں رہ کر جماعت کی دعوت پھیلائیں۔ اسی طرح مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے کے لیے جماعت کے اندر الگ شعبے موجود ہیں۔ جماعت اسلامی سے بالکل الگ طلباء کی ایک تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ اس کا مقصد بھی عالمگیر اسلامی انقلاب ہے اور یہ نوجوان طلبہ میں اسلامی افکار کی ترویج اور اسلامی سیرت کی تشکیل کے لیے کوشاں ہے۔ اس طرح تعلیم یافتہ نوجوان پود میں بھی سید مودودی کے افکار حوصلہ افزا رفتار سے جڑ پکڑ رہے ہیں۔ سیاستدانوں،

اساتذہ کرام، صحافیوں اور ملازموں میں بھی جماعت کے ہم خیال لوگ آہستہ آہستہ منظم ہو رہے ہیں۔ مولانا گلزار احمد مظاہری صاحب نے علماء کرام کی ایک فعال جاندار اور عمدہ تنظیم "جمعیت اتحاد العلماء" کے نام سے بنائی ہے۔ اس تنظیم کو برگزیدہ علماء کی سرپرستی حاصل ہے اور اس نے نہ صرف ان چند سیاسی علماء کی اجارہ داری ختم کر دی ہے جن کا اوڑھنا بچھونا سید مودودی کی مخالفت ہے۔ بلکہ یہ تنظیم اسلامی اقدار کے لیے مثبت کام بھی کر رہی ہے۔

جماعت اسلامی خدمتِ خلق کے بھی بہت سے کاموں میں حصّہ لیتی ہے۔ غریب طالب علموں کو تعلیمی وظائف، فیسیں اور مفت کتابیں دیتی ہے۔ کئی ایک جگہ ہسپتال قائم کیے ہیں۔ کچھ چلتے پھرتے شفاخانے ہیں جس سے غریبوں کو مفت علاج کی سہولتیں میسّر ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے موقعہ پر جماعت کے لوگوں نے ہمیشہ مظلوموں کی خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں مدد کی۔ تقسیم برِصغیر کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں امدادی کام کیا۔ کشمیر، فلسطین، قبرص اور اُردن کے مظلوم مسلمانوں کے لیے ہمیشہ امدادی سامان، ملبوسات، کمبل رضائیاں اور چندہ اکٹھا کیا، سیلاب زدگان کی مدد کی۔ پاک بھارت جنگ کے بعد سرحدی دیہاتوں کے متاثرین اور مقبوضہ کشمیر کے مظلومین کی پوری مدد کی۔ اس خدمت سے کارکنوں کو اگر خدا سے اجر ملے گا تو دوسری طرف جماعت کے لیے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشے پیدا ہوتے ہیں اور توسیعِ دعوت کے لیے میدان ہموار ہوتا ہے۔

جماعت اسلامی کی قوت تین باتوں پر مشتمل ہے۔ سیّد مودودی صاحب کی قابلِ رشک، ہمہ گیر شخصیت و قیادت، دوسرے جماعت اسلامی کی عمدہ فعّال اور منضبط تنظیم اور آخری چیز اس کا لٹریچر ہے ——— ان میں سے سیّد مودودی صاحب توفانی ہیں۔ ایک دن خدا کے حضور چلے جائیں گے اور دوسری چیز جماعت اسلامی کا فنا کرنا بھی ایک ——— فی ہزار کا امکان تو رکھتا ہے۔ ہٹلر اور صدر ناصر کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کوئی بھی فرعون صفت ظالم آمرِ مطلق اُٹھ کر جماعت اسلامی کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو فوجی قوت و جبر سے کچل کے رکھ سکتا ہے۔ لیکن سیّد مودودی کے لٹریچر کو کوئی قوت ختم نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں انسانوں کے ذہنوں میں اس طرح گھر کر لیا ہے کہ کوئی اسے ذہنوں سے

نکالنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ ایسا سیلابِ افکار ہے جس کے سامنے ہر آہنی بند ریت کی دیوار ثابت ہوگا اور اسلام کا ایسا ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے کہ جسے جہالت کے تمام میزائل اور ٹینک مِل کر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جماعتی لٹریچر نے باشعور طبقے کے ذہنوں کو جھنجھوڑا، ان کی زندگیوں کا رُخ موڑا اور انہیں تنظیم میں پرو دیا۔ تنظیم نے لٹریچر کو پھیلایا اور مزید لوگوں کو یکسو مُسلم بنا کر تنظیم میں جمع کر کے قوت میں اضافہ کیا۔ اس طرح یہ سلسلہ ہمیشہ دراز ہی ہوتا چلا جائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

اردو زبان کو ہمیشہ ناز رہے گا کہ یہ غیر فانی ادب اسی زبان میں لکھا گیا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر غالب اُردوئے مُعلّیٰ کے بانی تھے تو سیّد مودودی صاحب (عربئ مبین کی طرح) اردوئے مبین کے بانی ہیں۔ دنیا کے زندہ ادیبوں میں سے شاید ہی کوئی اس لحاظ سے سیّد صاحب کی ہمسری کر سکتا ہو کہ انہوں نے اتنا وسیع لٹریچر لکھا ہے اور جو اتنی زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پنجابی، پشتو، سندھی، بنگلہ، ہندی، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، ملیالم، تامل، ملائی، جاپانی، جرمنی، انڈونیشی اور فرانسیسی زبانوں میں چند کتب و مضامین کے تراجم ہو چکے ہیں۔ فارسی اور ترکی میں دس دس کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں چوبیس اور عربی میں پچاس سے زیادہ کتب و مضامین ترجمہ ہو کر تمام مسلم ممالک کے علاوہ یورپ و امریکہ میں پھیل چکی ہیں۔

سیّد صاحب کی کتابوں کو انگریزی میں زیادہ تر پروفیسر خورشید احمد صاحب نے منتقل کیا ہے جو جماعتِ اسلامی کے ایک سرگرم، انتھک اور حُسنِ گفتار کے مالک نوجوان ہیں۔ اسی لیے تو بہت جلد انہوں نے جماعتِ اسلامی کے بڑوں میں قدم رکھ لیا ہے۔ چراغِ راہ کے ضخیم علمی و تحقیقی نمبر نکالنے والے یہ مُدیر جو آج کل انگلستان میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کراچی کے بھی رُوحِ رواں ہیں۔ یہ ادارہ تحقیقی اسلامی کتب تیار کرواتا ہے اس ادارے نے اب تک کئی ایک قابلِ قدر کتابیں شائع کر کے اسلامی فلسفہ و افکار کی ترویج میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ سیّد صاحب کی کتابیں پہلے پندرہ بیس سال تک مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی شائع کیا کرتا تھا۔ پھر اسلامک پبلیکیشنز کا ادارہ وجود میں آیا جس نے ان کے

لٹریچر کو پہلے کی بہ نسبت نہ صرف خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے بلکہ وسیع تر پیمانے پر بھی پھیلایا ہے۔

سید مودودی صاحب کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے ۴۲ء میں مولانا ابوالحسن علی صاحب نے دار العروبہ کی بنیاد رکھی۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب مرحوم ومغفور اور محمد عاصم صاحب نے ٹیم ورک سے کئی سالوں کی محنت سے نہ صرف عربی میں جماعت کی اکثر کتابوں کے ترجمے کیے بلکہ عالمِ اسلام کے دورے کر کے سید مودودی کے لٹریچر اور پیغام کو پھیلا دیا کہ آج عالم اسلام میں یہ پیغام دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ اب جناب خلیل حامدی صاحب سرتاپا دار العروبہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ تازہ اسلامی لٹریچر اور تفہیم القرآن کو عربی میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی اسلامی تنظیموں سے ان کی وساطت سے جماعت کا ملی رابطہ قائم ہے۔

جس طرح ایک بلند و بالا مینار کو دیکھنا ہو تو ہم اس کے قدموں سے پیچھے اور پیچھے ہو کر دیکھتے ہیں تو پھر ہی اس کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اگرچہ اس کا انجینئر پیوندِ خاک ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس کی رعنائی تعمیر میں، عظمت میں، صفا میں، انجینئر کی رُوح جاری و ساری ہوتی ہے۔ اسی طرح مولانا مودودی نے اس لٹریچر سے بھی بہت زیادہ بلند و بالا اور لافانی کارنامہ انجام دیا ہے۔ لٹریچر ان کے صاحبِ قلم ہونے پر دلالت کرتا ہے تو یہ کارنامہ ان کے صاحبِ سیف ہونے کی نشانی ہے۔ جوں جوں وقت کا فاصلہ بڑھتا جائے گا ہمیں اس کارنامے کی عظمت کا صحیح احساس بڑھتا جائے گا اور اگرچہ سید مودودی ہمارے درمیان موجود نہیں ہوں گے لیکن یہ کارنامہ ان کی یاد ہمیشہ ولاتار ہے گا اور وہ کارنامہ ہے:

تحریکِ جماعتِ اسلامی!

باب ۱۳

قافلۂ راہِ حق

آغازِ کار

سیّد مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے فوراً بعد جماعت کی ایک امانت لوٹا دی۔

اس کی تفصیل ملک غلام علی صاحب بتاتے ہیں۔ "مولانا ساٹھ سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ برِعظیم ہند و پاکستان میں شاید ہی کوئی مصنف ہو جو اپنی تصانیف کی کثرتِ اشاعت میں آپ کا مقابلہ کر سکے۔ اگر مولانا ان کتابوں کی آمدن سے خود استفادہ کرتے تو بلا مبالغہ لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ لیکن سوائے چار پانچ کتابوں کے مولانا نے اپنی تمام کتابیں جماعت کو دیدی ہیں۔ مولانا ان کتابوں کی آمد اور اس کا حساب کتاب جماعت کی تشکیل سے قبل بھی ایک امانت کے طور پر بالکل علیحدہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ جس روز جماعت بنی ہے اسی روز ان کتابوں کی آمد اور آئندہ کے لیے ان کا حقِ اشاعت انہوں نے جماعت کے سپرد کر دیا۔ جماعتِ اسلامی کے مالیات کا بہت بڑا سہارا یہی مطبوعات ہیں۔ مولانا مودودی کے پاس کوئی جائیداد ،

کوئی پس انداز سرمایہ حتیٰ کہ ذاتی مکان تک نہیں ہے۔[1]"

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے جماعت اسلامی چھوڑنے سے پہلے سید صاحب نے انہیں ایک مفصل خط لکھا تھا جس کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔ اس میں نعمانی صاحب کے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے کہ سید مودودی تو اونچا معیارِ زندگی رکھتے ہیں اور رفقائے جماعت کو دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر میں اپنے معیارِ زندگی کو اس حیثیت سے نیچے گرا لوں تو لوگوں کے سامنے میری بات میں وزن نہیں رہے گا۔ سید صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مذکورہ بالا خط میں لکھا:

"اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے مطالبہ فرمایا تھا کہ میں ترجمان القرآن اور رسالہ دینیات وغیرہ کو بھی اپنی دوسری کتابوں کی طرح جماعت کی مِلک بنا دوں اور جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لیا کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ اولاً آپ کا یہ مطالبہ غیر شرعی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ سب لوگ اپنے وسائلِ معیشت جماعت کے حوالے کر دیں اور جماعت کے تنخواہ دار کارکن بن کر رہیں۔ یہ ٹرکس اور لینن کی شریعت کا قاعدہ ہے، نہ کہ خدا اور رسولؐ کی شریعت کا۔

ثانیاً اگر میں آپ کے اس مطالبہ پر عمل کروں تو میرے لیے اخلاقِ حسنہ کی پرورش کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ جب تک میں اپنی معیشت میں آزاد ہوں، میرے لیے موقع ہے کہ خدا کے کام میں اپنے اختیار سے جہاں جتنا چاہوں، خرچ کروں۔ لیکن آپ مجھے پابند بنا کر باختیارِ خود راہ خدا میں خرچ کرنے کا دروازہ مجھ پر بند کرنا چاہتے ہیں۔

ثالثاً جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لے کر کام کرنے کی صورت میں میری بات کا وہ وزن نہیں ہو سکتا جو اب ایک بے غرض اور بے لاگ آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے اور قریبی دَور کے تجربہ سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جس نے بھی جماعتی فنڈ سے تنخواہ لے کر

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔ ص ۳۶۷

کام کیا ہے۔ وہ پھر جماعت کی قیادت نہیں کر سکا ہے۔"

ایک دفعہ سیّد صاحب سے پوچھا گیا کہ قیامِ جماعت کے لیے انہوں نے دوسروں سے کس حد تک تعاون کے لیے درخواست کی اور اس کام پر اُکسایا۔ سیّد صاحب نے جواب میں کہا "اس سلسلہ میں سارا انحصار میں نے ترجمان القرآن کے مضامین اور ان دعوتی اعلانات پر کیا جو اس پرچہ میں شائع ہوتے تھے۔ جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان سے گفتگو کی۔ خطوط میں نے بہت کم لکھے۔ شائع شدہ تحریروں اور ملاقاتوں سے زیادہ کام لیا۔ اس کام میں میں نے جلد بازی سے بالکل کام نہیں لیا۔ مثلاً کوئی بڑی کانفرنس منعقد کی جائے، اس میں کچھ لوگ بُلائے جائیں۔ میں نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ میں تو بہت چھوٹے آغاز کا قائل ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جو بھی اچھے اور قابلِ اعتماد آدمی مجھے مل سکیں ان کو سمیٹوں اور کام شروع کردوں۔"

اس میں شک نہیں کہ جماعت کا آغاز حقیر سا تھا۔ لیکن اس کا طریقِ تنظیم و تربیت ایسا تھا کہ جماعت کی دعوت پھیلنے کے ساتھ ساتھ جو لاکھوں تک پہنچی۔ اسے ایسے پختہ سیرت و کردار ارکانِ جماعت ملے جو اگرچہ صرف سینکڑوں کی تعداد میں تھے لیکن ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق ان کی زندگی کا مشن تھا اور اس مشن کے لیے ان کے دلوں میں تڑپ تھی۔ وہ جماعت اسلامی کے رسالے، کتابیں اور پمفلٹ لے کر اپنے دوستوں کے پاس پہنچتے۔ ایک رات ایسا منظر بھی مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ مولانا محمود بخش صاحب نے ایک ہاتھ میں لالٹین اُٹھائی ہوئی ہے اور وہ چند لوگوں کو ایک جگہ جمع کرکے انہیں دینِ حق یا سلامتی کا راستہ سُنانے جا رہے ہیں۔ نجی گفتگوئیں ہوتیں، اسلام کے دیئے ہوئے زندگی کے نصب العین اور سیاسیاتِ حاضرہ پہ ایک نئے رُخ سے بحث ہوتی اور سیّد صاحب کی ۳۳ء سے لے کر اب تک کی تمام کتب لوگوں کو پڑھنے کے لیے دی جاتیں۔

تنظیم و تربیت

سیّد صاحب نے جماعت اسلامی کے طریقِ تنظیم و تربیت کے بارے میں لکھا ہے

"معاشرے کے صالح عناصر کو چھانٹنے اور ان کو ایک نظم میں پرونے کا کام ایک نہایت صبر آزما کام تھا۔ جو کئی سال تک خاموشی کے ساتھ اور بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ ہوتا رہا۔ جماعت کا لٹریچر ملک کے بے شمار آدمیوں تک پہنچا۔ ان میں سے لاکھوں نے اسے اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھا۔ ان میں سے ہزاروں آدمی کم و بیش اس سے متاثر ہوئے، اور ان میں سے سینکڑوں آدمیوں کے دل نے گواہی دی کہ فی الواقع یہی کرنے کا کام ہے۔ مگر یہ سینکڑوں آدمی بھی بیک وقت اس طرح جماعت کے نظم میں داخل نہیں کر لیے گئے کہ انہوں نے کسی رکنیت کے فارم پر دستخط کر دیئے ہوں اور بس وہ رکن جماعت قرار پا گئے ہوں، وقتاً فوقتاً تھوڑے تھوڑے آدمی یہ فیصلہ کر کے آگے بڑھتے رہے کہ اب ان کا جینا اور مرنا رب العالمین کے لیے ہے۔

ان کے قول کو ان کے عمل کی گواہی سے جانچا اور پرکھا گیا کہ فی الواقع جس فیصلے کا وہ زبان سے اظہار کر رہے ہیں، ان کی عملی زندگی بھی اس کی شہادت دیتی ہے یا نہیں۔ بسا اوقات ایک ایک شخص کئی کئی مہینے تک اُمیدواری اور امتحان کی منزل میں رکھا گیا۔ پھر جب اچھی طرح اطمینان کر کے اسے جماعت میں لیا گیا تو اس کے بعد بھی پوری جماعت یہ دیکھتی رہی کہ اس کے اخلاق، اس کے معاملات اور خدا کے دین کی سربلندی کے لیے اس کی سرگرمیاں اس کم سے کم معیار کے مطابق ہیں یا نہیں، جو دعوت الی الخیر کی خدمت انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔ جہاں کوئی شخص معیارِ مطلوب سے نیچے اُترا، جماعت کے پورے نظم نے اس کو سنبھالنے اور اُٹھانے کی کوشش۔ مگر جب وہ نہ اُٹھ سکا تو اسے جماعت سے الگ کر دینے میں کبھی تامل نہ کیا گیا۔ تاکہ ایک شخص کی کمزوری پوری جماعت کو کمزور نہ کر دے۔ اس طرح چھ سال (۴۷ء تک) کی طویل مدت میں دس کروڑ کی عظیم الشان قوم میں سے جو لوگ اس تنظیم کے لیے چھانٹے جا سکے ان کی تعداد تقسیم کے وقت صرف ۶۲۵ تھی[1]۔"

---

[1] جماعت اسلامی مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل۔ ص ۴۷-۴۸

اس طریقے سے جو لوگ جماعت میں آئے ان کی تربیت کے لیے کسی خانقاہ یا تربیت گاہ قائم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ دعوتِ حق کو قبول کر کے جب کسی نے اسلام کی پابندی کا فیصلہ کر لیا تو "ہر شخص کو ہر جگہ ایک کشمکش سے سابقہ پیش آیا جس کی ابتدا اس کے اپنے نفس سے ہوئی اور پھر اس کا دائرہ ان تمام گوشوں تک پھیلتا چلا گیا جہاں اس کی اس نئی روش کا اس بگڑی ہوئی سوسائٹی کے طور طریقوں سے تصادم ہوتا تھا۔ جو لوگ اپنی سیرت کے جس گوشے میں بھی خامی رکھتے تھے وہ اسی گوشے میں شکست کھا گئے اور اس کشمکش نے ان کو آپ ہی آپ چھانٹ کر الگ پھینک دیا۔ مگر جو ثبتنا اللہ کہہ کر اپنے اس قول پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے ان کے لیے یہی کشمکش ایک بہترین مربی اور مزکی ثابت ہوئی۔ اس نے ان کو صبر کی، تحمل کی، ایثار اور قربانی کی مشق کرائی۔ اس نے ان کو دھن کا پکا اور ارادے کا پختہ بنایا۔ اس نے ان میں اپنے نصب العین سے عشق اور اس کے لیے جدّوجہد کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نے ان کو جذبات اور خواہشات پر قابو پانا سکھایا۔ اس نے ان کو اس قابل بنایا کہ جس چیز کو حق سمجھیں اس کے لیے کسی خارجی دباؤ یا لالچ کے بغیر اپنے ایمان کے تقاضے سے اپنا وقت، اپنی محنتیں اور اپنے اوقات صرف کریں، اور اسی نے ان میں یہ طاقت پیدا کی کہ اپنے مقصد کی راہ میں نقصانات اُٹھائیں، خطرات سہیں، مشکلات کا مقابلہ کریں اور بعد کے مراحل کی شدید تر آزمائشوں کا سامنا کر سکیں[1]۔"

اس فطری طریقِ تربیت کی تین باتوں نے مدد کی۔ دعوت و تبلیغ، دوسرے نظمِ جماعت اور تیسرے روحِ تنقید۔ جب ایک شخص دوسروں سے کہتا ہے "کہ اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دے دو، اپنی زندگی سے تضاد اور منافقت دُور کرو اور جاہلیت کے ایک ایک اثر کو اپنے اندر سے نکالو تو اس کے گرد و پیش کی دنیا میں سے سینکڑوں نگاہیں خورد بین لگا لگا کر اس کی اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں اور اس کی کوئی خامی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی نشاندہی کرنے سے زبانیں چُوک جائیں۔ اس طرح ایک آدمی کو مانجھنے

---

[1] جماعت اسلامی مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل۔ ص ۵۰-۵۱

اور صاف کرنے میں بہت سے بندگانِ خدا دانستہ یا نادانستہ لگ جاتے ہیں۔ جو اپنے معترضین کی اس خدمتِ بے مُزد سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کی تکمیل آپ سے آپ ہوتی چلی جاتی ہے اور جو اس تنقیدِ عام سے شکست کھا کر بھاگ نکلتا ہے۔ وہ خود ہی ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے کام کا آدمی نہیں ہے۔[1]"

جماعت اسلامی کا نظمِ جماعت، ڈسپلن اور سمع وطاعت تو ایسا ہے جسے مخالفین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

تیسری چیز رُوحِ تنقید کے بارے میں سیّد صاحب رقم طراز ہیں "تنقید ہی وہ چیز ہے جو ہر خرابی کی بر وقت نشاندہی کرتی اور اس کی اصلاح کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادّی حیثیت سے صفائی کی اہمیت ہے۔ جس طرح نجاست وطہارت کی حِس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہو جانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا ہو جاتا ہے اور اس کی فضا ہر طرح کے امراض کے لیے ساز گار بن جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سُننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی۔

یہ بات ہر رُکنِ جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل ہے کہ اپنے ساتھی ارکان کی ذات میں یا ان کے جماعتی کرداریں یا اپنی جماعت کے نظم میں یا جماعت کے لیڈروں میں اگر وہ کوئی نقص پائے تو اسے بلا تکلّف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی بنایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف تنقید برداشت کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور جس نقص کی نشان دہی کی گئی ہے وہ اگر واقعی موجود ہو تو اسے دُور کرنے کی طرف توجہ کریں۔ ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کر دیں۔ ہم نے کبھی جماعت میں رُوحِ تنقید کو خوابیدہ ہونے نہ دیا اور اسی کا یہ فائدہ ہے

---

[1] جماعت اسلامی مقصد تاریخ اور لائحہ عمل۔ ۵۲-۵۳

کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کی تربیت اور تکمیل میں مدد دے رہا ہے اور اپنی تکمیل و تربیت میں اس سے مدد لے رہا ہے[1]"

چوہدری علی احمد خاں

سیّد صاحب ابھی لاہور میں ہی قیام پذیر تھے اور جماعت اسلامی نے ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھا تھا، جماعت اسلامی کا لٹریچر پھیل رہا تھا اور ایک خاص ذہن اور کردار کے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے اور وہ ایک ایک کر کے اس قافلۂ راہِ حق میں آکر شامل ہو رہے تھے، اس قافلۂ راہِ حق میں ضلع ہوشیار پور کے ایک معزز راجپوت خاندان میں پیدا ہونے والا ایک مردِ مومن بھی تھا جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں اور جسے سیّد مودودی نے بہترین کارکن لکھا۔ وہ چوہدری علی احمد مرحوم و مغفور (وفات ۵۶ء) تھے جنہیں مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کا بانی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ اسی دنیا میں رہنے والے کسی انسان کے حالات ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے آغاز میں بیشتر لوگ اسی شانِ ایثار، دل لگن اور ہرچہ بادا باد کے نعرے سے قافلے میں شریک ہوئے تھے۔ چوہدری علی احمد خاں صاحب کا ذکر اس لیے اجمال سے کیا جا رہا ہے کہ قاری کو یہ اندازہ ہو سکے کہ سیّد مودودی کے لٹریچر نے سعید روحوں کو کس طرح بیدار کیا، انہیں ایک آہنی عزم دیا، انہیں پورے معاشرے سے کشمکش کے لیے تیار کیا اور پھر کس طرح ان نیک لوگوں نے مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی عملی تفسیر لکھی۔

ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ڈھگام ہے۔ چوہدری علی احمد خاں یہیں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد پولیس میں ملازم ہو گئے۔ قلعہ پھلور کے فنگر پرنٹ بیورو میں تھے کہ علامہ اقبالؒ کا پورا مطالعہ کیا۔ انہی ایام میں ایک انگریزی

---

[1] جماعت اسلامی مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل۔ ص ۵۵-۵۶

ہفت روزہ "Truth" پڑھا جس کے مدیر نے لکھا تھا کہ مولانا مودودی کے خیالات سونے میں تولنے کے قابل ہیں۔" چنانچہ چوہدری صاحب نے ترجمان القرآن کے پچھلے پرچے اور سیاسی کشمکش تینوں حصص منگوا کر مطالعہ شروع کیا۔ مرحوم جوں جوں ان تحریروں کو پڑھتے گئے انہیں یوں احساس ہوتا گیا کہ گویا سب چیزیں اُن کے دل میں پہلے سے موجود ہیں۔ اقبال کے شدتِ احساس نے جس جذبہ کو مرحوم کے اندر جنم دیا، مولانا مودودی کے تفکّر کی گہرائی نے اسے پروان چڑھایا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے انہیں مرتے دم تک چین نہ لینے دیا۔ مرحوم اقبال اور مودودی کے احساسات و تصوّرات کا حسین مرقع تھے[1]"۔

پہلی دفعہ سیّد مودودی سے ملنے لاہور آئے تو ان کے ساتھ یادگار حادثہ پیش آیا۔ سیّد مودودی ان دنوں رات رات بھر لکھنے کا کام کرتے رہتے تھے اس لیے نماز فجر پڑھ کر سوتے تھے۔ چوہدری علی احمد صاحب سیّد مودودی کے مکان پہ علی الصبح پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ یا الٰہی اس آدمی کے بارے میں میرا تو یہ خیال تھا کہ اِسلام کے قافلے سے جُدا ہونے والوں کے لیے عصرِ حاضر کی اندھیری شب میں اس کا شعلۂ نوا قندیل ہے۔ لیکن اس کے عمل کا یہ حال ہے کہ اسلام کے بنیادی رکن نماز سے بے بہرہ اس وقت تک نیند کر رہا ہے یہ بھی کہیں گفتار کا غازی تو نہیں ہے؟

پھر چوہدری صاحب بتاتے ہیں کیا ہوا۔" جی چاہا کہ دوسری گاڑی سے واپس لوٹ جاؤں۔ پھر سوچا اتنی دُور سے آیا ہوں مِل کر ہی جانا چاہیئے۔ قریبی مسجد میں گیا وہاں کے امام صاحب سے مِلا۔ ان سے مولانا مودودی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آج صبح کی نماز میں ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ خیر دم میں دم آیا اور دل ہی دل میں اپنے اس سوءِ ظن پر نادم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد گیا اور مولانا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سب سے پہلے یہی معذرت کی کہ گزشتہ رات بھر لکھتا پڑھتا رہا ہوں، اس لیے صبح کی نماز کے بعد سو گیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھ سے تشکیلِ جماعت کے موقعہ پر حاضر نہ ہونے کا ذکر کیا اور

---

[1] اسعد گیلانی: "چوہدری علی احمد خاں"۔ ص ۳۲۔

فرمایا کہ آپ کا انتظار تھا۔[1]

اس راجپوت کو سیّد صاحب کی کون سی ادا بھا گئی ؟ ایک دلچسپ آپ بیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں "ہم کسی شخص کی سیرت کا مطالعہ کرتے وقت دوسری خصوصیات کے علاوہ اس چیز کا اندازہ بھی لگاتے ہیں کہ اس کا اپنی بیوی پر کس قدر دبدبہ ہے۔ جب مَیں اور مولانا محوِ گفتگو تھے تو اس اثنا میں اندر سے دو تین بار دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مگر مولانا پوری توجہ سے باتیں کرتے رہے اور اس طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ مَیں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ آدمی جاندار ہے۔ اب اگرچہ مجھے اپنے اس معیار پہ ہنسی آتی ہے مگر اس وقت مولانا کا یہ طرزِ عمل مجھے بہت پسند آیا۔"[2]

اور جب انہوں نے جماعتِ اسلامی میں شمولیت کا تہیہ کر لیا تو ان کے سامنے بالکل نئی اور بدلی ہوئی دنیا تھی۔ یہ نئی زندگی ایک طرف آخرت میں کامیابی اور کامرانی کا یقین دلاتی تھی تو دوسری طرف دنیاوی مصائب آلام، معاشی تفکرات اور کس مپرسی کی زندگی کی نشاندہی بھی کرتی تھی۔ انگریز کی چاکری چھوڑنا تو ناگزیر تھا۔ ان کے افسروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے بہت سمجھایا کہ تم ابھی نوجوان ہو۔ کسی دن ایس پی ہو جاؤ گے، اور واقعی ان کے کئی ساتھی اس وقت ڈی ایس پی اور ایس پی کے عہدوں پہ فائز ہیں۔ گھر والے ان کے ارادے میں مزاحم ہوئے کہ گھر میں صرف تمہی پڑھے لکھے تھے۔ تم یہ کیا پگلہ پن کرنے لگے ہو۔ لیکن خدا کا سپاہی ہرچہ بادا باد کا نعرہ لگا چکا تھا۔ اس کے بعد

ع بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔

بہترین کارکن

پھر چوہدری صاحب کس طرح کشتیاں جلا کر ۴۴ء میں جماعت اسلامی میں داخل

---

[1] اسعد گیلانی: "چوہدری علی احمد خاں"۔ ص ۱۷۴۔

[2] ایضاً ص ۳۶

ہوئے ، اس کا حال سیّد احمد حسن صاحب نے لکھا ہے ۔ جو مرحوم کے نہایت عزیز دوست ، رفیق اور ساتھی تھے ۔ جماعت اسلامی میں اسعد گیلانی صاحب ایم اے کے نام سے معروف ہیں ۔ اور جماعت اِسلامی پنجاب کے امیر ہیں ۔ انہوں نے چوہدری علی احمد خاں کے نام سے مفصّل کتاب لکھی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ پھلور میں چوہدری علی احمد خاں صاحب نے استعفیٰ داغا اور پھر وہیں کسبِ حلال کے لیے تنور کھول لیا ۔ "مَیں نے پہلی بار اس مجاہد کو اس حال میں دیکھا کہ دوپہر کا وقت تھا ، کڑکتی دھوپ پڑ رہی تھی ۔ ایک چولہے پر سالن پک رہا تھا اور دوسرے چولہے پر کھڑے ہوئے چوہدری صاحب روٹی پکا رہے تھے ۔ وہ تہبند باندھے ہوئے تھے اور گلے میں صرف بنیان تھی ۔ سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا اور اس بھٹیار خانہ کے اندر چھپر میں کوئی نوجوان بیٹھا تھا جس کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر بحث ہو رہی تھی جو آگے چل کر کمیونزم کی طرف مڑ گئی ۔ وہ بازار میں کھڑے ہوئے روٹی پکاتے اپنے اندر ایک اور ہی ادا رکھتے تھے جو ان کے وقار کو بڑھا رہی تھی ۔ وہ کبھی توے پر روٹی اُلٹتے تھے اور کبھی ہانڈی میں چمچہ پھیرتے تھے اور پھر ایک گاہک کے آنے پر خود ہی ایک پیالی میں سالن اور چھابے میں روٹی رکھ کر اس کے سامنے رکھ آتے ۔

باہر سے تو یہ محض بھٹیار خانہ تھا لیکن اس کے اندر کی دنیا نرالی تھی ۔ ایک لمبا بنچ بچھا ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک لمبا تختہ لگا ہوا تھا ، جو ڈائننگ ٹیبل کا کام دیتا تھا ۔ جب گاہک ہوتے تو یہ ڈائننگ ٹیبل ہوتی اور جب کھانے کے اوقات نہ ہوتے تو وہ دارالمطالعہ کی میز بن جاتی ۔ وہاں رسائل و اخبارات آ جاتے ۔ کمرے کے باقی حصّے میں آمد و رفت کے لیے ذرا جگہ چھوڑ کر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر کھانے کے اوقات میں اخبارات اور کتابیں کثرت سے پڑے ہوئے ہوتے ۔ جن میں الحسنات ، کوثر ، ترجمان القرآن نمایاں ہوتے ۔ دارالمطالعہ کی کتابیں بھی ایک طرف پڑی رہتیں جو برابر اجرا کی جاتی رہتیں ۔ اس طرح وہ دکان باہر سے بھٹیار خانہ تھی اور اندر سے اِسلامی اور دینی لٹریچر و اخبارات کا بہترین دارالمطالعہ ، اس طرح اس کاروبار کے ظاہر سے اس کا باطن کہیں زیادہ خوبصورت تھا[1] "۔

---

[1] اسعد گیلانی : "چوہدری علی احمد خاں" ۔ ص ۱۷۶

سیّد مودودی صاحب نے ان کی وفات پر لکھا تھا "میرے دل میں ان کی پہلے ہی بہت قدر تھی لیکن مجھے ان کے عزم و اخلاص کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب ۷ ۴ء کے آغاز میں مجھ کو خود پھلور جانے کا اتفاق ہوا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ جس پامردی کے ساتھ مالی مشکلات کا سامنا کر رہے تھے، اور گرد و پیش کے لوگوں کو جس طرح اپنی دعوت و تبلیغ اور اپنے بلند کیریکٹر سے متاثر کر رہے تھے، اس کو دیکھ کر مَیں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کو ان کی ذات میں ایک بہترین کارکن میسّر آیا ہے۔ مَیں اسی وقت یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ چوہدری صاحب ہر میدان میں کام کر سکتے ہیں اور ہر مہم کے لیے موزوں ثابت ہو سکتے ہیں[1]"۔

انہیں اپنے مقصدِ زندگی سے کس حد تک عشق تھا اس کی گواہی دینے والے دو واقعات پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے رقم کیے ہیں:۔ "۵۴ء میں ان کا چھوٹا صاحب زادہ بلال احمد بیمار پڑ گیا۔ ایک دن یکایک اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس دن مرحوم کو ڈسکہ میں تقریر کرنا تھی، چنانچہ وہ چلے گئے۔ وہاں یہ پیغام ملا کہ بچہ رخصت ہو گیا ہے۔ مرحوم واپس تشریف لائے اور تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر پھر ڈسکہ لوٹ گئے اور وہاں جا کر تقریر کی۔ اسی طرح ایک سال بعد جب مرحوم مشرقی پاکستان میں تھے، تو ان کی غیر حاضری میں ان کی نوجوان بچّی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ان دنوں شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ہمارے دوست "قاضی فاضل صاحب نے انہیں مرکز میں اس کی اطلاع دی۔ اس وقت وہ بالٹی لیے پانی بھرنے جا رہے تھے۔ یہ افسوسناک خبر سُن کر کچھ دیر کے لیے رُک گئے آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ مَیں نے بالٹی اٹھائی اور غسل کے لیے پانی بھر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر چند منٹ ہم سے باتیں کرتے رہے، پھر شوریٰ کی کارروائی میں شریک ہوئے۔ ہم حیران تھے کہ یا اللہ یہ انسان ہے یا صبر و استقلال کا ایک پہاڑ ہے جو ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں[2]"۔

---

[1] اسعد گیلانی: "چوہدری علی احمد خاں" ص ۵۷

[2] ایضاً۔ ص ۶۸۔

اور جب دستورِ اسلامی کے مطالبے کی مہم کو تیز کرنے کے لیے جماعت اسلامی نے ایک وفد مشرقی پاکستان بھیجا تو اس میں چوہدری علی احمد خاں بھی تھے۔ انہیں وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ لیکن وہ مسلسل بخار کی حالت میں بھی تقاریر کرتے رہے اور لوگوں سے گفتگوئیں کرتے رہے۔ وفد کی واپسی پر جماعت نے محسوس کیا کہ اس حصّۂ ملک میں جماعت کی دعوت کو عام کرنے کی اور مقامی کارکنوں کی ایک کھیپ کو تربیت دے کر تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے سبھی کی نگہِ انتخاب چوہدری علی احمد خاں صاحب پہ پڑی جو وہاں کی آب و ہوا سے گھبراتے تھے اور جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس موقعے پر سیّد مودودی نے کہ جن کی خوئے دل نوازی ماتحتوں کو حکم دینا اور جن کی خودداری کسی سے درخواست کرنا نہیں جانتی، مرحوم سے کہا "چوہدری صاحب! بنگال میں چار کروڑ انسان بستے ہیں اور وہ بھی تو آخر زندہ ہیں[1]۔"

مشرقی پاکستان کی جماعتِ اسلامی کا بانی

بیوی بچوں اور بوڑھی والدہ کو چھوڑ کر ہزار میل دور جب یہ مجاہد پہنچا تو سب سے پہلے انہوں نے ڈھاکہ کی مقامی جماعت کے نظم پر توجہ دی اور اس کے ہفت روزہ اجتماعات میں مسلسل شرکت کر کے اجتماعات کا طریقِ کار، انعقاد، کارکنوں میں جماعتی شعور، نظم و ضبط کی پابندی کا احساس اور باہمی ربط و ضبط پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تقاریر کے اس سلسلے کے ذریعے انہوں نے تربیتِ کارکنان کا آغاز کیا۔ آہستہ آہستہ جماعت کا جمود ٹوٹنے لگا اور مختلف طبقوں میں کام پھیلنے لگا۔ تاجروں میں، طالب علموں میں، خواتین میں، یونیورسٹی کے حلقے میں اور عام پبلک میں۔ جس مقامی جماعت کے بیت المال میں صرف تیس روپے آتے تھے، آہستہ آہستہ وہ سینکڑوں تک پہنچا۔ اس کے اجتماعات شہر کے مختلف حصّوں میں منعقد ہونے لگے جس میں ہر ہفتے سینکڑوں افراد نے شرکت شروع کر دی۔ صوبے کے دوسرے مقامات میں دعوت سے دلچسپی رکھنے والوں کے غیر منظم حلقے تھے، انہوں نے ان تمام حلقوں

---

[1] اسعد گیلانی، "چوہدری علی احمد خاں"۔ ص ۱۹۶

میں دس دس دن قیام کر کے تحریکی تنظیم کے کام کی ابتدا کی۔ اس طرح انہوں نے تقریباً تین ماہ اس کام پر صرف کیے جس کے ذریعے صوبے میں جہاں جہاں دعوتی کام سرایت کیے ہوئے تھا وہاں وہ منظم بھی ہو گیا اور اس نے اپنی اپنی بستی میں جڑیں پھیلانا شروع کر دیں[۱]۔"

ڈھاکہ شہر سے سیلاب کا پانی اترا تو نالیوں کا سسٹم برباد ہو گیا تھا۔ گلیوں میں گندے پانی میں گوڑے کرکٹ کے ڈھیر کھڑے تھے۔ تعفن بڑھ رہا تھا اور بیماری پھیلنے کا ہر وقت امکان تھا۔ ڈھاکہ کی مقامی جماعت نے صحت و صفائی کا کام انجام دینے کا پروگرام بنایا تو "چوہدری صاحب سب سے آگے تھے۔ انہوں نے گندی نالیوں میں ہاتھ ڈال کر گوڑا نکالا۔ جھاڑو سے گوڑا صاف کیا۔ کدال سے گوڑا ہٹایا اور فینائل اور بلیچنگ پوڈر چھڑکا۔ جب حلقے کا امیر یہ نمونہ پیش کر رہا ہو تو پھر دوسرے کارکنوں کے لیے کیا گنجائش تھی کہ وہ ہچکچاتے یا اپنی سفید پوشی یا علمی برتری کے خیال میں وقت ضائع کرتے۔ چنانچہ ہر شخص اپنے اپنے کام پر لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت کی صفائی کی مہم بڑی کامیاب رہی۔ پبلک نے حیرانی سے اس طرز کے کارکنوں کو دیکھا۔ اخبارات میں جماعت کے کام کی تعریف کی گئی اور شہر میں جماعت کے کام کی دھاک بیٹھ گئی[۲]۔"

اعظم ادیب جلالی صاحب نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بڑی صحیح بات کہی "بختیار خلجی نے صرف دو جانباز ساتھیوں کے ہمراہ راتوں رات بنگال کی راجدھانی پر حملہ کر کے اس پر تصرف حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب شاید یہ واقع ہے کہ چوہدری علی احمد خاں نے اپنے دو مجاہد ساتھیوں کے ہمراہ خدا کی راہ میں مشرقی پاکستان ہجرت فرمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیروں نے اپنے سنگین قلعوں کے دروازے اجالوں کے لیے چوپٹ کھول دیئے[۳]۔"

---

[۱] اسعد گیلانی: "چوہدری علی احمد خاں" ص ۱۹۷۔

[۲] ایضاً۔ ص ۲۰۲۔

[۳] ایضاً۔ ص ۲۷۵۔

چوہدری علی احمد خاں صاحب مرحوم و مغفور ایک عظیم انسان تھے کہ جن کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ہم مسرت و حیرت کے جذبات سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ پھر آہستہ سے ذہن کے دریچوں سے ایک خیال اُبھرتا ہے کہ اگر انہیں کسی نے نصب العین کی حرارت سے معمور نہ کیا ہوتا، عہدِ جدید کے بارے میں احساسِ زیاں دے کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا جذبہ نہ دیا ہوتا، تو وہ بھی کروڑوں اور اربوں انسانوں کی طرح اپنا نقشِ قدم چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں ایک مردِ حق آگاہ مل گیا جس نے ان کی دنیا بدل کے رکھ دی۔ طارق قریشی صاحب کا کہنا ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھتے ہوئے اسی مردِ حق آگاہ کا سراپا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
موت کے آئینے میں دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

قافلۂ راہِ حق

قافلۂ راہِ حق میں شامل ہونے والوں میں بیسیوں لوگ ایسے ہیں جن کی زندگیاں چوہدری علی احمد خاں صاحب کی طرح دلآویز اور سبق آموز ہیں۔ جن کا کردار اور خلوص و ایثار بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتا رہے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو جماعت اسلامی کو ۵۷ء میں چھوڑ گئے اور اب اس کے طریقِ کار سے اختلاف کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے آغاز کے قافلۂ راہِ حق کی شان قلمبند کی ہے۔

"جماعت اسلامی کے ارکان پر جوں ہی اسلام کی حقیقت منکشف ہوئی انہوں نے شعوری طور پر نسلی اسلام کو چھوڑ کر حقیقی اسلام کو قبول کیا۔ اس چیز نے ان کے دلوں میں بعینہٖ وہی احساسات و

جذبات اجاگر کر دیئے کہ جو ایک نومسلم کے قلب میں پہلی مرتبہ اسلام قبول کرتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی گرم جوشی اور اپنے مقصدِ حیات کے لیے فنائیت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہیں (Fanatic) کہا جانے لگا۔ یہ جوشِ کار براہِ راست نتیجہ تھا اس نومسلمانہ احساس کا، جو جماعت کے ارکان کے قلوب میں جاگزین تھا۔ انہوں نے دین کو شعوری طور پر قبول کیا تھا اور اپنا تن من دھن سب کچھ اس کے لیے قربان کرنے کو تیار تھے۔

اس جماعت کی کیفیت عجیب معجز نما تھی کہ جہاں کوئی شخص اس میں داخل ہوا اس کی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو گیا۔ وہ دہریئے اور ملحد جنہیں دین سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو نماز روزے کا مذاق بطور فیشن اڑانے کے عادی ہو گئے تھے، اس جماعت سے منسلک ہوئے تو پابندئ صوم وصلوٰۃ ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہو گئی۔ وہ چہرے جو ہر روز صبح ہی صبح اُسترے کی رگڑ کے عادی تھے، یکایک داڑھیوں سے مزین نظر آنے لگے۔ اور وہ اوقات جو سیر و تفریح اور خوش گپیوں میں صرف ہوتے تھے، اب سنجیدگی کے ساتھ سوچنے، مطالعہ کرنے اور دین کی دعوت پھیلانے میں صرف ہونے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں نہ دنیا بنانے کی فکر ہے، نہ گھر بار جمانے کی، نہ جاہ و حشمت کی کوئی طلب ہے، نہ مال و دولت کی کوئی حرص۔ انہیں دُھن ہے تو بس ایک بات کی اور سودا ہے تو بس اس کا کہ اللہ کے دین کا چرچا عام ہو۔ اس کا کلمہ سربلند ہو اور دینِ حق دنیا میں قائم ہو جائے۔ اسی کے لیے وہ زندہ تھے اور اسی کے لیے مرنا چاہتے تھے۔

ان میں سے جس کسی سے کسی کا تعلق قائم ہوا وہ ان کے خلوص، ان کی بے ریا محبت، ان کی بے لاگ دیانت اور ان کی کھری اصول پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جسے بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ معاملات میں نہایت کھرے اور لین دین میں دیانت اور امانت کی کسوٹی پر پورے اترنے والے ہیں۔ ان کے درمیان انتہائی گہرا رشتۂ اخوت و محبت پایا جاتا تھا۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور ہم مقصدیت نے ان کے اندر ایک ہونے کا ایک بہت گہرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دُکھ اور سُکھ، مشکلیں اور آسانیاں سب مشترک تھیں۔

انہوں نے کہا غیر الٰہی حکومت کی ملازمت حرام ہے اور پھر اچھی اچھی اسامیوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کو ٹھکرا دیا اور اپنے لیے ہزاروں طرح کی معاشی مشکلات پیدا کرنے سے انہیں کوئی چیز اس لیے نہ روک سکی کہ ان کے نزدیک یہی حق تھا۔ اس اصول پسندی اور حق پرستی سے جہاں ان کا اخلاقی وقار اور رعب آس پاس کے ماحول پر قائم ہو رہا تھا، وہیں ساتھ ساتھ اس ماحول کے ساتھ تصادم کی بنیاد بھی پڑ رہی تھی۔ اس کام کے لیے ایثار کی بھی انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں کہ جنہیں دیکھ کر صحابۂ کرام کا ایثار نگاہوں کے سامنے پھر جائے۔ بڑے بڑے خوشنما مستقبل (Careers) سے انہوں نے نگاہوں کو پھیرا۔ کاروبار کا ضیاع انہوں نے برداشت کیا اور اپنے مقصد کی لگن اور اپنے کام کی دُھن میں انہوں نے دنیا کی ہر اس چیز کا نقصان اور زیاں برداشت کیا، جس کا نقصان وزیاں ہر انقلابی تحریک کے کارکنوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے [1]"

جنگِ عظیم دوم

ان دنوں جنگِ عظیم دوم چھڑے ہوئے ڈھائی تین سال ہو گئے تھے۔ جرمن قوم پرستی کا آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اس نے پورے یورپ کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا تھا۔ آریائی نسل کی برتری نے عالمِ انسانیت کو تباہی کی سب سے بڑی بھٹی جنگِ عظیم دوم میں جھونک دیا تھا۔ ہٹلر کی مکاری نے رائین لینڈ، آسٹریا اور چیکوسلواکیہ کو بغیر لڑائی کیے ہتھیا لیا تھا۔ یکم ستمبر ۳۹ء کو جنگِ عظیم دوم شروع ہوئی تو نازی فوجوں نے جدید طریقِ جنگ کا دروازہ کھولا اور اس طرح آگ اور فولاد کا خون فشاں ڈرامہ شروع ہوا۔ ہٹلر کی طوفانی فوجوں کا سیلاب ایک ہفتے میں ہی پولینڈ کے دارالخلافہ وارسا کو گھیرے ہوئے تھا۔ چار ماہ تک اتحادی فوجوں کو سانپ سونگھے رہا۔ ہٹلر نے برق رفتاری سے چند گھنٹوں میں ناروے اور چار دنوں میں سویڈن فتح

---

[1] نوٹ: یہ سب فقرے ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب "تحریکِ جماعتِ اسلامی ایک تنقیدی مطالعہ" میں صفحات ۸۵ تا ۹۴ میں موجود ہیں۔ فقروں کی صرف تقدیم و تاخیر اور ترتیب میری ہے۔ مؤلف

کر لیا۔ پھر بھی اتحادیوں کو آگے بڑھنے کی جرأت نصیب نہ ہوئی۔

ہٹلر نے بھرپور وار کر کے ہالینڈ، بلجئیم، برطانیہ اور فرانس کی ڈیڑھ سو ڈویژن اتحادی فوج کو شکستِ فاش دی کہ اتحادیوں اور جنرل ڈیگال کو ڈنکرک کے راستے بھاگتے ہی بنی۔ نازی فوجوں نے یوگوسلاویہ، یونان اور افریقہ میں بھی سواستیکا لہرا دیا۔ مغرب سے مطمئن ہو کر نازی ڈکٹیٹر ہٹلر نے مشرق میں اپنے حلیف روس پر حملہ کر دیا اور یہاں ہٹلر اور اس کی نازی افواج کا وہی حال ہوا جو نپولین اور اس کی گرینڈ آرمی کا ہوا تھا۔ ہٹلر کا یہ خواب کہ وہ مشرق کی وسیع و عریض مملکتِ روس پر قبضہ کر کے عظیم ترین جرمن سلطنت کی بنیاد رکھے گا جو بقول اس کے "ہزار سال تک رہے گی" شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ لیکن اس نے پوری دنیا کو جنگِ عظیم دوم کی ہولناک اور خون آشام بھٹی میں ضرور گرا دیا۔

برصغیر ہند و پاک پہ انگریز کا راج تھا کہ جن کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، اب اسی برطانیہ عظمیٰ کا محل نازی زلزلے سے کسی بھی وقت زمین بوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نازی جرمنی کی بُرائی کا صرف ایک پہلو اچھا تھا اور وہ یہ کہ اس نے برطانیہ عظمیٰ کے شیر کو بوڑھا کر کے رکھ دیا تھا اور اس کے پنجے تلے دبی ہوئی قوموں کو امید ہو چلی تھی کہ اب ہمیں انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا مل جائے گا۔[1] لیکن محوری طاقتوں میں سے جاپان کی نظریں ہندوستان کی وسیع سلطنت پہ تھیں۔ اگر جاپانی ہندوستان پہ قابض ہو جاتے تو یہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہو جاتی۔ چھوٹے قد اور چھوٹی آنکھوں والے جاپانی روز بروز اتحادیوں کو مارتے ہوئے بڑھ رہے تھے اور اب وہ سنگاپور کے بعد برما کے جنگلات تک گھس آئے تھے۔ ظلم و تشدد، بے رحمی اور شقاوتِ قلبی میں جاپانیوں نے اپنے ساتھی نازیوں کو بھی مات کر دیا۔

عام ہندوستانی خوراک، کپڑا، مٹی کا تیل اور چینی جیسی ضروریاتِ زندگی کی راشن بندی سے نالاں تھا۔ موٹریں اور بسیں پٹرول کی بجائے کوئلے سے چلنے لگیں تھیں۔ برّصغیر کے ٹوڈی راجے اور نواب، جاگیردار اور سرکاری خطاب یافتہ حضرات انگریزی حکومت کی دھن دولت سے ہی نہیں، ہر طرح سے ممکن امداد کر رہے تھے عام ہندوستانیوں

---

[1] عبدالرحمان عبد: داستانِ ہٹلر

کو انگریزی حکومت کی برکتیں گنوا کر فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب بھی دے رہے تھے۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کی کوششوں سے ایک مسودۂ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش ہوا۔ مسلم لیگ پارٹی نے اس کی تائید و حمایت کی۔ اس قانون کا منشا یہ تھا کہ جو لوگ انگریزی غلامی کو قائم رکھنے کے لیے بنائی جانے والی فوج میں بھرتی ہونے سے روکیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔[1]

پھر یہی نہیں ہوا اس کے علاوہ پریس پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ لیکن سیّد مودودی نے، کہ جرأت و بے باکی ان کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے، ان پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمان القرآن کا اداریہ لکھا۔ جنگِ عظیم دوم کے آغاز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس جنگ کے دونوں طرف طاغوت ہے۔ سید صاحب کے اپنے الفاظ میں ـــــــ "جس کو یہ حرکت کرنی ہو بہتر ہے کہ وہ مسلمان کے نام کو بٹہ لگانے کے بجائے کھلم کھلا انہی میں جا ملے جن کا وہ بول بالا کرنا چاہتا ہے۔[2]"

انگریز بہادر کی باندی، سر سکندر حیات کی پنجاب گورنمنٹ کو یہ بات ناگوار گزری۔ چنانچہ سنسر کرنے والوں نے یہ اداریہ قلمزد کر دیا۔ باقی ترجمان القرآن کا شمارہ پورا شائع ہوا اداریئے کی جگہ سفید اوراق تھے۔ سیّد صاحب کے عقیدت مندوں نے اس اداریئے کی قلمی نقول تیار کیں اور انہیں سفید اوراق میں جگہ دی۔ اس اداریئے کو اُنیس سال بعد فروری ۵۸ء میں شائع کیا جا سکا۔ اگر آپ اسے مکمل صورت میں دیکھنا چاہیں تو یہ مقالہ تفہیمات حصّہ سوم میں موجود ہے۔ اس کے دو اقتباسات سے آپ کو مقالے کا ہلکا سا اندازہ ہو سکے گا۔

---

[1] عاشق حسین بٹالوی: ہماری قومی جدوجہد ۳۸ء

[2] ترجمان القرآن۔ ستمبر ۳۹ء اشارات

اداریہ جو سنسر کی نذر ہو گیا

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

آخرکار وہ فساد جس کا مادّہ مدتوں سے پک رہا تھا زمین پر پھوٹ پڑا اور اس نے خشکی اور تری اور ہوا سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جن مفسد انسانوں اور متاعِ حیاتِ دنیا کی حریص جماعتوں کے ہاتھ میں اس وقت عالمِ انسانی کی باگیں ہیں، ان کے کرتوت آخرکار عذابِ الٰہی کی صورت میں نہ صرف خود ان پر مسلّط ہو کر رہے بلکہ اس دنیا کو بھی انہوں نے آگھیرا جس نے خدا کی بندگی چھوڑ کر ان مفسدوں کی بندگی قبول کر رکھی ہے۔ اب زمین پر وہ سب کچھ ہو گا جس پر خدا نے لعنت بھیجی ہے۔ بستیاں غارت ہوں گی، کھیتیاں اور نسلیں تباہ کی جائیں گی، انسانوں کو انسان بھیڑیوں سے بھی زیادہ درندگی کے ساتھ پھاڑے اور چیرے گا، بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور بیماروں تک کو امان نصیب نہ ہو گی، انسان نے صدیوں میں جو کچھ اپنی محنت اور ذہانت سے بنایا ہے، وہ آن کی آن میں بگاڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ کمزور قوموں کے آدمی زمین کے ہر گوشے سے کھینچ کھینچ کر لائے جائیں گے اور شیاطینِ مغرب کی قربان گاہِ حرص و ہوس پر ان کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ذبح کرا دیا جائے گا۔ غریب اور بے بس قوموں کی گاڑھی کمائیاں طرح طرح سے سونتی جائیں گی اور ان کو اس آتش بازی میں پھونک دیا جائے گا جو زمین کی خداوندی کے جھوٹے مدعیوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں شروع کی ہے۔

حقیقت میں تو یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ظلم و فساد کے امام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دامن مظلوموں کے خون سے سُرخ ہے۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال ان سب گناہوں سے سیاہ ہے جن کا الزام یہ ایک دوسرے پر لگاتے ہیں —— اب یہ لوگ پھر وہی خرقۂ سالوس پہن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے میدان میں ہم کسی خود غرضی کی بنا پر نہیں کُودے ہیں بلکہ ان اصولوں کی حفاظت کے لیے کُودے ہیں جو تمام عالمِ انسانی کی فلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا مقصد بین الاقوامی عدل اور

بین الاقوامی اخلاق کو تباہی سے بچانا ہے۔

یہ وعظ سن کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ"[1]

پھر سید مودودی صاحب نے لکھا کہ جنگِ عظیم دوم دراصل ان ناانصافیوں اور زیادتیوں کے نتیجے میں برپا ہوئی جو انگریز بہادر اور دوسری فاتح اقوام نے جنگ عظیم اول میں ہارنے والی قوموں پر روا رکھیں چنانچہ:

"ایک طرف وہ ترکی قوم جو پانچ سو برس تک مسلم دنیا کے ساتھ گہرے روحانی رابطوں میں بندھی ہوئی تھی ایک سخت قسم کے قوم پرستانہ مسلک کی پیرو بن گئی، اور اب تک اس کا توازن درست نہیں ہو سکا۔ دوسری طرف اسی بحران کی بدولت وہ عظیم الشان جرمن قوم جو دَورِ جدید میں سائنس اور فلسفہ اور علومِ اجتماع کی علمبردار رہی ہے اور جس کے علمی کارنامے اس عہد کی تاریخ میں سب سے زیادہ درخشاں ہیں، قوم پرستی کے انتہائی سخت جنون میں مبتلا ہو گئی۔ اور اس نے اپنے آپ کو اس جاہلانہ فلسفۂ حیات اور اس جابرانہ نظام سیاسی کے سپرد کر دیا جس کو معمولی حالات میں دنیا کی کوئی مہذب، تعلیم یافتہ اور صاحبِ عقل و خرد قوم قبول نہیں کر سکتی۔

پس جرمنی میں نازیت کا عروج اور اس پر جبر و قہر و استبداد کے دیوتا کا تسلط اور اس پر جنگجوئی و جہانگیری کے بھوت کا غلبہ، براہِ راست نتیجہ ہے ان لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی حرص و ہوس کا جو آج دعوے کرتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی عدل قائم کرنے اور جنگل کے قانون کو مٹا کر اخلاق اور تہذیب کا قانون نافذ

---

[1] ترجمان القرآن ستمبر ۳۹، اشارات

کرنے اٹھے ہیں۔ یہ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاس کی تفسیر ہے اور یہ تفسیر اب آگ اور خون سے لکھی جا رہی ہے[1]۔"

---

[1] ترجمان القرآن ستمبر ۳۹ء اشارات

باب ۱۴

مخالفت کا آغاز

پھر دارالاسلام

ترجمان القرآن کو جنگِ عظیم دوم سے بہت دھچکا لگا۔ کاغذ کی کمیابی سے پرنٹر اور پبلشر کو بہت دقت ہو رہی تھی۔ کنٹرول ریٹ پہ کاغذ بہت کم ملتا تھا۔ اس کے حصول میں بھی دشواریاں تھیں۔ بلیک مارکیٹ میں خریدنا اصول کے منافی تھا۔ سید مودودی صاحب کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ ان تین چار سال کی ترجمان کی فائلوں میں مجبور ہو کر سیّد صاحب نے اپنے قارئین کو اپنی دقتوں اور مجبوریوں سے کبھی کبھی آگاہ کیا ہے اسی وجہ سے ترجمان کے کئی شمارے شائع ہی نہ ہو سکے اور کئی دفعہ ناغے ہوئے۔

لیکن اس سے بڑھ کر سیّد صاحب کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اسلام کو اس کی پوری وسعتوں اور پوری ہمہ گیری کے ساتھ سمجھنے والوں کا ایک مختصر گروہ جمع کیا ہے۔ اسلام کو ایک انقلابی تحریک بنانے والے چند نفوس اکٹھے کیے ہیں۔ بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے ایسے لوگوں کو ایک جگہ مرکوز کیا ہے، جو اسلام کو محض رسوم و عبادات کا مذہب نہیں پوری

زندگی کا نظامِ حیات اور دین جانتے ہیں۔ اور وہ اس نظریۂ حیات کو مسندِ اقتدار پہ، کرسئ عدالت پہ، میدانِ جنگ میں، نظامِ تعلیم میں، کاروبار اور ناپ تول میں، ہر جگہ نافذ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ چند لوگ دین کی تجدید و احیاء کے لیے اُٹھے ہیں۔ کیا یہ اس اینگلو جاپان جنگ کی نذر ہو جائیں گے؟ کیونکہ جاپانی فوجیں کلکتہ پہنچ رہی تھیں اور وہ بنگال کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور ہندوستان کو اپنی آمد کی خبر سنا رہی تھیں۔ سیّد صاحب اس مختصر گروہ کو اس آفت سے بچانے کے لیے بے چین تھے۔ سیّد صاحب کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ سیّد صاحب کا خیال تھا کہ اگر جنگ خدانخواستہ بڑھتی ہوئی پنجاب تک آگئی، تو وہ یہ تک سوچ رہے تھے کہ جماعت کے ساتھیوں کو لے کر پٹھان کوٹ سے بھی اوپر پہاڑوں میں چلے جائیں۔ تاکہ پانچ دس سالوں بعد جب یہ ہنگامہ کسی طرح فرو ہو، تو یہ لوگ لوٹ کر آئیں اور پھر اپنے پیغام کو پھیلانے بڑھانے کی تدبیر کریں۔

یہی بات سیّد صاحب نے ترجمان القرآن میں لکھی "اس وقت جماعت کے پیشِ نظر یہ سوال بھی نہایت اہم ہے کہ دینِ حق کی خدمت کے لیے جو تھوڑی سی جمعیت ہم نے بہم پہنچائی ہے، وہ زندگی کے اس ہنگامہ میں منتشر نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مقامی جماعتوں کے امراء کو ہدایات بھیجی جا رہی ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو اور اپنی تمام قوتوں کو اللہ کی راہ میں وقف کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کو راہِ خدا کے سوا کسی کام میں ضائع کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ جس حد تک اس وقت انہیں اللہ کے کام میں استعمال کرنے کا موقع ہے، ہم پورا پورا استعمال کریں گے۔ اور جس حد تک اس وقت موقع نہیں ہے، آئندہ کسی بہتر خدمت کے لیے ان کو محفوظ رکھیں گے۔[۱]"

چنانچہ فروری ۴۲ء میں جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے مختلف مصالح کو پیشِ نظر رکھ کر طے کیا کہ ایک مرکزی ادارہ قائم کرنے کے لیے اگر کوئی مستقل مقام میسّر نہیں آتا تو سرِدست عارضی طور پر ہی سہی، ایک مرکز کہیں نہ کہیں بنا لیا جائے تاکہ جماعت اپنی قوت

---

[۱] ترجمان القرآن فروری ۴۲ء: اشارات

کے ایک معتدبہ حصّہ کو مجتمع کرسکے اور ضروری تعمیری کاموں کی بنا رکھ سکے۔ شوریٰ کے اس فیصلے کے پیش نظر ایسے مناسب مقام کی تلاش ہوئی اور پھر ضلع سیالکوٹ میں ایک مناسب مقام منتخب کر بھی لیا گیا اور بیرونی جماعتوں کو اس کی اطلاع بھی دے دی گئی۔ لیکن پھر سیّد صاحب نے قارئین اور جماعت اسلامی کے متاثرین اور ارکان کو ان الفاظ میں نئی اطلاع دی۔

"چند اسباب سے اس تجویز کو ترک کر دینا پڑا۔ اب مَیں نے ارکانِ شوریٰ کے مشورا سے پٹھان کوٹ کے قریب قریہ جمال پور کی طرف منتقل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں چوہدری نیاز علی صاحب نے ازراہِ عنایت اپنے وقف کی عمارات ہمیں مستعار دینا قبول فرمالیا ہے۔ انشاء اللہ ۱۵ جون تک میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ وہاں منتقل ہوجاؤں گا وہاں کا نیا پتہ یہ ہوگا ——— دارالاسلام جمال پور تحصیل پٹھان کوٹ ——— ریل یا موٹر بس سے وہاں پہنچنے کے لیے سرنا سٹیشن کا ٹکٹ لیا جاتا ہے، جو امرتسر پٹھانکوٹ لائن پر آخری سٹیشن ہے۔ یہ نقلِ مقام عارضی ہے سردست صرف جنگ کے لیے اس جگہ کو جماعت کا مرکز بنایا گیا ہے آئندہ جو اللہ کی مشیت ہو۔[1]"

اس طرح سیّد صاحب ایک مرتبہ پھر دارالاسلام پہنچ گئے۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی آمد

پروگرام یہ تھا کہ ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جو تحریکِ اسلامی کی علمی، فکری اور دینی رہنمائی کرسکے اور ملک میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا مرکز بن جائے۔ اس سلسلے میں طے ہُوا تھا کہ جماعت کے سربرآوردہ لوگ اس مرکز میں منتقل ہوجائیں گے، وہیں رہائش رکھیں گے، بال بچّوں کو لے آئیں گے، گویا تحریکِ اسلامی کے لیے کشتیاں جلا کر آئیں گے۔ ان بڑے لوگوں میں سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب بھی تھے۔ امین احسن اصلاحی صاحب بھی تھے، وہ دارالاسلام پہنچ گئے۔ سید مودودی صاحب بھی اپنا سازوسامان، کتابوں کی الماریاں، فرنیچر اور

---

[1] ترجمان القرآن۔ اپریل ۴۲ء

بیوی بچوں سمیت پھر ہجرت کر کے دارالاسلام پہنچ گئے۔ ان کوارٹروں کو پھر سے آباد کر دیا گیا اور سیّد صاحب اپنے لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب انہیں انتظار تھا کہ کسی روز نعمانی صاحب بھی اپنے سازوسامان اور بیوی بچوں سمیت یہاں 'ہجرت' کر کے آئیں گے اور زندگی کو تحریکِ اسلامی کیلئے وقف کر دیں گے۔ آخر ایک روز مولانا نعمانی صاحب بھی دارالاسلام پہنچ گئے۔

ان کے ساتھ کُل کائنات ان کا ایک اٹیچی کیس تھا![1]

غالباً سیّد مودودی کو ان سے یہ توقع نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نعمانی صاحب راہِ حق کے لیڈر ثابت ہوں گے اور آپ جانتے ہیں راہِ حق میں قدم قدم پر آزمائش، ایثار اور قربانی مطلوب ہوتی ہے۔ بیوی بچوں کی تکالیف، بیماری، جان و مال کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور یہاں پہلے قدم پر نعمانی صاحب محض ایک اٹیچی کیس میں چند کپڑے ڈال کر بریلی سے گویا ایک جائزہ لینے آئے تھے۔ اسی لیے سیّد مودودی نے ان کے خط کے جواب میں یہ لکھا تھا:

"مَیں نے اب تک یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ شریکِ کار ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس مَیں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کو اس کام میں وہ دلچسپی نہیں ہے جو آدمی کو اپنے کام سے ہوتی ہے۔ اس لیے مَیں نے ابھی تک آپ کو حقیقی صورتِ حال سے آگاہ بھی نہیں کیا ہے۔ کیونکہ (معاف کیجیے) مَیں آپ کو اب تک اس درجہ میں سمجھتا ہوں کہ جس اوکھلی میں مَیں نے سر دیا ہے اس کے دھمکوں سے آپ کو باخبر کر دوں، تو آپ اس میں میرے ساتھ اپنا سر رکھنے کے بجائے اُلٹے پاؤں بریلی واپس تشریف لے جائیں گے۔"

مولانا نعمانی مہمان خانے میں ٹھہرے۔ دوسرے رفقا سے گھل مل گئے۔ پٹھان کوٹ سطح مرتفع علاقہ ہے، یہاں اوسط سالانہ بارش پنجاب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جتنے دن نعمانی صاحب وہاں رہے، بارش اور ابر و باراں نے کچھ زیادہ ہی جلوے دکھائے نعمانی

---

[1] روایت مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب سلمانی جہانیاں۔

صاحب نے دیکھا کہ انہوں نے جس شخص کو احیائے اسلام کی تحریک کا قائد چُنا ہے، وہ سخت بارش اور کیچڑ زدہ گلیوں میں نمازِ باجماعت کے لیے مسجد میں نہیں پہنچا۔ حالانکہ ــــــ نعمانی صاحب کے خیال کے مطابق ــــــ اس منصب کی مناسبت سے موسم اور حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باجماعت نماز کے لیے مسجد میں ضرور پہنچیں۔ پھر نعمانی صاحب کو معلوم ہوا کہ سیّد مودودی کا تانگہ بھی ہے، تانگہ بان بھی ہے، گھر میں میز کرسیاں بھی ہیں، چینی کے برتن بھی ہیں، بیگم صاحبہ اور بچوں کی طرزِ بود و باش اور معاشرت و معیشت کا معیار بلند ہے۔ نعمانی صاحب کو احساس ہوا کہ ہمارے اسلاف کی تو یہ شان تھی کہ ان کے کپڑے پیوند لگے ہوتے تھے گھر میں دوسرے وقت کا کھانا نہیں ہوتا تھا، کئی کئی دن چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ نعمانی صاحب کو خیال ہوا کہ سیّد مودودی میں اسلاف والی بات کوئی نہیں۔ خالی کتابیں یہ اسلام پر اچھی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے عمل سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ یہ سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی طرح کوئی تحریک چلاسکیں۔

شکوک و شبہات

آپ جانیں غیبت کرنے میں کتنا مزہ ہے، عیب جوئی سے کتنی تسکینِ خاطر ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر قسم کے چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کی غیبت اور عیب جوئی کر کے اپنی اَنا کو تسکین دیتے ہیں اور اس عام حالت سے بلند صرف چند لوگ ہوتے ہیں جو اخلاقی لحاظ سے واقعی بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ نعمانی صاحب کو دائیں بائیں لوگوں نے سیّد مودودی صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتایا، اس بات کو نعمانی صاحب نے اپنے خط میں لکھا تو سیّد صاحب نے جواب دیا:

"آپ نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں، وہ آپ کے اپنے احساسات نہیں ہیں، بلکہ وہ روایات ہیں، جو میرے چند کرم فرما ایک مدت سے میرے متعلق پھیلا رہے ہیں، اور صرف آپ ہی سے نہیں بلکہ اکثر لوگوں سے نہایت ہمدردانہ اور خیر خواہانہ رنگ میں انہیں

بیان کرتے رہتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں کو بدگمان کرنے اور جماعت کے اندر بددلی پھیلانے میں ان حضرات نے کافی سعی کی ہے اور یہی نہیں تا ہنوز اس عنایت کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اب تک خود نہیں سمجھ سکا ہوں کہ یہ کس گناہ کی سزا ہے جو مجھے دی جا رہی ہے۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا، میں نے ان کے ساتھ ہمیشہ بھلائی ہی کی حتیٰ کہ ان کے ایسے قصوروں تک سے چشم پوشی کی ہے، جن پر میں سختی سے باز پرس کر سکتا تھا۔ لیکن ان کا طرزِ عمل میرے ساتھ یہ ہے کہ میری حرکات و سکنات کو خوردبین لگا کر دیکھتے رہتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب معنی نکال نکال کر اپنی مجلسوں میں اکثر موضوعِ گفتگو بنایا کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے سامنے نہایت اخلاص کے ساتھ انہیں بیان کرتے ہیں"

نعمانی صاحب نے امیرِ جماعت کو بہت قریب سے دیکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ انبیائے کرام کے طریقے پر نئی تحریک چلانے کا دعویٰ کرنے والے میں درویشی اور فقر نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان کی زندگی میں خوش پوشی، امارت اور بظاہر سہل پسندی ہے۔ انہوں نے سید صاحب کو صاف اور اُجلا لباس پہنتے ہوتے دیکھا۔ حالانکہ اسی دارالاسلام کی چھوٹی سی بستی میں جماعت کے دوسرے کارکن بہت معمولی مشاہرے پر کام کر رہے تھے۔ جماعت کے ایک اہم رکن نے نعمانی صاحب کو بتایا کہ ہم نے سید صاحب سے کہا کہ آپ ترجمان القرآن اور رسالہ دینیات بھی جماعت اسلامی کو وقف کر دیں اور جماعت اسلامی سے تنخواہ لیں تو مولانا مودودی نے جواب دیا "اگر میں یہ معیارِ زندگی نہ رکھوں تو میری بات میں وزن نہیں رہے گا"۔ —— سید صاحب نے اس بات کا جو جواب دیا تھا وہ پہلے گزر چکا ہے۔

پھر لوگوں نے نعمانی صاحب کو امیرِ جماعت کی انتظامی قابلیتوں کی تفصیل بتلائی اور تان اس بات پر آ کر توڑی کہ جماعت اسلامی کے لیے سید صاحب نے جو پریس خرید کیا ہے وہ پُرانا اور بوسیدہ ہے اور اس کی قیمت بہت زیادہ ادا کی ہے۔ اس کی خرید میں جو شاہ صاحب ذمہ دار تھے اور جن کی نگرانی میں اب پریس چل رہا ہے، ان کی دیانت داری مشکوک ہے۔ انہوں نے اتنے روپے کو خرد بُرد کیا ہے، لیکن سید مودودی نے کبھی باز پرس نہیں کی۔ سید

مودودی صاحب میں نہ مالی معاملات کی سُوجھ بُوجھ ہے نہ انتظامی قابلیت۔

نعمانی صاحب کے ان شکوک وشبہات کا جواب دیتے ہوئے سیّد صاحب نے لکھا "مالی معاملات کے متعلق یہ عرض ہے کہ پریس پر جماعت کا جو روپیہ صرف ہُوا ہے مَیں اپنے ذمہ لینے اور اس کو اپنی ذمّہ داری پر چلانے کے لیے تیار ہوں۔ جماعت کے بُک ڈپو کو مَیں ترجمان سے پہلے ہی الگ کر چکا ہوں، اب میرا خود یہ ارادہ ہے کہ چند ذمہ دار لوگ یہاں موجود ہوں تو مالیات پورے کے پورے ان کے حوالے کر دوں۔ مَیں نہ جماعت کا سرمایہ اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہوں، نہ بک ڈپو کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتا ہوں اور نہ مَیں اس بات ہی کو صحیح سمجھتا ہوں کہ جماعت کے سرمایہ کو تنہا اپنی صوابدید پر خرچ کروں۔ لیکن مجھے بتایئے کہ کون سے وہ ذمہ دار لوگ ہیں جو یہاں میرے ساتھ شریکِ کار بن کر رہنے کو تیار ہیں۔ رہے پچھلے حسابات تو مَیں آج سے نہیں تقریباً سال ڈیڑھ سال سے کہہ رہا ہوں کہ کوئی آدمی کام سنبھالنے والا دیجیے۔ مَیں شاہ صاحب کو الگ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر جو لوگ مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، نہ انہوں نے خود کام سنبھالا، نہ کوئی آدمی دیا۔ آپ اب مجھے کوئی آدمی دیں، مَیں ابھی شاہ صاحب کو رخصت کیے دیتا ہوں۔ مَیں ان کی خطاؤں سے واقف ہونے کے باوجود ان کو صرف اس لیے الگ نہ کر سکا کہ ان کی جگہ کسی اناڑی آدمی کو رکھتا تو دوسری بار اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا اب ہو رہا ہے"۔

مولانا محمد منظور نعمانی اپنے ڈیڑھ دو ہفتے کے دارالاسلام کے قیام کے بعد لوٹے تو وہ مایوس اور بددل تھے۔ جس شخص کے افکار وخیالات اور تحریر سے وہ اتنے متاثر تھے اسے قریب سے دیکھا تو نگاہ میں نہیں جچا۔ جماعتِ اسلامی کے باقی اراکین پہ نگاہ ڈالی تو کوئی بھی امیرِ جماعت کے منصب کے لیے موزوں آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نعمانی صاحب نے تفصیل سے سیّد مودودی صاحب کو خط لکھا، جس میں لکھا کہ آپ کی زندگی میں آپ کے منصب کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری نہیں ہے، آپ کا رہن سہن ایسا امیرانہ ہے کہ تحریک سے متاثر ہو کر اور اعلیٰ معیارِ زندگی کو ترک کر کے آنے والے بددل ہو جائیں گے۔ مالی معاملات کی سُوجھ بُوجھ اور انتظامی قابلیت آپ میں درجۂ مطلوب تک نہیں ہے،

آپ ایک اعلیٰ دار المصنفین اور ایک اعلیٰ دار العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں (اگرچہ یہ بھی غنیمت ہے)، اس سے آگے نہ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ احیائے اسلام کی تحریک چلانے کی اہلیت آپ میں نہیں ہے اور خود نعمانی صاحب اس بار کو اُٹھانے کی استعداد نہیں رکھتے۔ اس لیے انہیں بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سیّد مودودی صاحب نے اس خط کا مفصل جواب دیا جس کے کچھ اقتباسات پہلے آچکے ہیں۔ باقی کچھ اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

سیّد صاحب کا تاریخی خط

"محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کی تحریر میں نے رات کو ہی دیکھی۔ اس کے بعد سونا چاہا، مگر سو نہ سکا۔ اس لیے رات کو ہی لکھنے بیٹھ گیا۔ میرے لیے اس میں کوئی چیز رنج پہنچانے والی نہیں ہے۔ بلکہ میں خوش ہوں کہ آپ نے جو کچھ محسوس کیا اور سوچا سمجھا، اسے صاف صاف لکھ دیا۔ صرف افسوس اگر ہے تو اس کا، کہ آپ نے بات کے انتہائی حدود تک پہنچ جانے کے بعد مجھ سے رجوع کیا، ورنہ ابتدائی مراحل ہی میں آپ مجھے اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتے تو شاید حل اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا اب ہو گیا ہے۔ البتہ جس چیز نے مجھے نیند سے محروم کر دیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ میں برسوں کی سعی و جہد کو اس نتیجہ پر ختم ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل سے گوارا نہیں کر سکتا۔ اگر یہ سعی و جہد اپنی ذات کے لیے ہوتی تو خدا کی قسم اس سے بھی زیادہ کسی بُرے نتیجے پر اس کے ختم ہونے کی مجھے کچھ پرواہ نہ ہوتی۔ مگر جب کہ یہ خدا کے لیے اور اس کے دین کے لیے تھی تو میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں اس بدانجامی پر اس کے ختم ہونے کو اطمینان کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس لیے میں ایک آخری کوشش اس کے بچانے کی کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مصرف القلوب ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اور دوسرے لوگ جو ایک پہلو سے سارے معاملہ کو دیکھ رہے ہیں اگر ان کے سامنے وہ دوسرا پہلو بھی رکھ دوں تو شاید یہ کام بربادی سے بچ جائے۔

پہلا سوال جس پر آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والوں کو غور کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس کام کی طرف جس چیز کی کشش نے کھینچا وہ کیا چیز تھی؟ اگر وہ میری ذات کی کشش تھی تو وہ بجائے خود نہایت غلط چیز تھی۔ اس کی طرف آپ کو کھنچنا ہی نہیں چاہیئے تھا اور اب خدا کا بڑا فضل ہوا کہ وہ کشش باقی نہ رہی۔ ایسے ایک نامبارک تألّف و اجتماع سے لاکھ درجہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ سب بکھر جائیں۔ اور اگر وہ اقامتِ دینِ حق کے نصب العین کی کشش تھی اور اگر اس کی طرف کھنچنے کے لیے آپ لوگوں کو مجبور کرنے والی طاقت دراصل اس احساس کی طاقت تھی کہ اس نصب العین کے لیے کوشش کرنا مسلمان ہونے کا عین اقتضا ہے۔ اور اس کوشش کی صحیح صورت یہی ہے کہ اجتماعی طور پر کام کیا جائے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ محض ایک میرے نااہل ثابت ہو جانے سے آپ لوگ اس قدر جلدی اور آسانی سے بکھر جانے پر کیسے آمادہ ہو گئے......؟

سب سے پہلی بات جو آپ لوگوں کو قطعی طور پر طے کر لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کے لیے اجتماعی کوشش بہرحال کرنی ہے اور یہ کوشش جس مرحلہ تک پہنچی ہے یا پہنچ چکی ہے، اسے اس سے پیچھے نہیں جانے دینا ہے، بلکہ آگے بڑھانا ہے اور اس کے آگے بڑھانے میں جو چیز بھی سدِّراہ ہو اسے اٹھا کر پھینک دینا ہے۔ خواہ وہ امیرِ جماعت ہو یا اپنی جماعت کا کوئی رفیق ہو یا ہمارے باپ، بھائی، اولاد، اقارب ہوں یا ہمارے شخصی کاروبار اور وسائلِ معیشت ہوں۔

دوسری بات جو طے کر لینی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو اسباب و وسائل میسر ہیں ہمیں انہی سے کام لینا ہے کیونکہ ہم خدا کے سامنے انہی پر مسئول ہیں۔ اسباب و وسائل کی تعریف میں جس طرح روپیہ آلات اور مادّی قوی آتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی اسی تعریف میں آتے ہیں۔ جو انسان ہمیں میسر ہیں ہم کو اپنے مقصد کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے انہی سے کام لینا ہے۔ فرشتے لانے کے لیے ہم مکلّف نہیں ہیں، نہ یہ کسی نص میں تصریح ہے کہ اس معیار کے آدمی اگر فراہم نہ ہوں تو اقامتِ دین کی سعی کا فریضہ تم سے ساقط ہے۔ نہ یہ کہیں لکھا ہے کہ اقامتِ دین کی سعی اگر تم نے شروع کی اور کسی مرحلہ پر جا کر معلوم ہوا کہ فلاں

فلاں معیار کے اشخاص موجود نہیں ہیں تو جتنا کام تم کر چکے ہو اسے بھی فوراً ملیامیٹ کر دو، ورنہ خدا کے ہاں پکڑے جاؤ گے۔ ایسی کوئی ہدایت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں ہے، اپنی خود ساختہ شرطوں اور معیاروں کو لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔

ایک شخص اگر نالائق ثابت ہوا ہے تو پھر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور اسے ہٹا کر اپنے میں سے کسی دوسرے شخص کو لیڈر بنانا چاہیئے اور مسلسل کام کرتے رہنا چاہیئے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا شخص پیدا کر دے جس کی کاملیت پر سب لوگ یا بیشتر لوگ مطمئن ہو جائیں۔ بہر حال جو اشخاص موجود ہیں اور میسر آسکتے ہیں انہی میں سے کسی اصلح آدمی کو منتخب کرنا لازم ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یکے بعد دیگرے دس آدمی بھی میری طرح مایوس کُن ثابت ہوں تو ہم گیارہویں آدمی کو ان کی جگہ لے آئیں۔ میرا دل اس منطق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ تو نا اہل ثابت ہوا اور میں خود اپنے کو بھی نا اہل سمجھتا ہوں اور کوئی تیسرا آئے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں مجھ سے اور تجھ سے زیادہ نا اہل نہ نکل آئے لہٰذا یہ ساری بساط لپیٹ دی جائے۔

میرے اور آپ لوگوں کے نقطۂ نظر میں فرق صرف یہ ہے کہ میں اعلیٰ معیار کو کام کرنے کے لیے شرط نہیں سمجھتا، بلکہ صرف مطلوب سمجھتا ہوں، جسے حتی الامکان تلاش اور حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے، لیکن کم سے کم ناگزیر معیار تک جتنے لوگ بھی ملیں ان سے کام لینے میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

جہاں تک تقویٰ کا تعلق ہے، میں خود اس معاملہ میں اپنے اندر بہت کمی محسوس کرتا ہوں اور اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کبھی اس بات پر بُرا نہیں مانتا کہ کوئی شخص میری کسی غلطی یا کوتاہی یا گناہ کو دیکھے اور مجھے اس پر ٹوک دے۔ بُرا ماننا تو در کنار میں تو ایسے شخص کا شکر گزار ہوتا ہوں۔ لہٰذا جہاں جو کوتاہی بھی آپ لوگ دیکھیں، اس پر مجھے متنبہ کر دیں۔ اپنی اصلاح کے لیے میں خود کوشاں ہوں اور آپ لوگوں سے بھی مدد کا متوقع ہوں۔ البتہ یہ بات میرے لیے خلافِ توقع ہے کہ میری کمزوریوں کو اس کام ہی کے ختم کر دینے کے لیے حیلہ بنایا جائے۔

میری معاشرت کا جو معیار ہے اس میں جس قسم کا تغیر آپ حضرات کے نزدیک ضروری ہے اس کے متعلق مجھے بے تکلّف مشورہ دیجیے۔ اگر موجودہ حالات میں میرے لیے یہ ممکن ہؤا کہ بآسانی وہ تغیر کر سکوں تو بہتر ہے اور اگر مَیں نے یہ محسوس کیا کہ اس حد تک تغیر کو میرے اہل و عیال برداشت نہ کر سکیں گے، تو مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے۔ جو چیز بھی نصب العین کی راہ میں رکاوٹ ہوا سے میں راستہ سے ہٹا دوں گا خواہ وہ بیوی ہو یا اولاد یا کوئی اور چیز۔

مَیں چاہتا ہوں کہ قریبی تاریخوں میں جماعت کا ایک اجتماع کر لیا جائے اور اس میں پوری صورتِ حال پیش کر دی جائے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ میری اور آپ کی یہ تحریریں بھی پوری جماعت کے سامنے رکھ دی جائیں۔

ابُوالاعلیٰ "

پہلا بحران ختم ہؤا

سیّد صاحب کو ان دنوں جس ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ اس مکتوب کے ابتدائی فقروں سے مترشح ہے۔ افسوس کہ سیّد صاحب کا اتنا مفصّل، لمبا چوڑا خط، نعمانی صاحب کو اپنا ارادہ تبدیل کرنے پہ مائل نہ کر سکا۔ یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ نعمانی صاحب تحریکِ اسلامی کی صعوبتوں اور ایثار اور اگلے مراحل میں آنے والی مصیبتوں، طعن و تشنیع، تفسیق و تکفیر اور قید و بند کا اندازہ کر کے ہٹ گئے یا یہ کہ ان کے پندار نے گوارا نہ کیا کہ وہ ایک ایسے شخص کی قیادت کے تحت کام کریں جس کے تقویٰ و تدبر و تنظیم کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ نعمانی صاحب جماعتِ اسلامی کی بنیاد اٹھانے والوں میں صفِ اوّل کی شخصیت تھے۔ ابھی چند ماہ پہلے انہوں نے معترضین کے لیے ترجمان القرآن میں "جماعتِ اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت" کے عنوان سے ایک زوردار دفاعی مضمون قلم بند کیا تھا[1] لیکن دارالاسلام میں اپنے

---

[1] ترجمان القرآن۔ ستمبر ۴۲ء

قیام کے بعد ان کا دل ٹھکا نہیں۔

اکتوبر ۴۲ء کے دوسرے ہفتہ میں مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجتماع دہلی میں منعقد ہوا تاکہ جماعت اسلامی میں پیدا ہونے والے ان اختلافات کا حل تلاش کیا جائے۔ جو ابتدائی مرحلہ میں ہی جماعت میں پیدا ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ اقامتِ دین کی تحریک شروع ہوتے ہی ختم نہ ہو جائے۔ شوریٰ کے سامنے تین متبادل صورتیں پیش ہوئیں۔ سید مودودی صاحب نے کہا کہ میں استعفیٰ دیتا ہوں، میری جگہ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر لیا جائے۔ لیکن اختلاف کرنے والوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ جماعت میں جو لوگ شامل ہیں ان میں سے کوئی اس بار کو اٹھانے کا اہل نہیں ہے۔ دوسری تجویز بھی رد کر دی گئی کہ ایک شخص کی بجائے تین چار آدمیوں پہ امارت کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ اختلاف کرنے والے دل سے تیسری تجویز کے حق میں تھے کہ جماعت توڑ دی جائے۔ لیکن شوریٰ نے کثرتِ رائے سے اسے بھی رد کر دیا۔ چار اصحاب نے اختلاف پر قائم رہتے ہوئے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی[1]۔

نعمانی صاحب نے جماعت اسلامی کو چھوڑ دیا۔ سید صاحب کو ان لوگوں کے جانے کا کتنا قلق ہوا ہو گا، اس کا اندازہ سید صاحب کے اس جواب سے کیا جا سکتا ہے کہ جب سید صاحب سے کسی نے پچیس سال بعد یہ سوال کیا کہ تحریکی زندگی میں سب سے زیادہ سخت دن آپ کے لیے کون سا تھا۔ تو آپ نے جواب میں کہا "ایسے متعدد مواقع آئے ہیں جب مجھے خاص تکلیف پہنچی۔ مثلاً جماعت بننے کے تھوڑی ہی مدت کے بعد بعض حضرات جس طرح سے الگ ہوئے، وہ میرے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ حالانکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ تحریک اور جماعت کو ختم نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی مجھے اس سے بڑی روحانی اذیت پہنچی[2]"

نعمانی صاحب نے جماعت سے نکلنے کے بعد محاذ نہیں بنایا اور نہ ہی کبھی کھل کر

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۱، تا ۵،

[2] ہفت روزہ آئین۔ ۱۳ ستمبر ۶۷ء

مخالفت کی ۔ دبی دبی باتیں تو خیر کبھی کبھی الفرقان میں آتی رہیں ۔ لیکن وہ انفرادی طور پر اسلام کی خدمت کرتے رہے اور اب تک کر رہے ہیں ۔ الفرقان کے صدقۂ جاریہ کے علاوہ اسلام پر بھی انہوں نے خاصی کتب تحریر کیں ۔ وہ اپنا یہ خط جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، شائع کیا جانا پسند نہیں کرتے تھے ۔ لیکن جب الفرقان میں انہوں نے اپنی سرگزشت لکھتے ہوئے اس کی طرف اشارے کنائے کیے تو ماہنامہ چراغِ راہ نے ان کے خط کی تلخیص اور سید مودودی صاحب کا پورا خط شائع کر دیا کیونکہ مدیر کے الفاظ میں ——— یہ ایک تاریخی خط ہے اور ملت کی امانت ہے ۔

اس طرح جماعت اسلامی کا پہلا اندرونی بحران انجام پذیر ہوا ۔

مخالفت کا آغاز

لیکن مخالفت نہیں مخالفت کا تو ابھی آغاز ہی ہوا تھا ۔ اسی لیے سید صاحب نے لکھا "ہمیں تو امید تھی کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت کی تشکیل کا نام سُن کر کمیونسٹ اور سوشلسٹ کان کھڑے کریں گے، نیشلسٹ چونکنے ہوں گے، فرعونی اقتدار اپنا اسلحہ تیز کرے گا ۔ مگر یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ جہاں جہاں سے ہم مخالفانہ پیش قدمی کا اندیشہ رکھتے تھے، وہاں تو ابھی سکون ہے اور حملہ کا آغاز اس دین دار گروہ کی طرف سے ہو رہا ہے جس سے ہم اپنے آپ کو بالکل مامون سمجھ بیٹھے تھے اور اس حیرانی پر مزید حیرانی اس بات پر ہوئی کہ دینداروں میں سے بھی خاص طور پر وہ حضرات سامنے آ رہے ہیں جو سب سے پہلے خود بعینہٖ اسی کام کی ضرورت ظاہر فرما رہے تھے، جسے شروع کرنے کا ارتکاب ہم نے کیا ہے ۔ اور جن کی نگاہ میں ہم اس کام کے آغاز سے پہلے تک اہلِ ضلال میں سے نہیں بلکہ اہلِ رُشد و ہدایت میں سے تھے ۔"

کچھ دینی پیشواؤں کو یہ افسوس تھا کہ انہیں جماعت اسلامی میں شمولیت کی بطورِ خاص دعوت کیوں نہیں دی گئی، آخر وہ بھی تو نامی گرامی عالم ہیں ۔ مودودی نے اپنے حواریوں کو جمع کیا ہے، باہر کے بڑے لوگوں پہ جماعت اسلامی کے دروازے بند رکھے ہیں، تاکہ خود

امیرِ جماعت بن سکے۔ ایسے شبہات ایک پرچے میں شائع ہوئے تو سید صاحب نے ترجمان القرآن میں لکھا: "مئی ۴۱ء کے وسط تک میں انتظار کرتا رہا کہ جو لوگ ہم میں تقویٰ میں، تجربہ میں، سن و سال میں مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی صاحب اس کام کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ مگر کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی۔ آخر کار میں نے خود پیش قدمی کی اور جماعت اسلامی کے نظام اور پروگرام کا ابتدائی خاکہ پیش کیا۔ میں نے اعلان کیا کہ جو حضرات اس نصب العین سے اتفاق رکھتے ہیں وہ براہِ کرم مجھے اطلاع دیں۔ میں نے شخصی طور پر کسی سے حتیٰ کہ اپنے عزیزوں اور قریب ترین تعلقات رکھنے والوں سے بھی یہ نہیں کہا، نہ ہندوستان بھر میں کسی ایک شخص کو نجی خط لکھا کہ تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میری حیثیت ایک مؤذن کی سی تھی جو نماز کا وقت دیکھ کر حیّ علی الصلوٰۃ کی صدا بلند کرتا ہے ظاہر ہے کہ مؤذن کا یہ کام تو نہیں ہے کہ اذان دے کر ایک ایک شخص کے پیچھے دوڑتا پھرے۔ اس کا کام بس وقت پر فرض کی دعوتِ عام دے دینا ہے۔ پھر جس جس میں احساسِ فرض ہوتا ہے وہ آپ آتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جو لوگ واقعی بے تاب تھے، انہوں نے خود اس پکار پر لبیک کہا۔ ان میں سارے کے سارے کم رتبہ لوگ ہی نہ تھے بلکہ وہ بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی ناموری دے رکھی ہے۔"

ایک اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا "بعض لوگ میرے فقہی اور کلامی مسلک کو بعینہٖ جماعتِ اسلامی کا مسلک اور طریقہ سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر جماعت کی اصل تحریک پر گفتگو کرتے کرتے اکثر میری ذاتی آراء کی بحث درمیان میں چھیڑ دی جاتی ہے۔ گویا میری تمام آراء جماعت کی آراء ہیں۔ حالانکہ ہمارا اجتماع صرف عقیدے اور نصب العین پر ہے اور جو شخص بھی کسی وقت جماعت کا امیر ہو اس کی اطاعت صرف انہی امور میں ہے جو دستور کے مطابق نظامِ جماعت سے یا نصب العین کے لیے جدّوجہد سے متعلق ہوں۔ ان کے ماسوا دوسرے امور میں امیرِ جماعت کَاَحَدٍ مِنَ النَّاسِ ہے۔ وہ بھی ایک رائے رکھتا ہے اور دوسرے ارکانِ جماعت کو بھی رائے رکھنے کا حق ہے۔"

کسی کو یہ اعتراض تھا کہ سیّد صاحب جماعت اسلامی کے لیے تحریک کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ لفظ تو قوم پرستوں یا کمیونسٹوں کی تحریک کے لیے مستعمل ہے۔ دینی جماعت کے لیے مذہب یا دین کا لفظ ہونا چاہیئے۔ سیّد صاحب نے لکھا "تحریک کا لفظ جس مفہوم کے لیے میں استعمال کرتا ہوں اس کے لیے کوئی دوسرا ایسا لفظ مجھے نہیں ملتا جو آج کل کے عام لوگوں کے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دے۔ مذہب ایک مدت سے صرف اس معنی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے کہ چند عقائد اور چند عبادتوں اور رسموں کا مجموعہ، جن کی پابندی سے آدمی روحانی ترقی یا نجات بعد الموت کا متوقع ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے آج کل کے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب ایک انفرادی چیز ہے، اس کو اجتماعی معاملات اور مُلکی انتظام سے کیا تعلق۔ رہا دین، تو اسے بھی ایک مدت سے مذہب اور دھرم کا ہم معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تاہم دین کو اگر اس کے وسیع معنی میں بھی استعمال کیا جائے تب بھی سننے والے کے ذہن میں صرف اتنی بات ہی آتی ہے کہ یہ پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو عقائد و افکار سے لے کر انفرادی و اجتماعی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات تک کا احاطہ کرتا ہے۔

لیکن یہ بات کہ دین ایک نظام ہونے کی حیثیت سے، دنیا کا نظام خود اپنے زیرِ اقتدار لینے کا متقاضی ہے اور اس کے ایک نظام ہونے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ دوسرے نظاموں کو ہٹا کر یہ خود ان کی جگہ قائم ہو اور اس وجہ سے دین کی پیروی قبول کرتے ہوئے آدمی پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ دوسرے نظاموں کے تسلّط کو مٹانے اور اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرے، محض لفظِ 'دین' سُن کر آج کل کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔ اس مفہوم کو موجودہ دَور میں لفظِ تحریک اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں اسلام کے لیے دین کے ساتھ تحریک کا لفظ بھی اکثر استعمال کرتا ہوں۔ نیز اس کوشش اور جدوجہد کے لیے مجھے 'تحریک' ہی کی اصطلاح استعمال کرنی پڑتی ہے کیونکہ جہاد اور مجاہدہ کے الفاظ جو قرآن نے اس مفہوم کے لیے اختیار کیے ہیں، انحطاط کے دَور میں ان کے معانی بالکل بدل کے رہ گئے ہیں۔ مجاہدہ کا لفظ سُن کر آج کل کے لوگوں کا ذہن

صوفیانہ ریاضیات اور چلّہ کشی کی طرف چلا جاتا ہے اور "جہاد" بولیے تو لوگ سمجھتے ہیں بس ایک لشکر مرتّب ہوگا اور غنیم کے خلاف معرکۂ قتال شروع ہو جائے گا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "تحریک" کے نام سے جو چیز ہم نے پیش کی ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ اور دین ہی ہے یا کوئی اور چیز؟"

بہتان

مولانا عبدالماجد دریا بادی کا رسالہ "صدق" سیّد مودودی کے خلاف اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر رہا تھا اور پریس والے ایک شاہ صاحب کے، اور کچھ دوسرے اصحاب کے گمنام خطوط شائع کر رہا تھا۔ جن میں سیّد صاحب کی ذات اور ان کے افکار کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا تھا۔ سیّد صاحب نے ترجمان میں جواب دیا "ان شاہ صاحب کی تحریریں جو مولانا شائع فرما رہے ہیں، انہیں دیکھ کر تو مَیں حیران رہ گیا ہوں۔ کیا واقعی مَیں خدا سے جنگ کر رہا ہوں کہ مجھے محاربِ خدا قرار دیا جا سکے؟ کیا حقیقت میں کوئی دعویٰ مَیں نے کیا ہے کہ مجھے مدعیٔ کاذب کا لقب دیا جا سکے؟ کیا مَیں نے خود اپنی کوئی شریعت بنائی ہے کہ مجھ پر تاسیسِ دین کا الزام عائد کیا جائے اور میرے رفقاء کو "امرائے شریعتِ مودودی" کے خطاب سے مخاطب کیا جائے؟

کیا مولانا عبدالماجد صاحب ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس قدر بہتان وہ "صدق" میں شائع کر رہے ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی ذرّہ برابر حقیقت ہے؟ اگر ہے تو بے جا مروت سے کام نہ لیں بلکہ پورے ثبوت کے ساتھ ان الزامات کو پیش فرمائیں اور میری تکفیر کر دیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر الزام ایسا ہے جس کی اگر کچھ بھی حقیقت ہو تو موجبِ کفر ہے۔ اور اگر ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو مَیں کہتا ہوں کہ کوئی شخص جس کے دل میں کچھ بھی خوفِ خدا اور آخرت کی بازپُرس کا خیال ہو اس قسم کے بے بنیاد بہتان اپنی ذمہ داری پر شائع نہیں کر سکتا۔ اخبار نویسی کا یہ آئین ضرور ہے کہ اپنے صفحات مختلف خیالات کے اظہار کے لیے کھُلے رکھے جائیں۔ مگر اس کے یہ معنی

نہیں ہیں کہ اس کے صفحات ہر جھوٹ اور ہر تہمت اور ہر اس بے ہودہ چیز کے لیے کھلے رہیں جو کوئی شخص کسی کے خلاف لکھ بھیجے۔

مولانا عبدالماجد اگر راستی اور عدل اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کرنا پسند فرماتے تو ان کے لیے یہ راہ کھلی ہوئی تھی کہ جن امور میں وہ مجھے غلطی پر سمجھتے ہیں ان کو صاف صاف بیان کر دیتے اور تعیین کے ساتھ یہ بتاتے کہ میں نے کہاں، کس مسئلے میں حق سے تجاوز، یا دین کی راہِ راست سے انحراف کیا ہے۔ اس صورت میں میرے لیے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع تھا۔ اگر ان کے اعتراضات کسی غلط فہمی پر مبنی ہوتے تو میں اسے رفع کرتا، اگر ان کے دلائل صحیح ہوتے تو میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا، اور اگر میرے اور ان کے درمیان کوئی اختلاف باقی رہتا تو اہلِ علم آسانی کے ساتھ رائے قائم کر سکتے تھے کہ کون راستی پر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس سیدھے اور صاف راستے کو اختیار کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک طرف شاہ نذیر احمد صاحب کے خطوط شائع فرما رہے ہیں اور دوسری طرف گمنام لوگوں کے خطوط سے اقتباسات نقل کر کے میرے خلاف عجیب عجیب بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے شاہ صاحب ایک ناخدا ترس اور غیر ذمہ دار آدمی ہیں، وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے الزامات تراش سکتے ہیں، روز نت نئے بہتان گھڑ سکتے ہیں، میرے ایک فقرے سے بیسیوں ایسے معنی نکال سکتے ہیں جو میرے خواب و خیال میں بھی نہ ہوں اور اپنے تخیل سے بے شمار نظریات تصنیف کر کے میری طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ ایسے مردِ آزاد کے مقابلے میں تو میرے لیے اعترافِ شکست کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے، میں کہاں تک اس کے ساتھ ہر روز ایک نئی وادی میں بھٹکتا رہوں۔

رہے وہ اقتباسات جو کسی 'فاضل اور نامور خادمِ دین' اور کسی صاحبِ علم اور کسی غالی مخالف کے خطوط سے نقل فرمائے جاتے ہیں، تو وہ سب کے سب دلائل سے خالی اور بے ثبوت دعووں پر مشتمل ہیں۔ اگر یہ فضلا اور صاحبانِ علم اور نامور خادمانِ دین، پردوں کے پیچھے سے نکل آتے اور صاف صاف بیان کرتے کہ میں کیا فتنہ برپا کر رہا ہوں اور میں نے کس

(نتیجۂ تدبّر فی السیاسیاتِ الحاضرۃ و ثمرۃٔ تفکّر تشریعات اروپا)، کو کھینچ تان کر زبردستی قرآن پر منطبق کیا ہے، تو میری اصلاح بھی ممکن تھی اور خود ان کی اصلاح کا بھی امکان تھا۔ لیکن اب کہ وہ پردہ نشین ہیں اور ان کے صرف دعاوی 'صدق' ہیں نقل کیے جا رہے ہیں۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ سب میرے خلاف شکوک پیدا کرنے کی ہوشیارانہ نفسیاتی تدبیریں ہیں اور میرے لیے اس سطح تک اترنا مشکل ہے جہاں ایسی تدبیروں کا جواب دیا جاسکتا ہے۔"

اس کے بعد سیّد صاحب کا عمومی طرزِ عمل یہی رہا کہ انہوں نے اپنے معترضین کے اصولی اعتراضات کے علاوہ کبھی فضول اعتراضات کے جواب میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور اس وقت کو تعمیری کاموں میں صرف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہزار مخالفتوں کے باوجود قافلۂ راہِ حق آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ ایک دفعہ سیّد صاحب نے کہا "پھر بھی جو لوگ ہمارا دامن پکڑ کر ہمیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں دامن کا اتنا حصّہ چاک کر کے حوالے کرتے ہیں کہ لیجئے آپ اپنا شوق پورا کیجئے ہم تو آپ کے لیے اپنا راستہ کھوٹا کرنے سے رہے[1]"

---

[1] تقریر جلسۂ عام ڈیرہ اسمٰعیل خاں ستمبر ۶۳ء

باب ۱۵

تفہیم القرآن

آئندہ نسل کا حق

"قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت و سعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مصرف نہیں .... میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں روحِ قرآن تک پہنچنے اور اس کتابِ پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین و مفسرین کی قابلِ قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت میں بھی کر سکتا ہوں[1]۔"

سید صاحب نے مندرجہ بالا الفاظ تفہیم القرآن کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ انہوں

---

[1] تفہیم القرآن۔ حصہ اوّل صفحہ ۵۔

نے قرآن پاک کا ترجمہ کرتے ہوئے لفظی ترجمے والا قدیم طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے بجائے انہوں نے عربی مبین کی بامحاورہ، سلیس اور مربوط اردوئے مبین میں ترجمانی کی ہے اور اس طرح ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانی عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیرِ کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایسی بے جان عبارت ملتی ہے، جسے پڑھ کر نہ اس کی رُوح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اُترتی چلی جارہی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصّہ ہے، اس کے ادب کا بھی حصّہ اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دِل سے سنگ دل آدمی کا بھی دِل پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہِلا دی تھی۔ جس کی قوّتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سُنے گا وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اہلِ عرب کے دِلوں کو گرمانے اور زمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی حاصل نہ ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی"[1]

پھر سید صاحب نے تفہیم القرآن کے مقدمہ میں ان اُلجھنوں کو صاف کیا ہے جو قاری کے ذہن میں بار بار پیدا ہوتی ہیں کہ قرآن پاک کی کتاب ہماری عام کتابوں سے مختلف کیوں ہے۔ اس کا موضوع کیا ہے؟ اس میں ترتیب اور تبویب کیوں نہیں؟ یہ وحیِ الٰہی جمع ہوکر کس طرح مدوّن ہوئی؟ سید صاحب نے ایسے تمام سوالات کا شروع میں ہی تسلی بخش جواب دے دیا ہے۔ یہ مقدمہ "قرآن فہمی کے بنیادی اصول" کے نام سے الگ پمفلٹ کی صورت

---

[1] تفہیم القرآن۔ ج ا ص،

میں بھی شائع ہوا ہے اور سید صاحب کی دینی بصیرت اور فہمِ قرآن کا منہ بولتا شاہکار ہے۔

سید صاحب نے ۴۲ء سے تفہیم القرآن لکھنی شروع کی۔ اس وقت سے اس کی قسطیں ترجمان القرآن میں شائع ہو رہی ہیں۔ اوسطاً ایک پارہ ایک سال میں لکھا گیا ہے۔ تفہیم کے آغاز کو تیس سال ہو چکے ہیں اور اب بس آخری پارے کی تفہیم لکھی جا رہی ہے۔ تاہم اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر سید صاحب کو اس کی تکمیل کی ہمیشہ فکر رہی۔ خصوصاً ان آخری سالوں میں جب کہ خرابیٔ صحت سے ان کی کارکردگی متاثر ہوئی ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ خدا کو منظور ہو اور زندگی وفا کرے تو وہ اسے ضرور مکمل کر سکیں۔ ۶۳ء میں انہوں نے اپنے جیل کے ساتھیوں سے اس خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ بھئی آپ (یعنی جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار) لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ مجھے تفہیم القرآن کی تکمیل کے لیے (جماعتِ اسلامی کی دوسری ذمہ داریوں سے) فارغ کر دیں۔[1]

سید صاحب تفہیم کو لکھتے ہوئے اسلاف کی تمام عظیم تفاسیر کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ تفسیر کی امہاتِ کتب کو بالالتزام دیکھتے ہیں۔ جن میں علامہ جار اللہ زمخشریؒ کی 'الکشاف عن حقائق التنزیل' علامہ ابن کثیرؒ کی تفسیر القرآن العظیم، علامہ ابن جریر طبریؒ کی جامع البیان، امام رازیؒ کی مفاتیح الغیب یعنی تفسیر الکبیر، علامہ آلوسیؒ کی روح المعانی، ابوبکر جصاصؒ کی احکام القرآن اور ابن العربی مالکیؒ کی احکام القرآن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں فقہی مسائل آجاتے ہیں ان میں مذاہبِ اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) کے ائمہ کی لکھی ہوئی اصل کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کیونکہ سید صاحب علمی تحقیق کے لیے اصل مآخذ کی طرف ضرور رجوع کرتے ہیں۔ تفاسیر، فقہی مآخذ اور دوسری کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے سید صاحب الگ الگ کاغذات پر ان کے نوٹس لیتے رہتے ہیں اور تفہیم لکھتے ہوئے انہی کاغذات کو سامنے رکھتے ہیں۔ کئی دفعہ ضروری مطالعہ پہ دنوں اور ہفتوں لگ جاتے ہیں۔ مثلاً 'رہبانیت' پہ تفہیم لکھنے سے پہلے اس موضوع پہ مطالعہ و تحقیق میں قریباً چار ماہ صرف ہوئے۔ پھر کہیں جا کر آپ نے تفہیم کے اس حاشیہ کو سپردِ قلم کیا۔ ایسے حاشیے

---

[1] خورشید احمد: تذکرۂ زنداں۔

تفہیم القرآن میں بکثرت موجود ہیں جو بذاتِ خود ٹھوس علمی مقالے بلکہ رسالے ہیں مثلاً سورۂ نور کے حواشی پہ نظر ڈالیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے علمِ فقہ کے سمندر سے گراں مایہ موتیوں کو نکال کر لڑی میں پرو دیا ہے۔

عصر تا مغرب کی مجلس میں مئی ۱۹۶۹ء میں ایک شام سیّد صاحب نے بتایا "میں نے اپنے (دن رات کے) وقت کو تین حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ تین حصّوں سے مراد برابر کے حصّے نہیں ہیں بلکہ وقت کی ایک کھُلی تقسیم مراد ہے۔ ایک حصّہ تو روزمرّہ کے ملکی اور جماعتی مسائل کے لیے ہے۔ ایک حصّہ موجودہ نسل کے لیے ہے اور ایک حصّہ آئندہ نسل کے لیے ہے اور تفہیم القرآن کی تصنیف میرے نزدیک مجھ پر آئندہ نسل کا حق ہے جسے میں موجودہ نسل کے لیے قربان نہیں کرنا چاہتا[1]"

جس کتاب کو سیّد صاحب نے آنے والی نسلوں کے لیے لکھا ہے اسے مستند بنانے کے لیے انہوں نے تین ماہ سے زائد عرصہ کا ایک علمی اور تحقیقاتی سفر کیا اور مقاماتِ قرآن دیکھے۔ سعودی عرب اور اردن کی حکومتوں نے پوری سہولتیں فراہم کیں اور ان کے حکمرانوں نے سیّد صاحب کو شاہی مہمان رکھا، چنانچہ سیّد صاحب نے یہ مقامات دیکھے:۔ درعیہ جہاں محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت کا مرکز تھا، عقربا جہاں مسیلمہ کذاب نے خالدؓ بن ولید سے شکست کھائی، ثقیفہ بنی ساعدہ، حضرت ابو ایوب انصاری کا گھر، موتہ، یرموک، شمیسی جہاں صلح حدیبیہ ہوئی، دار الارقم، مولدِ رسولؐ، شعبِ ابی طالب، جبلِ نُور اور غارِ حرا، کوہِ ثور، طائف کے کھنڈرات، مسجد الخیف، کوہ احد کی جبل الرماۃ جہاں حضورؐ نے پچاس تیر اندازوں کو مقرر کیا تھا، خیبر، مدائنِ صالح کے آثار، تبوک، عقبہ جہاں اصحاب السبت مچھلیاں پکڑتے تھے، وادیٔ موسیٰؑ، بطرا، وادیٔ سینا اور عیونِ موسیٰ، وادی فاران، جبل موسیٰؑ اور مقامِ ہارون وغیرہا ——— اسی تحقیقی اور علمی سفر کا یہ نتیجہ ہے کہ تفہیم القرآن میں ان جگہوں اور آثار کے فوٹو دیئے ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں تازہ ترین معلومات جمع

---

[1] ہفت روزہ آئین: ۵ر جون ۶۹ء

کر دی گئی ہیں جن کا ذکر متن میں آتا ہے[1]

دل کے دُور کونے سے نجانے ایک خیال کیوں ابھرتا ہے کہ جب تفہیم القرآن مکمل ہوگی تو دو میں سے ایک بات ہوگی۔ اس عظیم تصنیف کی تکمیل کے بعد قدرت اپنی باہیں پھیلادے گی کہ ابوالاعلیٰ تم نے اپنا فرض بہت اچھی طرح انجام دیا اب آؤ کہ تمہارا کام مکمل ہوا۔ یا پھر شاید یہ ہوگا کہ حالات بس اس انتظار میں ہوں گے کہ سید صاحب اپنے علمی کام کے اس ہمالہ سے فارغ ہو جائیں تو تحریکِ اسلامی سب سے بڑے اور آخری مرحلے میں یعنی تعمیرِ اسلامی ریاست کے مرحلے میں داخل ہو، جہاں سید صاحب کی مکمل توانائیوں، توجہات اور ہمہ وقت قیادت کی ضرورت ہوگی خدا کرے یہی دوسری بات ہو۔

قرآن فہمی کے اُصول

تفہیم القرآن کا دیباچہ قرآن فہمی کا دروازہ ہے۔ اس میں سید صاحب نے علمِ قرآن حاصل کرنے کے لیے بنیادی اصول بتائے ہیں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کا:

"موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کی خسران کس چیز میں ہے۔

اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دنیوی زندگی کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں اور ان نظریات کی بنا پر جو رویے اختیار کر لیے ہیں، وہ سب حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کُن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتادی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم صحیح رویہ کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] محمد عاصم: سفرنامہ ارض القرآن

اس کا مدّعا انسان کو اس صحیح رویّہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔ ان بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے[1]۔"

پھر قرآن پاک کو بیک وقت نازل نہیں کیا، تحریک محمدی کو جس موڑ پہ ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی، اللہ تعالیٰ اسی کے مطابق آسمانی ہدایت بھیج دیتا۔

"شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں، نہایت پُراثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی: تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوں اور زبانیں اُن کے حُسنِ تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان نو کی جا رہی تھیں عالمگیر صداقتیں مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں، جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انہی کی تاریخ، انہی کی روایات، انہی کے روزمرّہ مشاہدہ میں آنے والے آثار اور انہی کی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی: تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں[2]۔"

جب نبی کریمؐ کی دعوت کچھ لوگوں نے قبول کر لی تو اسلام اور جاہلیت کی جاں گُسل کشمکش شروع ہو گئی۔" اس طویل اور شدید کشمکش کے دَوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبیؐ پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے

---

[1] تفہیم القرآن حصّہ اول ص ۱۹

[2] ایضاً ص ۲۱

ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنّت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدّوجہد کرنے پر ابھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے[1]۔"

پھر پیغمبرِ خدا کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو کر مدینہ میں ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی اس وقت ہدایت و رہنمائی کی آیات کا:

"انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور مدنیتِ صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شعبوں کو کن اصول و ضوابط پر قائم کیا جائے، منافقین کے ساتھ کیا سلوک ہو، ذمّی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہلِ کتاب سے تعلّقات کی کیا نوعیت رہے، برسرِ جنگ دشمنوں اور معاہد قوموں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور منظم اہلِ ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوندِ عالم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح تیار کرے[2]۔"

چنانچہ ـــــــ "دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تیئس سال کی مدّت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصّے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصّے

---

[1] تفہیم القرآن حصّہ اول۔ ص ۲۲۔

[2] ایضاً۔ ص ۲۴۔

نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے۔ بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے تھے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے۔ اس لیے ان کا اسلوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی۔ جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے، ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم ابھارنا، دشمنوں کو دوست اور منکروں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور ان کی اخلاقی طاقت کا استیصال کر دینا، غرض اسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور تحریک کے لیڈر کے لیے ضروری ہے۔[1]"

اور قرآن پاک سمجھنے کے لیے یہ بات ایسی لکھی ہے جو دل میں اتر جاتی ہے، انسان کو عمل پہ ابھارتی ہے اور اس کے دل میں یہ ولولہ بیدار کرتی ہے کہ وہ خود بھی حضور نبی کریم ؐ کے نقشِ قدم پہ چلتا ہوا لوگوں کو اسلام کی دعوت دے تاکہ وہ قرآن اور اس کے معانی کی گہرائی کو پاسکے۔

"فہمِ قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی رُوح سے پوری طرح آشنا نہیں ہو پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ اسے تو پوری طرح اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیں۔ اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن

---

[1] تفہیم القرآن حصہ اوّل۔ ص ۲۵

کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے بھی آپ دیکھ لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین، آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں[1]۔"

اُس صدی کی ایک عظیم تصنیف

آپ ذرا تصور کریں جب آج سے پچاس سال بعد یہی تفسیر دنیا کی پچاسوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر چار دانگِ عالم میں فیضِ عام دے رہی ہوگی۔ جدید فقہی مسائل اور سائنس کے چیلنج اور غیر اسلامی اجتماعی نظریات کی پیدا کردہ مشکلات کا حل ڈھونڈنے کے لیے کروڑوں مسلمان اور مفکّرینِ قرآن کی طرف رجوع کریں گے تو انتہائی سلیس، دلنشین اور عام فہم اندازِ بیان میں یہ تفسیر انہیں قرآن کے چشمۂ صافی سے بھر بھر کر جام پلائے گی اور ان کی علمی تشنگی کو دور کر کے انہیں علم و حکمت اور نورِ ایمان سے معمور کر دے گی۔ اسی لیے سیّد صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے تفہیم القرآن آنے والی نسلوں کے لیے لکھی ہے۔

آئندہ نسلیں تفہیم القرآن کا مطالعہ کریں گی تو انہیں احساس ہوگا کہ یہ تو علومِ اسلامی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ تفہیم القرآن کے ہر حصّے کے آخر میں حروفِ ابجد کی

---

[1] تفہیم القرآن حصّہ اول۔ ص ۳۳

ترتیب سے بڑی محنت سے فہرستِ موضوعات مہیّا کر دی گئی ہیں۔ تمام حصص کی فہرستوں کو یکجا کر کے ہر موضوع پر سیّد صاحب کے لکھے ہوتے حواشی کو جمع کر لیا جائے اور انہیں اہلِ علم و قلم حضرات ضروری ترتیب دینے اور ربط قائم کرنے کے بعد مقالوں کی صورت میں مرتب کریں تو ان مقالات کا ٹھوس علمی کام، سیّد صاحب کے باقی رشحاتِ قلم کے مجموعے سے کسی صورت کم نہیں ہوگا۔ مثلاً احکام القرآن، اخلاقی تعلیمات، اسلام کا اجتماعی نظام، اسلامی قانون و دستور، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور حقوق و فرائض پہ سیّد صاحب کے تفہیمی حواشی کی مدد سے سینکڑوں اور ہزاروں صفحات کے مقالے مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن، توحید، شرک، رسالت، شریعت اور آخرت کے بارے میں تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے انہیں یکجا پڑھ لیا جاتے تو محسوس ہوگا کہ یہ مطالعہ کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ قدیم اقوام، آسمانی کتب اور انبیائے کرام کے بارے میں سید صاحب کو تفصیل سے الگ لکھنے کا موقعہ بھلا کہاں ملنا تھا، تفہیم القرآن کے بہانے ان کے قلم سے یہ شہ پارے بھی رقم ہو گئے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر تفہیم القرآن کے ذریعے سیّد صاحب کے قلم نے سیرت النبیؐ پہ قابلِ رشک اور گراں بہا کام کیا ہے۔ سیّد صاحب کے قریبی حلقے کو معلوم ہے کہ ان کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ سیرت النبی پہ کتاب لکھیں۔ یہ امید بظاہر پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ تفہیم القرآن کی تکمیل، جماعتِ اسلامی کی تنظیم اور سیاسی مصروفیات کے بعد اس کام کے لیے وقت نکالنا مشکل نظر آتا ہے۔ تاہم تفہیم القرآن کے ضمن میں انہوں نے سیّد البشرؐ اور خیر الانامؐ کی سیرت پہ ایمان افروز انداز میں کافی تفصیل سے اور بہت خوب لکھا ہے۔ انہوں نے قاری کے دل میں محمد رسول اللہ کی محبت اجاگر کی ہے۔ مکّی اور مدنی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے سیرت النبی کے مختلف پہلوؤں کو نکھارا ہے۔ قدم قدم پہ دلائلِ نبوّت دے کر رسالت پہ ایمان کو عین الیقین بنا دیا ہے اور پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ وحی و پیغمبر، قرآن و رسول اور کتاب و سنّت لازم و ملزوم ہیں۔ سیّد صاحب نے ہر سورۃ کے تعارف میں اور تفہیمی حواشی کے ذریعہ سیرت النبیؐ پہ اتنا کچھ لکھا ہے کہ انہیں تاریخی ترتیب اور باہمی ربط دینے کے بعد جمع کیا جاتے تو سیرت النبیؐ کے موضوع پہ ایک تحقیقی، ضخیم،

بے مثال اور انمول کتاب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

تفہیم القرآن کے اس انسائیکلو پیڈیائی اور عظیم علمی کارنامے کو عوام تک پہنچانے کے لیے اجتماعی کوشش کی ضرورت ہے۔ مثلاً کوئی اکیڈیمی قائم کی جائے۔ اس کام کی تکمیل اسلامی علوم و افکار کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہو گا۔ اس ضمن میں نعیم صدیقی صاحب کچھ کام کر رہے ہیں۔ ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ تفہیم القرآن کو عام کتابوں کی طرح چھوٹے سائز میں اور کم حجم والی زیادہ جلدوں میں شائع کیا جائے تاکہ قاری کو مطالعہ کرنے میں آسانی رہے۔ اس کی طباعت اعلیٰ ہو اور کاغذ عمدہ ہو ان سب خوبیوں کے ساتھ اس کا ہدیہ اتنا کم ہونا چاہیئے کہ دنیا کا کوئی پڑھا لکھا مسلم گھرانہ ایسا باقی نہ رہے جس میں یہ انمول موتی نہ ہو جس کی حیثیت سیّدِ محترم کی تصانیف کے جواہرات میں یقیناً کوہ نور ہیرے کی سی ہے۔ تفہیم القرآن کے ضمن میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایسا سادہ اور مترجم قرآن پاک شائع کیا جائے جس کا اردو ترجمہ تفہیم سے لیا جائے اور ضروری حواشی کی انتہائی مختصر تلخیص حاشیہ پر دے دی جائے یعنی یہ مترجم قرآنِ پاک ہر گھر میں صبح و شام پڑھنے کا کام دے سکے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ کام زیرِ ترتیب ہے۔

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن فہمی میں اس کتاب سے بہت مدد ملی ہے۔ علماء کے طبقے کا بھی یہ تاثر ہے کہ اگرچہ یہ تفسیر عام پڑھے لکھے انسانوں کے لیے لکھی گئی ہے تاہم اس سے علماء بھی استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ضلع شکارپور کے ایک مشہور عالمِ دین ہیں وہ قرآن پاک کی قدیم تفاسیر کو بڑے اشتیاق سے دیکھا کرتے تھے لیکن بعض مقامات پر الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے اور مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہ ملتا تھا۔ اسی اثنا میں انہیں تفہیم القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پھر وہ جماعت کے بہت قریب آگئے اور بعض علماء کے منع کرنے کے باوجود رکن بھی بن گئے۔ انہوں نے کہا میرے ذہن میں کئی الجھنیں تھیں، قدیم تفاسیر دیکھنے پر بھی ان کے بارے میں اطمینان نہ ہوا تھا، الحمدللہ کہ تفہیم القرآن دیکھنے کے بعد میری وہ ساری الجھنیں ختم ہو گئی ہیں۔ میری عمر اب کافی ہو چکی ہے اگر مولانا مودودی کی تفہیم دیکھنے کا موقع نہ ملتا تو ہو سکتا تھا کہ ساری الجھنیں ذہن میں لیے ہوتے میں یُوں ہی دنیا سے

رخصت ہو جانا، خدا کا شکر ہے کہ اب میں اطمینانِ قلب کے ساتھ یہاں سے جاؤں گا۔[1]

ایک دفعہ ایک صاحب نے سیّد مودودی صاحب سے پوچھا "مولانا! آپ کو اپنی کتابوں میں سے کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے؟" تو آپ نے کہا کہ یہ سوال عجیب سا ہے۔ مصنف کو تو اپنی ساری ہی کتابیں پسند ہوتی ہیں۔ سائل نے پھر اصرار کیا کہ صرف ایک کتاب کا نام بتائیے تو سیّد صاحب نے تفہیم القرآن کا نام لیا اور کہا اس پر میں پچھلے قریباً ستائیس سال سے محنت کر رہا ہوں اور ابھی دو تین سال اور لگیں گے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ سیّد صاحب کے علمی کارنامے کا سنگِ بنیاد الجہاد فی الاسلام ہے تو اس کارنامے کا سنگِ تکمیل تفہیم القرآن ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں عصرِ حاضر کے جس عظیم ادیب کا حرفِ اوّل الجہاد فی الاسلام ہے تفہیم القرآن اس کا حرفِ آخر ہے۔ آپ اس رائے سے اتفاق رکھتے ہوں یا نہیں بہرحال ایک صاحب کی رائے کے مطابق یہ اس صدی کی ایک عظیم تصنیف ہے۔[3]

آپ تفہیم القرآن اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ہر سورہ کے آغاز میں سورہ کا نام اور وجہ تسمیہ، زمانۂ نزول، شانِ نزول، اجزائے مضامین، خطاب اور مباحث کے عنوانات سے سورہ کا مختصر لیکن ضروری تعارف دیا ہوا ہے۔ جس سے قاری کے لیے فہم قرآن آسان ہو جاتا ہے۔ پھر سیّد صاحب کی خوبی یہ ہے کہ بات ایسے دلنشیں پیرائے میں لکھتے ہیں کہ دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً آپ سورہ فاتحہ کے تعارف میں پڑھتے ہیں:

"قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مقدمہ کا سا نہیں بلکہ دُعا اور جوابِ دُعا کا سا ہے۔ سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے، بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔

---

[1] ہفت روزہ آئین: ۱۶؍ جون ۶۸ء

[2] ایضاً: ۱۶؍ جون ۶۸ء

[3] ایضاً: ۷؍ جون ۶۹ء

جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے[1]"۔

آپ اسے پڑھتے ہیں، ذہن کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں کیسی پیاری بات کہی ہے۔ ذہن کے پس منظر سے آہستہ آہستہ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر آپ کے سامنے آجاتا ہے اور آپ کو خیال آتا ہے کہ شاید علامہ مرحوم نے یہ شعر اسی موقعہ کے لیے کہا تھا:

ع یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

---

[1] تفہیم القرآن حصہ اول ص ۴۲

باب ۱۶

کُل ہند اجتماع

دارالاسلام

یحییٰ صاحب جن کا پہلے باب میں ذکر ہے، جماعت اسلامی کے پُرانے ارکان میں سے گویا سابقون الاولون میں سے ہیں۔ یہ یوپی کے ایک قصبے میں رہتے تھے کہ ۴۲ء میں انہوں نے سیّد صاحب کی کتاب خطبات پڑھی۔ پیاری پیاری سادہ و رنگین باتیں ان کے دل کو قائل کرتی چلی گئیں۔ تو انہوں نے رسالہ ترجمان القرآن جاری کروا لیا۔ پھر جماعت کا باقی لٹریچر بھی منگوا کر پڑھا جس سے ان کی ذہنی کایا پلٹ گئی۔ کافی غور و خوض کے بعد یحییٰ صاحب نے فیصلہ کیا کہ انہیں جماعت اسلامی میں شامل ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ انہوں نے سیّد صاحب کو خط لکھا کہ انہیں جماعت کا رکن بنا لیا جائے۔ سیّد صاحب نے دارالاسلام سے ان کے خط کے جواب میں جو خط لکھا وہ قائد تحریک کی سخن دلنوازی کا نمونہ ہے:

"عنایت نامہ ملا۔ آپ کا اسم گرامی جماعت کے ارکان کی فہرست میں لکھ لیا گیا ہے۔ کوشش کیجیئے کہ اللہ تعالیٰ کی فہرست میں بھی آپ کا نام سچے مسلمان کی حیثیت سے لکھا جائے کیونکہ اصل

فہرست وہی ہے۔ آپ کے لیے ہدایات یہ ہیں کہ دین کی بصیرت پیدا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کیجیے، اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ صالح بنانے میں ساعی رہیے، جماعت کا لٹریچر آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ کون کون سی کتابیں آپ کے پاس ہیں؟ لٹریچر میں سے کیا کیا آپ نے پڑھا ہے اس کی تفصیل لکھیے۔ نیز یہ بتائیے آپ کی علمی استعداد کیا ہے؟ کس طبقہ سے آپ کا میل جول زیادہ ہے اور آپ دین کی خدمت کے لیے کس نوعیت کا کام کرنے کی اہلیت اپنے اندر پاتے ہیں؟

خاکسار ابوالاعلیٰ۔"

اور جب یحییٰ صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دارالاسلام آنا چاہتے ہیں۔ تو سیّد صاحب نے نہ صرف جماعت کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کیا، دارالاسلام کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی، بلکہ انہیں تمام نشیب و فراز سے بھی مطلع کر دیا:

"آپ یہاں عارضی طور پر تربیت حاصل کرنے کے لیے آنا چاہتے ہیں یا مستقل قیام کی خواہش ہے؟ دونوں صورتوں میں آپ نے اپنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے کیا سوچا ہے؟ کیا آپ کوئی ایسا کام کر سکتے ہیں جس سے اپنی ضروریات پوری کر سکیں؟ یہاں ہم بالکل ایک گاؤں میں رہتے ہیں جس کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آسانی سے کام مل سکتا ہو۔ خود ہماری جماعت ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے اور ہم ایسے کام شروع نہیں کر سکے ہیں جن میں اپنے ارکان کو لگایا جا سکے۔ ان امور پر اچھی طرح غور کر کے پہلے اپنے لیے کوئی ایسی تجویز سوچ لیجیے جس پر عمل کر کے آپ یہاں اپنی معاش کا حسبِ ضرورت انتظام کر سکیں۔ اس کے بغیر اگر آپ سفر کریں گے تو اندیشہ ہے کہ آپ کو کہیں ایسی مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑے جن کی وجہ سے آپ کے لیے یہاں کے ماحول سے اخلاقی فائدہ حاصل کرنا دشوار ہو جائے۔ جو کچھ فیصلہ کیجیے وقتی جوش کی بنا پر نہ کیجیے بلکہ ٹھنڈے دل سے تمام پہلوؤں پر غور کر کے کیجیے۔ مگر یہ خیال رہے کہ سب کچھ انحصار آپ کی تدبیر پر ہی نہیں ہے، اپنی حد تک تدبیر میں کوتاہی نہ کیجیے اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کیجیے۔ وہ مدد کرنے والا ہے۔"

یحییٰ صاحب نے غور و فکر کیا۔ پھر اللہ پر بھروسہ کر کے فیصلہ کیا اور مارچ ۱۹۴۳ء میں

دارالاسلام پہنچ گئے :

"میں نے دیکھا کہ سٹیشن کے قریب ایک چھوٹی سی آبادی ہے جس کے پہلو میں ایک نہر بہتی ہے۔ آس پاس کچھ باغات بھی ہیں اور اس ویرانے میں پانچ فیملی کوارٹرز اور کچھ علیحدہ کمرے ہیں جن میں چند رفقاء سمیت مولانا کی رہائش ہے۔ جس وقت میں پہنچا مولانا جامعہ ملیہ میں خطبہ[1] پڑھنے کے سلسلے میں دہلی گئے ہوئے تھے۔ تیسرے روز مولانا واپس آ گئے۔ میں نے اپنے تصور میں مولانا کا جو نقشہ بنایا تھا مولانا اس سے کہیں مختلف تھے، میرا خیال تھا کہ مولانا بہت بڑے عالم اور بزرگ شخص ہیں، اس لیے کسی حد تک بڑوں اور غیر معمولی آدمیوں کی طرح لیے دیئے رہتے ہوں گے۔ میں سمجھتا تھا نہ جانے وہ کس طرح مجھ سے ملیں گے۔ لیکن ان تصوّرات کے برعکس مولانا بہت تپاک سے ملے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے سے واقف ہیں اور اجنبیت یا چھوٹائی بڑائی کے فرق کی کوئی دیوار ہمارے درمیان حائل نہیں ہے۔ بڑے آدمیوں کا تصوّر کرنے کے بعد ان کے سامنے بات کرنا قدرے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چند ہی منٹ بعد میری ساری مرعوبیت ختم ہو گئی اور میں نے کھل کر باتیں شروع کر دیں۔ پٹھان کوٹ کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ جب مولانا کسی ضروری کام کے سلسلے میں دارالاسلام سے باہر تشریف لے جاتے تو واپسی پر سب رفقاء کے ساتھ مل کر ایک وقت کا کھانا کھاتے۔ یوں بھی ہفتہ میں ایک بار اجتماعی کھانا ضرور ہوتا تھا۔ سفر سے واپسی پر یہ محفل نہر کے کنارے جمتی اور مولانا ایک ایک کر کے تمام حالات بیان کرتے۔"

سیّد صاحب نے جامعہ ملیہ میں جو خطبہ پڑھا اس میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کی تشریح فرمائی۔ اس میں نہ صرف اسلام کو دینِ حق ثابت کیا بلکہ اس ایمان افروز خطبے سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی۔ ان دل نشین الفاظ کو دیکھئے جن پہ

---

[1] یہ خطبہ سیّد صاحب نے ۱۲ مارچ ۴۳ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھا اور "دینِ حق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

یہ خطبہ ختم ہوتا ہے :۔

"ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے الدّین ہونے پر آپ ایمان لائیں اس کی برکتوں سے اپنے ابنائے نوع کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی الدّین تمام دنیا کا دین بن جائے۔ جس طرح حق کی یہ فطرت ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف، زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے اور پھر یہ منظر اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیئے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے"۔

انہی دنوں سیّد صاحب نے ایک سائل کے جواب میں اکتوبر ۴۲ء سے جون ۴۳ء تک ترجمان القرآن کے پرچوں میں ایک مفصّل مقالہ قلم بند کیا جو اب "مرتد کی سزا۔ اسلامی قانون میں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بظاہر یہ ایک مذہبی اور فقہی سا مسئلہ نظر آتا ہے۔ لیکن سیّد صاحب کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تو سیاسی اور نہایت اہم سیاسی مسئلہ ہے اور یہ کتاب سیّد صاحب کے سیاسی اور دینی فہم کا مظہر ہے۔

میاں طفیل محمّد صاحب

۲۶، ۲۷ مارچ ۴۴ء کو شمالی ہند کے ارکان و ہمدردانِ جماعت کا دارالاسلام میں اجتماع ہوا۔ اخبار "مسلمان"، لاہور کے ایڈیٹر ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے تجویز پیش کی کہ جماعتِ اسلامی کی تنظیم کی ہمہ وقت نگرانی کے لیے ایک صاحب کو مقرر کر دینا چاہیئے۔ اس طرح جماعتِ اسلامی میں شعبۂ تنظیم قائم ہوا اور اس عہدے کو قیّمِ جماعت کا نام دیا گیا۔ اس تجویز کے مطابق سیّد مودودی صاحب نے میاں طفیل محمد صاحب کو ۷، اپریل ۴۴ء سے قیّمِ جماعت مقرر کیا۔ میاں صاحب جماعتِ اسلامی میں ۴۱ء میں شامل ہوئے تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ

انہیں مشروط طور پر جماعت میں داخل کیا گیا تھا۔ والدین اور عزیز و اقارب کی سخت ناراضگی کے باوجود جماعت کے نصب العین کے پیش نظر انہوں نے اپنی اچھی بھلی چلتی ہوئی وکالت کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے وکالت کی کمائی جائز نہیں تھی۔ ہائی کورٹ کے ججوں نے بھی مشورہ دیا کہ ریاست کپورتھلہ میں تم پہلے مسلمان وکیل ہو اس لیے جلد ہی جج بن جاؤ گے۔

میاں طفیل محمد صاحب کا کہنا ہے کہ اس وقت مَیں تھوڑی دیر کے لیے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہؤا۔ لیکن مستری محمد صدیق صاحب نے ایک خوبصورت تمثیل سے مجھے صحیح فیصلہ کرنے میں بہت مدد دی۔ میاں صاحب لکھتے ہیں کہ مستری صاحب نے یہ مثال دی:

"سخت سردی کا موسم ہے۔ اولے برس رہے ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے جھکڑ چل رہا ہے اور آپ جس مکان میں رہتے ہیں اس میں آگ لگ گئی ہے۔ اب آپ بتایئے کیا کریں گے؟ اگر مکان میں رہتے ہیں تو جل مرنا یقینی ہے اور اگر باہر نکلتے ہیں تو سردی میں اکڑ جانے کا خدشہ ہے۔ لیکن آپ یہ بھی سوچتے ہیں کہ جہاں اندر پڑے رہنے میں موت یقینی ہے وہاں باہر نکلنے میں جان بچنے کے تھوڑے بہت امکانات تو ہیں ——

اس تمثیل نے مجھ پر گہرا اثر کیا اب میرا ذہن صاف ہو چکا تھا مَیں نے وکالت چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا[1]"

جب وکالت چھوڑی تو رشتہ داروں نے کہا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ۲۳، جنوری ۴۲ء کو لاہور میں سید صاحب کو آ کر بتایا کہ وکالت چھوڑ دی ہے۔ اب مشورہ دیجیے کہ مَیں کیا کروں؟ سید صاحب نے کہا ہمارے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ ایک رسالہ ہے اس کو محمد شاہ صاحب چلا رہے ہیں۔ اب ہم نے مکتبہ شروع کیا ہے اس میں چالیس روپے ماہانہ کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس پر آپ سوچ لیں۔ میاں صاحب نے کہا کہ یک لخت میرے لیے مشکل ہے کہ اتنے کم میں گزارہ کر سکوں۔ پھر میاں صاحب کوئی تجارت وغیرہ کر کے اپنی گزراوقات کرتے رہے۔

---

[1] چراغ راہ تحریک اسلامی نمبر۔ ص ۲۵۲

اب اپریل ۴۴ء میں وہ مرکزی جماعت اسلامی کے قیّم بنائے گئے جو گویا سیکرٹری کا قائم مقام عہدہ ہے۔ پنجابی لہجے میں اُردو بولنے والے میاں طفیل محمد صاحب نے ایسی تندہی، خلوص اور لگن سے کام کیا اور تنظیم کے کام کو سنبھالا اور اس طرح جماعت کے کام کو مضبوط و مستحکم اور وسیع کیا کہ انہوں نے اپنے خلوص، اپنی محنت اور اپنے کام سے ہر ایک کے دل میں گھر کر لیا۔ جماعت اسلامی کے دستور کے مطابق امیر جماعت اور قیّم گویا لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن سید صاحب اور میاں صاحب تو گویا انسان اور سایہ کی طرح اکٹھے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ تین مرتبہ سید صاحب کے ساتھ ہی جیل جانے کا شرف، بھی حاصل کیا۔ ۶۳ء میں دستور جماعت اسلامی پاکستان میں ترمیم ہوئی اور سید مودودی صاحب سے تنظیمی امور کا بوجھ کم کر دیا گیا تو میاں صاحب صوبہ مغربی پاکستان کے امیر جماعت منتخب ہوئے۔ سید صاحب نے مئی ۷۰ء میں بیماری کی وجہ سے ایک سال کے لیے امارت سے رخصت لی تو میاں صاحب ہی امیر جماعت بنے۔ وحدت مغربی پاکستان کی جولائی ۷۰ء میں تنسیخ کے بعد میاں صاحب موصوف کو نائب امیر جماعت اسلامی بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے اب جماعت اسلامی کے لوگ انہیں اپنے دلوں میں سید صاحب کا جانشین ہی سمجھتے ہیں۔

تعلیمات

جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ جماعت کو اپنے تعلیمی نظریہ کے مطابق ایک مرکزی تربیت گاہ قائم کرنی چاہیئے۔ اخبار کوثر میں ایک مفصل سوالنامہ جاری کیا گیا۔ جوابات اور تجاویز کو پیش نظر رکھ کر دار الاسلام میں ۱۴ اگست ۴۴ء کو مجلس تعلیمی کا اجلاس ہوا۔ بیالیس حضرات نے اس میں شرکت کی جن میں سیالکوٹ کے چوہدری محمد اکبر صاحب، نعیم صدیقی صاحب، عبدالجبار غازی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور ابو اللیث اصلاحی صاحب (جو آج کل جماعت اسلامی بھارت کے امیر ہیں) کے نام قابل ذکر ہیں۔ سید مودودی صاحب نے اپنا مقالہ "نیا نظام تعلیم" سنایا اور بتایا کہ ہم مستقبل کی اسلامی ریاست کے جس نظام تعلیم کا تصور کرتے ہیں اس میں اعلیٰ تعلیم کا

معیارِ مطلوب کیا ہے جس سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس اُونچی منزل کو تعمیر کرنے کے لیے کیسی بنیادیں، کیسا مصالحہ اور کیسا لوہا کنکریٹ درکار ہے۔ مجلسِ تعلیمی کے تین روز تک اجلاس ہوتے رہے، جس میں نظامِ تعلیم کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا۔ قراردادیں پاس کی گئیں اور کچھ کمیٹیاں بنادی گئیں۔[1]

جب ایک قوم یا پارٹی ایک ریاست کی تعمیر کسی نظریہ پہ کرتی ہے تو اس کی نگاہوں میں نظامِ تعلیم کو اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ جب وہ نظامِ تعلیم، نصاب اور نظامِ تربیت کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال لے گی تو آئندہ نسلیں صرف اسی نظریہ کے مطابق سوچیں گی اور عمل کریں گی۔ اس طرح وہ پوری قوم اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ سیّد مودودی صاحب بھی چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں صِبْغَۃُ اللہ (اللہ کے رنگ) میں رنگی جائیں (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً : اور اللہ کے رنگ سے بڑھ کر کون سا رنگ ہو سکتا ہے؟: سورۂ بقرہ) اس لیے وہ ۳۶ء سے ہی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے نظامِ تعلیم کو اسلامی رنگ دینے کی اہمیت پہ زور دیتے رہے ہیں۔ اس کی تفاصیل بتاتے رہے ہیں۔ ان کے یہ خیالات الگ الگ مضامین کی شکل میں کئی دفعہ شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان سب مقالات کا مجموعہ تعلیمات کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ذیل میں تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں سیّد صاحب کے افکار کو اختصار کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ جب تک مسلمان معلومات حاصل کرنے کے لیے محنت، مطالعہ اور مشاہدہ کرتے تھے اور ان سے نتائج اخذ کرتے تھے وہ علمی دنیا کے ہی نہیں عملی دنیا کے بھی رہنما تھے۔ جب انہوں نے تھک کر اپنے کام کو کافی سمجھ لیا اور علم و اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا تو ناخدا شناس یورپ آگے بڑھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ امام بن گیا اور مسلمان مقتدی رہ گئے۔ لیکن دینی تعلیم کے مراکز اپنے مؤقف پہ ڈٹے رہے۔ اس مذہبی تعلیم کو حاصل کر کے نکلنے والے لوگوں

---

[1] تعلیمات۔ ص ۱۰۳ تا ۱۲۸

کو نئے مسائل اور زندگی سے کوئی مناسبت نہ رہی اس لیے ——— "ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو[1]"

۲۔ موجودہ نظامِ تعلیم جو سکولوں اور کالجوں میں رائج ہے اسے انگریزوں نے اس خیال سے مرتب کیا تھا کہ یہاں وہ ایسے لوگ تیار کریں جو انہیں حکومت چلانے میں مدد دیں، جو اس کی زبان جانتے ہوں، جن سے وہ ربط اور تعلق رکھ سکیں، جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اس کے آلۂ کار بن سکیں۔ لہٰذا یہاں سے فارغ ہونے والے لوگ مذہب کو سرد مہری، شک اور نفرت سے دیکھتے ہیں۔ وہ مسلمان کی نظر اور نصب العین لے کر کہاں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس نظامِ تعلیم نے ——— "ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی وظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت دیا۔ صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب اور چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔"

۳۔ کالجوں میں محض اسلامیات کا ایک مضمون پورے انگریزی نظامِ تعلیم میں رکھ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ تو ایسے ہے جیسے ایک شخص کو غیر مسلم بنا کر اس کی بغل میں دینیات کی کتاب بھی دے دی جائے ——— "اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرمتیں اور رداغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیئے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی۔ جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیئے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں

---

[1] تعلیمات۔ ص ۱۳۹

ایک مسلمان قوم اور آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔"

۴۔ نظامِ تعلیم کا مقصد متعین اور واضح ہونا چاہیئے کہ ہماری ملت کے تمام افراد خصوصاً اہلِ دماغ طبقے اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی طرزِ عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوں ——— "طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات اور ان کے درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہو کہ ان سب کو دنیا میں مسلک خدا پرستی قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرنا ہے۔"

ایک دوسری جگہ سیّد صاحب نے لکھا ہے "ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب یعنی دین اور اس کے اصولوں کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں۔ اس کے مطابق مضبوط سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق رکھتے ہوں اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔"

۵۔ ہر نوجوان مسلم کو ضروری حد تک قرآن، اسلامی تعلیمات، عقائد، اسلامی اخلاق، فقہ اور اسلامی تاریخ کی تعلیم ضرور دی جائے۔ عربی زبان کو لازماً داخل نصاب کیا جائے۔ نوجوان مسلم کو عام زندگی میں چستی اور پھرتی سے رہنا سکھایا جائے۔ اس میں شائستگی، انضباط، وسعتِ نظر، ذوقِ سلیم اور اسلامی نصب العین کا گہرا عشق پیدا کیا جائے۔ وہ جدید علوم کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھے کہ ان کے ناقص اجزاء کو دور پھینک دے اور اچھی باتوں کو اپنا لے۔

کوئی قوم اپنی عورتوں کو جاہل اور پس ماندہ رکھ کر دنیا میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہمیں تو اپنی خواتین کی فوجی تربیت تک کرنا ہے لیکن ان کی تعلیم ان کے فطری وظائف و ضروریات کے مطابق اور مردوں سے بالکل الگ ہونی چاہیئے ——— "ان کی اصلی فطری ذمہ داری زراعتی فارم اور کارخانے اور دفاتر چلانے کے بجائے گھر چلانے اور انسان سازی کی ہے۔"

۶۔ نصاب سے بڑھ کر استاد اور اس کا کیریکٹر اور کردار شاگردوں کی زندگیوں کو بناتا اور بگاڑتا ہے، اس لیے ان کی تبدیلیٔ افکار و سیرت پر بہت زور دینا چاہیئے۔ عام اسلامی تعلیم

کے بعد ذہین طلبہ کو اختصاصی تعلیم دے کر انہیں مختلف شعبہ جاتِ علوم اسلامیہ کے ماہرین بنایا جائے جو جدید تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر اور اسلامی قوانین سے رہنمائی لے کر جدید مسائل کا حل نکالیں۔

"یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا اس میں جو کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کو بعد کی نسلیں پورا کریں گی یہاں تک کہ اس کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس سال بعد ظاہر ہوں گے۔"

ایک اہم استفتاء

سیّد مودودی صاحب کے اکثر مضامین نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن "ایک اہم استفتاء" نامی مضمون نے تو بہت سے ایسے لوگوں کا جینا حرام کر دیا جو انگریز کی نوکری بھی کر رہے تھے اور مسلمان بھی رہنا چاہتے تھے۔ کسی صاحب نے سیّد صاحب سے پوچھا کہ کیا ایک غیر مسلم حاکم یا عدالت، مسلمان مرد و عورت کے نکاح کو اسلامی قانون کے مطابق فسخ کرے تو وہ نکاح ٹوٹ جائے گا یا نہیں۔ سیّد صاحب نے لکھا ——— "سوال یہ کرنا چاہیئے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں اس کو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔"

سیّد مودودی صاحب کا استدلال یہ ہے کہ حکم صرف خدا کا چل سکتا ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔ (سورہ اعراف ۷)

"اللہ نے تخلیق کیا ہے اسی کے لیے حکم ہے۔"

انسان مخلوق اور رعیت ہے اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔

(سورہ المائدہ: ۷)

"اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔"

خداوندِ عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت وہ ہے جو اس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ۹)

"ہم نے رسولوں کو اس لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم کی بنا پر ان کی اطاعت کی جائے۔"

اس لیے ہر وہ حکومت اور عدالت باغی ہے جو خداوندِ عالم کی طرف سے آئے ہوئے قانون کی بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو۔

اس طرح سید صاحب نے انگریز کی حکومت اور اس کی عدالتوں کو خدا کا باغی قرار دیا۔

"اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لیے کوئی سلطان نہ اُتارا ہو وہ بے اصل ہے اور اللہ کے سلطان سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی قائم کی گئی اس کی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے۔ تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملہ میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعًا نافذ ہوتا ہے یا نہیں...... یہ بھی ناواقفیت کی دلیل ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا جائے گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظامِ عدالت کے پُرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں ان کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا۔"

"اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لیے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے یا بالفاظِ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے، کوئی چیز ارتداد سے مانع نہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں۔ بلکہ ایک راستہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو

درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری پوری قوت صرف کر دیں۔"

ان الفاظ سے بہت سے لوگوں پر اثر ہوا لیکن ایک واضح مثال تو موجود ہے۔ ضلع حصار کی تحصیل سرسہ میں ان دنوں ایک صاحب تھے انہوں نے ریاضی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ انگریز بہادر کی نوکری میں آ گئے۔ نائب تحصیل دار بھرتی ہوئے اگر نوکری میں رہتے تو آج کہیں کمشنر ہوتے۔ لیکن سید صاحب کی کتابیں پڑھ کر ذہن میں اپنے بارے میں اور اپنی نوکری کے بارے میں بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ مندرجہ بالا مضمون "ایک اہم استفتاء" انہیں زندگی کے اہم موڑ پہ لے آیا۔ ایک طرف خدا کی باغی حکومت میں عیش کی زندگی تھی۔ دوسری طرف نانِ جویں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کوشش تھی۔ انہوں نے یہی دوسرا خارزار راستہ منتخب کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں لمبا عرصہ معاشی کس مپرسی کا سامنا کرنا پڑا لیکن پائے استقامت میں لغزش نہ آئی ——— یہ چوہدری نذیر احمد صاحب تھے جو جامع العلوم ملتان کے پرنسپل اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں۔

کُل ہند اجتماع

جماعتِ اسلامی کا پہلا کُل ہند اجتماع ۹ تا ۱۱ اپریل ۴۵ء کو دارالاسلام میں منعقد ہوا۔ آٹھ سو سے زیادہ ارکان اور ہمدرد اس اجتماع کے لیے پورے ہندوستان سے جمع ہوئے اور انہوں نے اس جنگل میں منگل کر دیا۔ عارضی طور پر بجلی کی روشنی کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ شرکاء کو ٹھہرانے کا انتظام مسجد، دفاتر اور دوسری عمارات میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ کیمپوں اور سائبانوں کا اہتمام بھی تھا۔ دارالاسلام کے اس اجتماع میں جن جن اصحاب نے شرکت کی تھی انہیں ماضی کی یاد آتی ہے تو مسرّت وشادمانی سے ان کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں۔ دیہات کی کھلی فضا، سرسبز درخت، شاداب ماحول، نہر کا قرب، سلیقہ وصفائی، حسنِ انتظام، تحریکِ اسلامی کے ساتھیوں سے مصافحے اور معانقے، ہر طرف خوش آمدید کے جذبات، اسلامی اخوت، برادرانہ محبت، گویا نمونے کی مختصر سی اسلامی آبادی ——— اور پھر ان سب کے درمیان ترجمان القرآن کے مضامین سے دل موہ لینے والی سید مودودی صاحب

کی سُرخ و سپید، وجیہہ اور پُراثر شخصیت، ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے تو مسرت سے زبان گنگ ہو جاتی ہے اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا بتائیں۔

سید صاحب نے افتتاحی تقریب میں کہا، "آپ کو یاد ہوگا کہ جب جماعت بنی تھی اور آپ نے مجھے امیر منتخب کیا تھا تو میں نے آپ کے مطالبے کے بغیر خود یہ وعدہ کیا تھا کہ ہر اجتماعِ عام میں میں یہ اعلان کرتا رہوں گا کہ اگر اب آپ کو مجھ سے کوئی اہل تر آدمی مل گیا ہو تو میں جگہ خالی کرنے کے لیے تیار ہوں، آپ اس کو امیر منتخب کر لیں۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اجتماعِ عام منعقد نہ ہُوا اس لیے میں اپنے اس وعدے کو بھی پورا نہ کر سکا۔ آج یہ پہلا اجتماع ہے اور میں اپنے وعدے کے مطابق یہ اعلان کرتا ہوں" —— اور آخر میں کہا "پچھلے تین سال کے دوران میں اگر کسی کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو، کسی کا حق ادا کرنے میں یا کسی کے ساتھ انصاف کرنے میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو، یا کسی نے میرے کام میں کوئی غلطی پائی ہو تو بے تکلف اس کا اظہار کرے۔ اپنی کسی غلطی یا قصور کے اعتراف میں مجھے کوئی باک نہ ہوگا۔"

قیمِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب نے مرکزی بیت المال کے حسابات پیش کیے اور لٹریچر اور جماعت کے کام کی رفتار بتلائی کہ اس وقت ارکانِ جماعت کی تعداد پورے ہندوستان میں چار سو سے کم تھی۔ "ہمارے پیشِ نظر کوئی بھیڑ جمع کر کے دوسروں کو مرعوب کرنا یا کسی کونسل یا کارپوریشن میں اپنی نشستوں میں اضافہ کروانا نہیں ہے۔ بلکہ کچھ ایسے مردانِ کار کا تیار کرنا ہے جو اہلِ دُنیا کو مسلمانوں کی طرح جینا اور مرنا سکھا سکیں اور ان بزرگوں اور عوام کو جو یہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اِسلامی نظامِ زندگی ممکن العمل نہیں، بتا دیں کہ نظامِ اسلامی ہمیشہ کی طرح اب بھی ممکن العمل ہے۔ صرف عزم اور ایمان کی ضرورت ہے۔"

پھر میاں صاحب نے جماعت اِسلامی کے طریقِ کار کی وضاحت کی "کسی کو جماعت میں شریک کرنے سے پہلے حسبِ ذیل امور کے متعلق خاص طور پر تسلّی کر لینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انہوں نے ہماری دعوت اور اس کے طریقِ کار کو، دوسری دعوتوں کو جو ہندوستان میں چل رہی ہیں اور ان کے طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ ان دونوں کے فرق کو سمجھ کر

ہماری طرف کھنچ رہے ہیں۔ یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت سے متاثر ہو کر اخلاقی اور دینی حیثیت سے کوئی نمایاں ترقی کی ہے اور ان کی عملی زندگی میں اس کا نقش صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہ کہ اس معاملے میں ان کا رویہ منفعلانہ نہ ہو بلکہ فاعلانہ ہو اور وہ اس دعوت کا کام کرنے کے لیے عملاً بے چین نظر آتے ہوں .... ان چیزوں کا اطمینان کر لینے کے بعد بھی عموماً کئی کئی ماہ ان کو اُمیدواری کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو رُکنِ جماعت سمجھتے ہوئے کچھ مدت تک کام کریں۔ اس طرح ان کا کام دیکھنے کے بعد ان کو رکن بنانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تاکہ اگر ان کا تاثر محض وقتی اور ہنگامی ہو تو وہ جماعت کے اندر آکر اس کے نظم کو خراب نہ کریں۔"

اِجتماع میں مختلف حلقوں کی رپورٹیں پیش ہوئیں، تجاویز اور مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی۔ سیّد صاحب نے 'دعوتِ اسلامی اور اس کا طریقِ کار' کے عنوان سے ایک دلنشین تقریر کی۔ پھر آخری اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا:

"رفقاء و حاضرین! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری جدّوجہد کا آخری مقصود انقلابِ امامت ہے۔ یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فسّاق و فجّار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو۔ اسی مقصدِ عظیم کے لیے سعی و جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے، افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔"

"انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملاتِ انسانی کی زمامِ کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں، خواستہ و نخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح

انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔"

سیّد صاحب کی یہ تاریخی تقریر جو "تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، ایسی دلنشیں اور مؤثر تقریر تھی کہ آپ اس اجتماع میں ہوتے تو دل میں یہ محسوس کرتے کہ گویا یہ جُدا ہونے والے کا آخری اور دل میں اُتر جانے والا پیغام ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ اسلام کے نزدیک سیاست کے شعبہ کی کیا اہمیت ہے اور اسلام و سیاست میں کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ کہ سیّد مودودی دینی رہنما سے زیادہ سیاسی مفکّر شروع ہی سے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سیاست دان پاکستان بننے کے بعد بنے۔

اجتماع دارالاسلام کے اور مذکورہ بالا تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے:

"دوستو اور رفیقو! مَیں نے بیماری اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لیے کی ہے کہ مَیں امرِ حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مہلتِ عمر آن پوری ہو۔ اگر مَیں نے کوئی بات خلافِ حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کر دیجئے۔ لیکن اگر مَیں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو آپ بھی اس کے گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔"

بہت سی آوازیں بلند ہوئیں ہم گواہ ہیں۔

باب ۱۷

پاکستان

قراردادِ پاکستان

صدیوں سے ایک سرزمین ہندوستان پہ رہتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ ان میں اور ہندوؤں میں بُعد المشرقین ہے۔ ہندوؤں کے ہاں ذات پات اور اُونچ نیچ اتنی زیادہ تھی کہ ان میں تین ہزار سے زیادہ فرقے تھے، جن میں سے دو فرقے یا ذاتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ اس کے برعکس مسلمان اخوت، مساوات، بھائی چارے اور احترامِ آدمیت کے قائل تھے۔ ہندو ہر غیر ہندو کو راکھشس اور ناپاک سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے اسی برّ صغیر پہ محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک قریباً ایک ہزار سال تک ان پہ حکمرانی کی تھی۔ یہ دَور بھی ہندوؤں کے ذہن پہ ایک ناگوار بوجھ تھا۔ اب انگریزی عملداری نے مسلمانوں کو دبا کر ہندوؤں کو اُبھرنے کا موقع دیا تو وہ خوب کھل کھیلے۔ مغربی جمہوریت کے طفیل ہندوؤں کو معلوم ہوا کہ ہندوستان آزاد ہوا تو یہاں ہندو اکثریت کی حکومت ہو گی اور دس کروڑ مسلمان درحقیقت ان کے غلام ہوں گے، جن پہ وہ رام راج قائم کر کے پُرانے بدلے چکا

سکیں گے۔ تو انہوں نے آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ مسلمان مفکرین اور مدبرین اس صورتِ حال کو بہت اچھی طرح دیکھ رہے تھے۔ اسی لیے سیّد صاحب نے لکھا کہ مسلمان اور غلامی تو متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے کہ ادہر ہندوستان کو آزادی ملے اور اُدہر دس کروڑ مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں۔

اسی خطرے کا احساس کرتے ہوئے علاّمہ اقبال مرحوم نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے پاکستان کا دُھندلا سا تصوّر دیا اور کہا "جہاں تک مَیں نے مسلم افکار کا مطالعہ کیا ہے، مَیں اس بنا پر بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول فرقہ واری کے مستقل فیصلہ کی اساس قرار دیا جائے کہ ہندی مسلمان کو پُورا پُورا حق ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں اپنی ثقافت و روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے طور پر آزادانہ ترقی کرنے کا مستحق ہے، تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کے لیے بے قرار ہے..... جب کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی پورے طور پر یک رنگی نہیں پائی جاتی تو فرقہ وارانہ طبقات کو تسلیم کیے بغیر ہندوستان میں فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مسلمانوں کا اسلامی ہند کی تشکیل کا مطالبہ کاملاً صحیح ہے۔" ——— پھر علاّمہ اقبال مرحوم نے واضح الفاظ میں فرمایا "میری تمنا ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حکومت خود اختیاری، خواہ وہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر، ہندی مسلمانوں کے لیے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیئے[۱]۔"

اور یہی بات انہوں نے مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے ۲۸ فروری ۳۷ء والے مکتوب میں لکھی کہ "اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد مَیں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظامِ قانون کو اچھی طرح سے سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم

۱؎ رئیس احمد جعفری: قائدِ اعظم محمد علی جناح۔

ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آ گیا ہے؟[1]"

اس مطالبے کا وقت آ گیا تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا ایک تاریخی اجلاس ہوا۔ لاہور کی عالمگیری شاہی مسجد کے شمال میں واقع وسیع گراؤنڈ میں یہ اجلاس ہوا جسے اب اقبال پارک کہتے ہیں اور جس جگہ آج ایک خوبصورت مینارِ پاکستان ایستادہ ہے۔ یہیں وہ قرارداد پاس ہوئی جس نے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کا مقصد متعین کیا۔ قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا "اسلام اور ہندو ویت مذہب کے عام مفہوم میں مذہب ہی نہیں بلکہ واقعی دو جداگانہ اور مختلف اجتماعی نظام ہیں۔ اور یہ محض خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم بن سکیں گے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے۔ نہ ان کے درمیان باہم شادیاں ہوتی ہیں، نہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیرو ہیں جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ تاریخ اور ہے جس پر ہندوؤں کو فخر اور ناز ہے اور وہ اور ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں اور جس سے ان کے دلوں میں امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی رزمیات الگ الگ ہیں، ان کے بہادر مختلف ہیں، ایک کے نزدیک شجاعت میں جو مثالی شخصیت ہے وہ دوسرے کی نظر میں دشمن ہے۔ اسی طرح ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک نظامِ ریاست میں اس طرح باندھنے کا نتیجہ، کہ ان میں ایک اکثریت ہو اور دوسری اقلیت، یہ ہوگا کہ ان میں بے چینی بڑھے گی اور بالآخر وہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔[2]"

اس اجلاس کی اہمیت اس کی قرارداد کی بنا پر ہے۔ جسے اب تاریخ میں قراردادِ پاکستان

---

[1] رئیس احمد جعفری: قائد اعظم محمد علی جناح۔

[2] سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۵۱

کہا جاتا ہے: "حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت ردّ و بدل کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے، جن میں مسلمان باعتبار تعداد اکثریت ہیں، جیسے ہندوستان کے شمال و مغربی و مشرقی منطقوں میں، اس طرح یک جا ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر بااختیار اور خود مختار ہوں[1]"۔

۲ مارچ ۴۲ء کو قائد اعظم نے فرمایا "ہم نے قرار دادِ لاہور کو پاکستان کا نام نہیں دیا تھا لیکن اگر ہمارے دشمن ہمیں چڑانے کے لیے اس نام کو استعمال کر رہے ہیں تو ہم اس سے چڑیں گے نہیں بلکہ اب سے اس کو قرار دادِ لاہور کی بجائے قرار دادِ پاکستان کے نام سے ہی پکارا کریں گے[2]"۔

سیّد مودودی اور نظریۂ پاکستان

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے نظریۂ پاکستان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ خدمت کی۔ جس وقت پورے ہندوستان میں کانگرس کا طوطی بول رہا تھا اور وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور بڑے بڑے جبّہ و دستار بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس وقت سیّد مودودی صاحب نے کانگرس، اس کے طریق کار، اس کے خفیہ مقاصد، اور رام راج کے ارادوں کو بے نقاب کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ وہ کانگرس کے ساتھ مل کر کس خوفناک مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سیّد صاحب نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" لکھ کر مسلم لیگ کی زبردست حریف کانگرس پہ تابڑ توڑ حملے کیے، اس کی ہندوانہ اصلیت واضح کی اور تحریک آزادی کی اوٹ میں شدھی کی تحریک کو تاخت و تاراج کیا۔ مسلمانوں کو یاد دلایا کہ تم کانگرس کے قلعے کی تعمیر میں مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہو، تمہارا کام تو یہ تھا کہ تم اسلام کا قلعہ تعمیر کرتے۔ اس طرح سیّد مودودی نے کانگرس کے قلعے پہ رکھی ہوئی مسلمان

---

[1] سیّد حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۵۵

[2] رئیس احمد جعفری: قائد اعظم محمد علی جناح۔

نام کی توپوں کو بے اثر کر دیا جن کا رُخ نظریۂ پاکستان کے قلعے کی طرف تھا۔

پھر سید مودودی صاحب نے "مسئلۂ قومیت" لکھی جس نے اسلامیانِ ہند کو یہ شعور اور آگہی دی کہ وہ ایک الگ قوم ہیں۔ انہیں دنیا میں آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا ہے، وہ تو پوری دنیا کے لیے امتِ وسط بنائے گئے ہیں، ان کا "ہندوستانی قومیت" سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کتاب اور اس کے مستحکم دلائل نے کانگرس کے ہمنوا علمائے کرام کے مؤقف کو کمزور اور بودا اور قوم کے لیے نقصان دہ ثابت کر دیا۔ مسلم لیگ نے اس کتاب کو خوب پھیلایا۔ مصباح الاسلام فاروقی صاحب جو تحریکِ پاکستان کے ایک پُرجوش کارکن نوجوان تھے، لکھتے ہیں "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ تحریکِ پاکستان کی مہم کے دوران دوسرے لٹریچر کے ساتھ ترجمان القرآن کے پرچے بھی بڑے التزام کے ساتھ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اور حسبِ ضرورت متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے دلائل رد کرنے کے لیے اس میں سے صفحات پڑھ کر سنایا کرتے تھے[۱]۔"

قائداعظم محمد علی جناح کا سید مودودی اور جماعت اسلامی کے کام کے بارے میں کیا خیال تھا۔ اس کے بارے میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے ریڈر قمرالدین خان صاحب نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۴۱ء میں سید مودودی صاحب کے ایماء پر قائداعظم سے ملے۔ "راجہ محمود آباد کی مدد سے دلی رعنا، دہلی میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ قائداعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے اور پھر کہا کہ وہ مولانا مودودی کی خدمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن برِصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول ان کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلے کی طرف متوجہ ہے، جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکے گا[۲]۔"

۱؎ "Introducing Maududi"

۲؎ Weekly "Thinker" Karachi - 27th Dec 63.

تقسیمِ ہند سے پہلے مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے رفیقانہ تعلقات کے بارے میں بیونارڈ بائنڈر نے لکھا ہے: "مسلم لیگ نے مولانا مودودی صاحب کو مل کر کام کرنے کی دو مرتبہ دعوت دی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ ریسرچ گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ دوسری دفعہ ۱۹۴۵ء میں جب کہ مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری مولانا ظفر احمد انصاری کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ مولانا مودودی کی مسلم لیگ کے پروگرام کے لیے حمایت حاصل کریں۔ اگرچہ انصاری صاحب مولانا کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے تاہم دونوں کے درمیان دوستی کے جذبات استوار ہو گئے۔ یہ بات کہ مسلم لیگ نے مولانا مودودی کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی حالانکہ اس کے برعکس احرار یا خاکساروں کو پوچھا تک نہیں گیا، اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ جماعتِ اسلامی کو سیاسی کی بجائے ایک اہم مذہبی جماعت سمجھا جاتا ہے۔ یہ ظفر احمد انصاری وہی ہیں جنہیں مسلم لیگ نے جمعیت العلمائے اسلام کی تنظیم کا کام سونپا تھا تاکہ وہ لیگ کی امداد و اعانت کرے[۱]۔"

یوپی مسلم لیگ نے اسلامی نظامِ مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تو سیّد مودودی صاحب نے اس کی رکنیت قبول کی اور کام میں پوری دلچسپی لی۔ اس کمیٹی سے وابستہ ایک معاونِ تحقیق مولانا محمد اسحاق سندیلوی صاحب نے اس کمیٹی کا وہ مسودہ شائع کیا ہے جس میں یہ ابتدائی خاکہ دیا گیا ہے۔ اس کے پیشِ لفظ میں مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں :

"غالباً ۱۹۴۰ء یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ اربابِ لیگ کو خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومتِ پاکستان کے قیام کا مطالبہ شدومد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانونی اساس بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اس غرض سے یوپی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلسِ نظامِ اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں۔ ۱۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی۔ ۲۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ ۳۔ مولانا آزاد سبحانی اور ۴۔ عبد الماجد دریا بادی۔"

ل۱ "Religion and Politics in Pakistan" p. 95.

سیّد مودودی صاحب نے تقسیمِ ہند کی تجویز اس وقت پیش کی جب ایسی تجویز کو شاعر کا تخیّل اور دیوانے کی بڑ کہا جاتا تھا۔ ان دنوں سیّد صاحب فکر انگیز سیاسی مضامین لکھ لکھ کر مسلمانوں کو یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ ہندوؤں سے علیٰحدہ، ایک اصولی اور منفرد قوم ہیں اور ہندوستانی سے پہلے بلکہ اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ سیّد صاحب نے لکھا کہ مسلمان کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں ہو سکتے جو ہندوستانی قومیت کی داعی ہو۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی جداگانہ قومیت کے تصوّر کو ایک سیاسی حقیقت کے طور پر منوائیں۔ پھر سیّد صاحب نے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کی متبادل تجاویز پیش کیں کہ تہذیبی بنیادوں پر بین الاقوامی وفاق قائم کیا جائے یا تہذیبی منطقوں کا تعین کر کے ہندو مسلم آبادی کا تبادلہ کر لیا جائے۔ ورنہ تیسری تجویز یہ ہے کہ "ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیٰحدہ وفاق ہو اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف ہو جائے جس میں مخصوص اغراض مثلاً دفاع اور مواصلات اور تجارتی تعلقات کے لیے مقرّر شرائط پر تعاون ہو سکے[1]۔"

کسی نے پاکستان کو یہودیوں کے مطالبہ اسرائیل سے تشبیہہ دی تو سیّد صاحب نے اسے غلط قرار دیا اور کہا کہ فلسطین اور اسرائیل یہودیوں کا وطن نہیں۔ یہودی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں دنیا کے مختلف گوشوں سے اکٹھا کر کے اسرائیل میں بسایا جائے اور یہاں ہمیں آزاد سلطنت اور حکومت دے دی جائے۔ اس کے بعد سیّد صاحب لکھتے ہیں:

"بخلاف اس کے پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے، اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے 'ہندو ہندوستان' اور 'مسلم ہندوستان' کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ بالفاظِ دیگر مسلمان یہ نہیں

---

[1] تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان: "مسلمان کیا کریں؟"

کہتے کہ ہمارے بیے ایک قومی وطن بنایا جاتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے ——— یہ چیز وہی ہے جو آج کل دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں ۔[1]"

جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے تو سید صاحب نے گویا محمود غزنوی کے الفاظ دہرائے کہ ہم بُت شکن ہیں۔ آپ نے لکھا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتے، تمام روئے زمین ایک ملک ہے انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا ——— اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔[2]"

اعلانِ پاکستان

جن لوگوں نے تقسیم ہند سے پیشتر تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا، انہیں واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو کانگرس کے بستہ فتراک میں تھے، ان میں سے مغلوب الغضب لوگ اپنی سٹیج سے جناح اور قائدِ اعظم اور پاکستان کے ہم وزن ناگفتنی الفاظ تک کہا کرتے تھے، قائدِ اعظم کو انگریزوں کا ایجنٹ کہتے تھے اور یہ

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان: "مسلمان کیا کریں؟"

[2] ایضاً

فتویٰ ان لوگوں نے دیا تھا کہ جو لوگ مسلم لیگ میں شامل ہیں وہ کافر ہیں، ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں اور ان کی سب اولاد حرامی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے مسلم لیگ کا عملاً ساتھ نہیں دیا ان میں مخلص، سنجیدہ اور مدبر لوگ بھی تھے جو مسلم لیگ کی قیادت میں نواب زادوں، جاگیرداروں اور اشتراکیوں کو دیکھ کر اس بارے میں مطمئن نہیں تھے کہ یہ لوگ مستقبل کے پاکستان کو مسلمانوں کی ریاست سے بڑھ کر اسلامی ریاست بنا دیں گے۔ وہ سوچتے تھے کہ جو لوگ اپنی ذاتی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہونے سے کتراتے ہیں، وہ اسلامی قانون اور اسلام کی اجتماعی ہیئت کو کیسے قائم کریں گے۔ پروفیسر سرور صاحب نے لکھا ہے:

"سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مولانا مودودی ہی اس خیال کے نہیں تھے بلکہ غیر مسلم لیگیوں کے علاوہ خود بہت سے نامی گرامی مسلم لیگی لیڈر اپنی جماعت کے متعلق جلوت و خلوت میں کم و بیش اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے اور عام مسلم لیگی قیادت کے متعلق عام طور پر عوام و خواص کا یہی تاثر تھا۔"[1]

ہندوؤں کا تعصب رنگ لا کر رہا اور مسلمانانِ ہند کو اپنی نجات کا راستہ پاکستان ہی میں نظر آیا۔ یہ نصب العین ایسا پر شکوہ تھا کہ آہستہ آہستہ چھوٹے بڑے سبھی اسی کی طرف کھنچتے چلے آئے۔ پھر مسلم لیگی قیادت نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ پاکستان میں خلافتِ راشدہ کا نظام لایا جائے گا۔ اس بات کو اتنے زور شور سے پھیلایا گیا کہ مسلم لیگ کی پوری تحریکِ پاکستان کا اظہار صرف ایک نعرے سے ہونے لگا اور ہندوستان کا گلی گلی کوچہ کوچہ اس نعرے کی بازگشت سے گونجنے لگا کہ "پاکستان کا مطلب کیا ۔ لا الٰہ الا اللہ"۔ جمہور مسلمین نے پاکستان کو اس حد تک ذہنی طور پر قبول کر لیا کہ وہ علاقے بھی پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگے جنہیں یقین تھا کہ یہ کبھی بھی پاکستان میں نہیں آسکتے۔ بڑے بڑے کانگرسی اور یونی نسٹ اپنی اپنی پارٹیاں چھوڑ کر مسلم لیگ میں آ شامل ہوئے۔ ہوا کا رخ دیکھا تو صدارتوں اور وزارتوں کو چھوڑ کر تحریک پاکستان کی صفوں میں آ شامل ہوئے۔ پھر مسلم لیگ نوابوں، زمین داروں اور جاگیرداروں کے

---

[1] مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی۔

محلات، کوٹھیوں اور ڈیروں سے نکل کر بازاروں، گلیوں اور عوام میں آ گئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے مسلم لیگ کا چاند تارے والا سبز پرچم لیے، ایک جذبے سے سرشار صبح و شام گلیوں میں یہ نعرے لگاتے تھے "پاکستان زندہ باد ــــ قائد اعظم زندہ باد ــــ بٹ کے رہے گا ہندوستان ــــ بن کے رہے گا پاکستان" اور گلیوں میں یہ گاتے ہوئے جاتے

"مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"

مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ کم از کم اس وقت جب کہ یہ تحریک عوام میں پہنچ گئی تھی، مسلم لیگ کا یہ دعویٰ صحیح تھا اور ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے نتیجۂ انتخاب نے اس کی تصدیق کر دی جو ۲۶ نومبر ۴۵ء کو نکلا۔ کانگرس، جمعیتہ العلماء ہند، احرار، خاکسار اور مسلم مجلس، سبھی نے اپنے اپنے نمائندے کھڑے کر کے مسلم لیگ کا مقابلہ کیا جس نے ہر مسلم نشست کے لیے اپنا امیدوار کھڑا کیا تھا۔ سندھ میں قائد اعظم کے خلاف سبھی جماعتوں نے مل کر مسٹر لال جی کو کھڑا کیا۔ قائد اعظم کے ۲۰۲ ۳ ووٹوں کے مقابلہ میں اس بیچارے کو ۱۲۷ ووٹ ملے اور ضمانت ضبط ہو گئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کے مخالف تمام امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ مسلم لیگ نے تیس کی تیس مسلم نشستیں جیت لیں۔ غالباً کسی ملک کی دستوری تاریخ میں اس کامیابی کی نظیر نہیں ملتی[1]۔

اس کامیابی نے دشمنوں کو ہراساں کر دیا اور مسلمانوں کو پاکستان کی منزل قریب نظر آنے لگی۔ پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کا طوطی بولنے لگا اور چالیس کروڑ ہندوستانی اپنی نجی اور مجلسی گفتگوؤں میں تمام مسائل حتیٰ کہ آزادئ ہند تک کو ثانوی حیثیت دے کر صرف پاکستان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مسلم لیگ نے پاکستان کی بنیاد پر لڑے اور پھر مسلم لیگ شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ آسام میں ۳۴ مسلم نشستوں میں سے ۳۱ پر مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ بنگال کی ۱۱۹ نشستوں میں سے ۱۱۲ مسلم لیگ کو ملیں۔ بہار کی ۴۰ میں سے ۳۶ نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ اڑیسہ، سی پی، بمبئی اور مدراس میں سو فیصدی

---

[1] سید ریاض حسن: پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۲۸۰

کامیابی ہوئی۔ یوپی کی ۶۶ نشستوں میں سے ۵۴ مسلم لیگ جیت گئی۔ سندھ میں جی ایم سید عین آخری لمحے اپنا گروپ لے کر مسلم لیگ سے الگ ہو گئے۔ اس ڈرامے کے باوجود سندھ کی ۳۴ نشستوں میں سے ۲۹ مسلم لیگ کو ملیں۔

سرحد میں کانگرس کے ڈاکٹر خان صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ مسلم لیگ اور کہیں ہو تو ہو سرحد میں نہیں ہے۔ لیکن ان کی کانگرس پارٹی کا یہ دعویٰ بھی نقش بر آب ثابت ہوا اور کانگرس کی ۱۶ نشستوں کے مقابلے میں مسلم لیگ نے ۱۷ نشستیں جیتیں، یہ الگ بات ہے کہ کانگرس کی مدد کو جمعیتہ العلمائے ہند کے دو امیدوار اور آزاد ممبر آ گئے اور وزارت ڈاکٹر خان صاحب نے بنالی۔ اصل معرکہ زندہ دلانِ پنجاب کی سرزمین میں تھا۔ جہاں بیلچے بردار خاکسار، آتش بیاں احرار، یونی نسٹ یعنی حکومت کے خیمہ بردار اور کانگرس کے چھوٹے موٹے برخوردار سبھی نے مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن مسلم لیگ کا ستارہ چمک رہا تھا۔ احرار اور خاکسار کا ایک بھی اُمیدوار کامیاب نہ ہوا اور ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۹ پر مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ صوبائی انتخابات نے مسلم لیگ کا لوہا منوالیا اور پاکستان ایک حقیقت بنتا نظر آتا تھا۔[1]

تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں چار عوامل کا خاص حصّہ ہے۔ اوّل مسلمانوں کا یہ احساس کہ وہ ہندوؤں اور دوسری قوموں سے الگ ایک قوم ہیں اور انہیں اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی بسر کرنے کے لیے الگ مملکت کی ضرورت ہے۔ دوم مسلم لیگ کا عوامی سطح پر آکر یہ یقین دلا دینا کہ وہ خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر چلنے والی حکومت قائم کرے گی۔ سوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شائستہ، پُر وقار اور پُر عزم استقامت شخصیت اور چہارم ہندو قوم اور قیادت کا مسلمانوں کے ساتھ مسلسل تنگ دلانہ اور متعصبانہ رویہ ——

غالباً یہ آخری عامل نہ ہوتا تو برِصغیر کے نقشے کی حالت وہ نہ ہوتی جو اب ہے اور شاید پاکستان معرضِ وجود ہی میں نہ آتا۔ جب مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام نشستوں کو جیت کر کانگرس اور سبھی کو حیران کر دیا تو سردار پٹیل نے ۱۴ر جنوری ۴۶ء کو احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے

---

[1] رئیس احمد جعفری: قائدِ اعظم محمد علی جناح۔

ہندوؤں کی اس ذہنیت کو بالکل عریاں کر دیا۔" اب بے شک یہ جماعت یومِ فتح مناتی رہے اور یہ سمجھ لے کہ ہم نے پاکستان لے لیا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ پاکستان اس طریقہ پر حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ پاکستان حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر پاکستان کا قیام عمل میں لانا منظور ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہونا ہوگا اور اس صورت میں خانہ جنگی ہو کر رہے گی۔"[۱]

مسلم لیگ صوبائی انتخابات میں اتنی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی۔ لیکن کانگرس کی جوڑ توڑ اور دوسری پارٹیوں کی ملی بھگت سے نتیجہ یہ نکلا کہ صرف بنگال میں مسلم لیگ ایک مضبوط حکومت قائم کر سکی۔ سندھ میں کمزور حکومت قائم کی۔ صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خاں صاحب کانگرس کی اشیرباد سے سلامت رہے۔ لیکن سب سے زیادہ اور کھلم کھلا ظلم پنجاب میں ہوا۔ مسلم لیگ کے ساتھ ۷۹ مسلمان اور دس غیر مسلم ممبران تھے، ۱۷۵ ممبروں کے ایوان میں اسے واضح اکثریت حاصل تھی۔ لیکن گورنر نے خضر حیات خان ٹوانہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی جس کی یونینسٹ پارٹی کے کل پانچ ممبر کامیاب ہوئے تھے اور جسے اب کانگرس اینڈ کمپنی کی حمایت حاصل تھی۔ مسلمانانِ پنجاب میں یہ دیکھ کر اشتعال پیدا ہو گیا۔ انہوں نے اس صریح زیادتی کے خلاف ۴ مارچ ۴۷ء کو لاہور میں ایک جلوس نکالا۔ سناتن دھرم کالج کے ہندوؤں نے جلوس پر خشت باری کی۔ پھر انگریز راج نے بھی مسلمانوں پر فائرنگ کی۔ جس سے کئی مسلمان طلبہ ہلاک و مجروح ہوئے۔ سارے پنجاب میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ لارڈ ویول نے جلتی پر تیل کا کام کیا کہ مسلم لیگ کو قطعی نظرانداز کر کے پنڈت نہرو کو اور کانگرس کو مرکزی عبوری حکومت کی تشکیل کی دعوت دے دی۔

۲ ستمبر ۴۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی عبوری حکومت نے چارج لیا اور اسی روز کلکتہ اور پھر بمبئی میں مسلمانوں کی جان اور آبرو کی ہولی کھیل کر جشنِ طرب منایا۔ پھر یہ آگ پھیل گئی۔ کبھی چند روز کے لیے یہ آگ دھیمی پڑتی پھر بھڑکنے لگتی۔ پھر تو یہ خونی فسادات بینی آباد،

---

[۱] رئیس احمد جعفری: قائدِ اعظم محمد علی جناح۔

نواکھالی، بہار، قلابہ اور دوسری جگہوں پر متعدی وبا کی طرح پھیلنے لگے۔ بہار میں تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی، بڑی بے دردی کے ساتھ دیہات کے دیہات جلا دیئے گئے۔ کنوئیں لاشوں سے بھر دیئے گئے۔ پورے ملک میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان دہکتا ہوا آتش فشاں بن گیا۔ ان مسلمانوں کو بھی قتل کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی گئی جو ساری زندگی پورے خلوص سے کانگرس سے وابستہ رہے تھے۔

۴۷ء کے آغاز میں برطانوی حکومت نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو غیر قانونی قرار دیا اور مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ پنجاب کا سویا ہوا شیر جاگ اٹھا۔ سول نافرمانی کی تحریک زور پکڑ گئی، بے شمار گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن پنجاب کے زندہ دل، غیور اور مجاہد صفت باشندے انگریزی حکومت کے سامنے ڈٹ گئے۔ بالآخر حکومت نے مسلم لیگ ہائی کمان کی شرائط مان لیں۔ جلسے جلوسوں سے پابندیاں ہٹا دی گئیں، سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے، نیشنل گارڈ پر سے پابندی اٹھ گئی۔ اور ۲ مارچ ۴۷ء کو اچانک خضر حیات نے یہ کہہ کر کہ پنجاب میں وزارت بنانے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے، گورنر کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ گورنر نے مسلم لیگ کے نواب افتخار حسین ممدوٹ کو وزارت بنانے کی دعوت دی تو ہندوؤں نے لاہور میں آتش زنی کی، لوٹ مار کی، فسادات کی آگ لاہور سے پھیلی اور پھر اس نے پنجاب کے کئی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پنجاب، بہار، یوپی اور بمبئی کے ان فسادات نے انگریز حکومت کو قائل کر دیا کہ یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے اپنے نئے وائسرائے ہند لارڈ مونٹ بیٹن کے ذریعے اپنی آزادیٔ ہند کی سکیم نشر کی اور

۳ جون ۴۷ء کو پاکستان کو تسلیم کر لیا گیا۔

حلقہ وار اجتماعات

جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا تھا کہ اس دفعہ سالانہ اجتماع ۸ تا ۱۰ اپریل ۴۷ء کو ٹپنہ

میں منعقد کیا جائے گا۔ لیکن پورے ہندوستان میں فسادات کی آگ پھیلی ہوئی تھی، ذرائع آمدورفت بیشتر منقطع اور بقیہ پُرخطر اور غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ اس لیے ٹونک، مدراس، پٹنہ اور دارالاسلام میں حلقہ وار اجتماعات منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پٹنہ کا اجتماع اس لیے اہمیت اختیار کر گیا کہ اس میں گاندھی جی آئے۔ وہ بہار کے فسادات کے سلسلے میں پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ جماعت کے اجتماع عام میں آئیں گے تو انہیں اطلاع بھجوا دی گئی کہ آپ کسی امتیازی برتاؤ کی توقع نہ رکھیں۔ اجتماع کی کارروائی ٹھیک وقت پہ شروع ہو جائے گی اور اگر آپ کے ساتھ مستورات ہوں گی تو انہیں خواتین کے ہمراہ پس پردہ بیٹھنا ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ جلسہ وقت پہ سات بجے شروع ہو گیا۔ گاندھی جی کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ عبدالجبار غازی صاحب نے انہیں خواتین کی نشست گاہ کی طرف بھیج دیا اور گاندھی جی کو لاکر سٹیج کے قریب دری پر بٹھا دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تقریر جاری رہی اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہؤا کہ گاندھی آئے اور یہ کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں۔

ٹونک میں ۱۷ اپریل ۴۷ء کو جلسہ ہؤا جس میں بتایا گیا کہ جماعت اسلامی کے معیارِ رکنیت کی وجہ سے کچھ لوگ علیحدہ ہو گئے اور کچھ کو علیحدہ کر دیا گیا۔ ایسے کمزور اور ناقابلِ اطمینان ۵۰ افراد کو الگ کرنے کے بعد جماعت اسلامی کے پاس کل ۵۳۳ ارکان تھے۔ تطہیر کے اس تجربہ سے جماعت اسلامی نے یہ سبق سیکھا کہ آئندہ کے لیے رکن بڑی کٹھن آزمائشوں اور مراحل کے بعد ہی بننے دیتے ہیں۔ تاکہ اس میں شامل ہی وہ لوگ ہوں جنہیں شاذ و نادر ہی نکالنے کی ضرورت پڑے۔ ٹونک کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سید مودودی صاحب نے ارکان و ہمدردین کو ہدایات دیں اور موجودہ فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کہا "ملک کی موجودہ خانہ جنگی میں اگر خدانخواستہ آپ کا علاقہ مبتلا ہو جائے تو ایسی صورت میں جماعت کی پالیسی کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھ کر اس پر عمل کیجئے۔ اس نزاع میں ہماری اصل حیثیت تو ایک داعئ خیر گروہ کی ہے اور ہمارا کام یہی ہے کہ اس آگ کو فرو کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر کہیں آگ لگ ہی جائے تو مدافعت میں ہمارا فطری مقام مسلمانوں کے ساتھ ہے[1]"

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم۔ ص ۹۰ تا ۱۲۰

جماعت اسلامی حلقہ جنوبی ہند کا اجتماع مدراس میں ۲۵ر اپریل ۴۷ء کو ہوا تو وہاں خاصے ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ سیّد مودودی صاحب وردِ گردہ کی وجہ سے تقریر کر کے لوٹ گئے تو اجتماع گاہ میں چالیس پچاس آدمیوں کا گروہ مسلم لیگ کا جھنڈا لیے اور نعرے لگاتے ہوئے صدر دروازے پر آ کر رُکا۔ ایک صاحب نے مسلم لیگ کا جھنڈا صدر دروازے پر لگانا چاہا تو جماعت کے کارکن نے اس کی مدد کی اور جھنڈا لگوا دیا اور پھر اندر چل کر جلسہ سننے کے لیے کہا۔ چنانچہ سبھی حضرات اندر آ کر بیٹھ گئے۔ قیم جماعت ان کے سوالات کے جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو اجتماع گاہ میں دو تین سو آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے اور نعرے لگانے لگے "قائدِ اعظم زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ جمعیتہ العلماء مردہ باد"۔ لاؤڈ سپیکر پہ تمام حضرات کو خاموش اور پُر امن رہنے کی اپیل کی گئی اور کہا کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیے۔ ہمیں اپنے پیشوا کی طرح پتھروں کا جواب دعائے خیر سے دینا ہے۔ لیگی لیڈروں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جمعیتہ العلماء کا جلسہ نہیں لیکن بلوائیوں کا شور تھمتا ہی نہیں تھا۔[1] بلوائی جلسہ گاہ سے نکل کر سٹور اور کچن میں گھُس گئے۔ تقریباً پچاس آدمیوں کا کھانا اٹھا کر لے گئے۔ باہر سڑک پر دونوں طرف قطار لگا کر کھڑے ہو کر "مالِ غنیمت" کھاتے رہے۔ اس ہنگامے کے دوران جماعت نے پولیس کی امداد کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ یہاں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ کیونکہ فساد تو جوابی کارروائی سے ہوتا ہے اور ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے بھائیوں پر آپ سے لاٹھیاں اور گولیاں چلوائیں۔ بلوائی بڑی دیر بعد منتشر ہوئے۔ دوسرے روز ۲۶ر اپریل کو مدراس شہر میں صبح ہی سے یہ مشہور تھا کہ بلوائی جماعت اسلامی کی اجتماع گاہ کو آگ لگائیں گے۔ نمازِ مغرب کے لگ بھگ سینکڑوں بلوائی اجتماع گاہ میں پہنچ گئے۔ قائدِ اعظم کی بیس تیس تصاویر مختلف جگہوں پر آویزاں کر دیں۔ کارکنوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور بلوائیوں نے خوب اودھم مچایا اور ابتری پھیلا دی۔

سیّد مودودی صاحب نے اگلے روز ارکان اور ہمدردوں کے خاص اجتماع میں ملک

---

[1] رُوداد جماعت اسلامی حصہ پنجم۔ ص ۹۰ تا ۱۲۰

کے سیاسی حالات کا تجزیہ کیا اور ایسی باتیں کہیں جنہیں پیشین گوئیاں کہا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کی دُور بین نگاہ نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں، ہجرت اور جماعت اسلامی کے آئندہ طریقِ کار کے بارے میں جو دیکھا اور سوچا وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

انہوں نے بڑے پیمانے پر ہجرت کا ذکر کیا "ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں اور تبادلۂ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کر لیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابلِ عمل ہے۔ مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ نہ حل کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھاتے پیتے لوگ یا بہت برداشتہ خاطر افراد و خاندان یا کچھ منچلے قسمت آزما لوگ ہی عمل کر سکیں گے۔ مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی۔ اور اس کا کسی بڑے پیمانے پر مہاجرت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اِلّا یہ کہ خدانخواستہ وہ حالات پیش آجائیں جو بہار وغیرہ میں پیش آئے ہیں[1]۔"

ہندوستان میں رہ جانے والی مسلم اقلیت کے بارے میں کہا "جو سٹیٹ اب مسلم اقلیت کے علاقوں میں بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی سٹیٹ ہوگا۔ قومیت و جمہوریت کے جن نظریات کو مسلمان اور ہندو یکساں تسلیم کر کے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں ان کی بنیاد پر کوئی قومی سٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری ایسی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کیا کرتا۔ جو حکمران قومیت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ وہ پہلے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے تحلیل کر کے اپنے اندر ہضم کر لے۔ پھر اگر وہ اتنی سخت نکلتی ہے کہ ہضم نہ ہو سکے تو اسے دبا دینا چاہتا ہے کہ جداگانہ قومی وجود اور اس کی بنا پر مستقل قومی مطالبوں کی آواز بلند ہونے ہی نہ پائے اور بالآخر اگر وہ قومیت دباؤ کے نیچے سِنچتی ہی چلی جائے تو پھر قومی سٹیٹ اسے باقاعدہ فنا کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہندوؤں کے قومی سٹیٹ

---

[1] رُوداد جماعت اِسلامی حصّہ پنجم

میں مسلم اقلیت کو پیش آنے والا ہے[1]۔"

پھر سید مودودی نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حالتِ زار کے بارے میں گویا پیشین گوئی کی اور کہا "یہ وقت جس کے آنے کی خبر میں دے رہا ہوں اب بالکل قریب آ گیا ہے۔ جوں ہی کہ ہندوستان کا موجودہ دَور ختم ہو کہ نیا دَور شروع ہوا ؛ اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے انہدام کا وقت ہو گا۔ جو تحریکِ خلافت کے انہدام سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہو گا۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو جمود و انتشار طاری کیا تھا وہ اگرچہ نہایت نقصان دہ تھا مگر مہلک نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت پھر کہیں طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہو گی[2]۔" ——— سید صاحب کا اندازہ مستقبل قریب میں ہی صحیح ثابت ہو گیا۔

تقسیمِ ہند سے جماعت اسلامی پر کیا اثر پڑے گا اس کے بارے میں بھی سید صاحب صاف ذہن تھے۔ انہوں نے کہا: "آنے والے دَور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہو گا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا بلکہ بعید نہیں کہ نظامِ جماعت کو بڑی حد تک دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری انتظامات خود کر سکے[3]۔"

---

[1] روداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم

[2] ایضاً

[3] ایضاً

باب ۱۸

ہجرت

فسادات

۳ جون ، ۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو کانگرس ، ہندو اور سکھ سبھی کو یوں معلوم ہوا گویا ان کی بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو گئے ہیں ، جنم بھومی قتل ہو گئی ہے ، انہیں یہ محسوس ہوا کہ وہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے مقابلے میں تیس کروڑ ہوتے ہوئے بھی پانی پت کی گویا چوتھی لڑائی میں ہار گئے ہیں - ان کا جذبۂ انتقام عود کر آیا - سردار پٹیل کی سرکردگی میں انہوں نے مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کا منظم منصوبہ بنایا ، تاکہ گھبرائے ہوئے بے کس مسلمان جب لاکھوں کی تعداد میں لٹے پٹے پاکستان میں پہنچیں تو پاکستان اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہ ہو اور پاکستان خدانخواستہ اپنی موت آپ مر جائے - اعلانِ پاکستان کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات عام ہو گئے لیکن تقسیمِ ہند کے ساتھ جس انداز کا خوفناک قتلِ عام شروع ہوا - اس کی مثال پوری تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی - سکھوں نے ہندوؤں کا آلہ کار بن کر ، انڈین آرمی کی پشت پناہی سے ، اسلحہ بارود سے لیس ہو کر ، انگریز گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کے مجرمانہ

تغافل کے پردے میں جن سنگھ، مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور خالصہ قیادت کے منصوبہ اور تعاون سے، نہتے مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا ۔ بہار، نواکھالی اور بنگال میں یہی ہؤا اور دہلی سے لے کر لاہور تک اور گورداسپور سے ریاست بہاول پور تک پورے مشرقی پنجاب کو اگست سے دسمبر ۴۷ء تک دنیا کا بدترین جہنم بنا دیا گیا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام ایسے وسیع پیمانے پہ شروع ہؤا کہ مسلمانوں کو اپنے اربوں روپوں کی جائیداد والے مکانات، دکانیں، زمینیں اور گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ اور جب وہ لٹے پٹے قافلوں کی صورت میں نکلتے تو منظم وحشیوں کے گروہ ایسے شرمناک حملے کرتے، عزّت وناموس کو برباد کرتے، بچوں اور بوڑھوں کو روندتے اور کچلتے، جوان مردوں کو ذبح کرتے اور جوان عورتوں کو ہنکا کر لے جاتے کہ رُوحِ انسانیت لرز لرز گئی۔

آئین سٹیفن نے اس تاریخی المیے کا ذکر کیا ہے کہ اس جبری ہجرت میں سرحد کے دونوں طرف ایک کروڑ چالیس لاکھ انسانوں کو اپنے گھر بار چھوڑنے پڑے اور قریبًا پانچ لاکھ انسان کام آئے (سٹیفن نے صرف مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد لکھی ہے جو لوگ دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گئے ان کی تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے)، سکھوں کی ریاستوں پٹیالہ اور کپور تھلہ کی پشت پناہی سے سکھوں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اگست ۴۷ء کے پہلے دو ہفتوں میں مسلم اکثریت والے دیہاتوں پہ حملے کیے ۔ ان کی مدد کے لیے مشرقی پنجاب کی ہندو گورنمنٹ نے انگریزوں کے انتقالِ اختیارات سے پہلے ہی شرمناک ہتھکنڈے شروع کر دیئے ۔ ۱۰ اگست کو ضلع امرتسر کے نئے ہندو ڈپٹی کمشنر کے احکامات کے مطابق پولیس کے تمام مسلمان ملازمین سے ہتھیار لے لیے گئے تاکہ وہ ظالم سکھوں کو روک نہ سکیں اور مسلمانوں کو بچا نہ سکیں ۔

مشرقی پنجاب کے آگ اور خون کے دریا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے یورپی اخبارات کے کچھ رپورٹر آئے ۔ ان میں "دی ٹائمز" کا رپورٹر مورلین بھی تھا جس نے جان ہتھیلی پہ رکھ کر ان علاقوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ ۲۴ اگست کو اس نے اپنے اخبار کو جالندھر سے جو رپورٹ بھیجا ۔ اس کے کچھ اقتباسات سے صورتِ حال کا کچھ اندازہ ہوتا ہے :

"سکھ قوم مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے صاف کر رہی ہے۔ روزانہ سینکڑوں کو ذبح کرتی ہے اور ہزاروں کو مغربی سمت میں بھاگنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے دیہاتوں اور مکانوں کو جلا رہے ہیں اور اس پاگل پن میں اپنے مکان بھی جلا دیتی ہے۔ اس تشدّد کی تنظیم سکھوں کی اعلیٰ قیادت نے کی ہے اور پوری ترتیب سے ایک ایک حصّے سے مسلمانوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں جیسے کہ امرتسر اور جالندھر ہیں نسبتاً خاموشی چھا گئی ہے۔ اس لیے کہ اب یہاں کوئی مسلمان باقی نہیں رہ گیا۔ مجھے جالندھر ضلع کے اوپر دو گھنٹے کی تحقیقاتی پرواز کے دوران کم از کم پچاس دیہاتوں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل دکھائی دیئے۔

ہوتا یوں ہے کہ سکھ جتھے عام طور پر حملے سے پہلے اپنی عبادت گاہوں یعنی گوردواروں میں جمع ہوتے ہیں۔ ہر جتھے میں پچاس سے سو تک مسلح سکھ ہوتے ہیں، اکثر جتھے سکھ ریاستوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں، مسلمانوں کے ہاتھوں میں صرف ڈنڈے ہوتے ہیں، جب مسلمان ان جتھوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتے ہیں تو وہ چھتوں پر جمع ہو جاتے ہیں، ڈھول پیٹتے ہیں تاکہ قریب کے مسلم دیہاتوں سے مدد مل سکے اور پھر حملہ آوروں پہ پتھر پھینکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن سکھوں کا حملہ سوچا سمجھا اور منظم ہوتا ہے۔ پہلے وہ رائفلوں اور بندوقوں سے فائر کرتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی چھتوں سے اُتر آئیں دوسرے مرحلے میں مکانوں کے اندر باہر سے دستی بم پھینکتے ہیں، اس سے افراتفری پھیل جاتی ہے تو پھر سکھ اپنی کرپانیں لے کر، جو خنجر کی ایک قسم ہوتا ہے اور سکھوں کا مذہبی شعار بھی ہے، اور بھالے اٹھائے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچّوں کا قتلِ عام کرتے ہیں۔ آخری مرحلے کو معمر سفید داڑھی والے سکھ انجام دیتے ہیں جو عام طور پر فوجی پنشن خوار ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہوتی ہیں۔ یہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گاؤں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ کرپانوں سے مسلح گھوڑ سوار سکھ دیہات کے چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں تاکہ اگر کوئی بھاگ نکلنا چاہے تو اسے کاٹ کے رکھ دیں۔ برطانوی انگریز افسروں نے خود ان جتھوں کو دیکھا ہے اور خوفناک نظارے دیکھے ہیں۔ ایک افسر نے چار معصوم بچوں کو دیکھا

جنہیں آگ میں بھون کر مارا گیا تھا۔[1]"

ان قربانیوں سے پاکستان کی تعمیر ہوئی!

دارالاسلام کیمپ

سید نقی علی صاحب لکھتے ہیں "۸ اگست، ۴۷ء سے مشرقی پنجاب کے فسادات شروع ہوئے اور ریلوں کی آمد و رفت مسدود ہوئی۔ مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے ساز و سامان کو ٹرکوں پر لادے ہوئے صبح سے شام تک گزرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں میں اضطراب بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ ضلع گورداسپور مسلم اکثریت کا ضلع تھا اس وجہ سے ہراس نہیں تھا۔ ۱۴ اگست کو تقسیم ملک کا اعلان ہوا تو گورداسپور کو پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان ہوا۔ لیکن چونکہ پٹھان کوٹ جموں کشمیر کی سرحد پر تھا اور ہندوستان کو کشمیر سے ملانے کا واحد راستہ ہو سکتا تھا اس لیے انگریزوں کی سازش سے ریڈکلف نے گورداسپور کو ۱۷ اگست کی شام کو ہندوستان میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ پورے ضلع کے مسلمان افسروں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ مسلمان پولیس سے ہتھیار لے لیے گئے اور چھوٹے چھوٹے گاؤں پر سکھوں اور ہندوؤں کے منظم حملے شروع ہو گئے۔ خود ہمارے ان پچیس گھروں میں ایک ہزار سے زاید مسلمان جمع ہو گئے۔ اس زمانے کے واقعات، رفقاء کی بے مثال دلیری اور نظم و ضبط، مولانا محترم کا خالص فوجی سپہ سالارانہ اندازِ ہدایات اور ہمارے اس زمانے کے نائب سپہ سالار احسان الحق صاحب کا فوجی تجربہ اس زمانے کی نمایاں چیزیں تھیں۔ میرے ذمے راشن رسانی اور مرہم پٹی تھی۔[2]"

اور یحییٰ صاحب کا کہنا ہے کہ "چاروں طرف فسادات کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے اور

---

[1] Ian Stefen: "Pakistan, Young Nation Old country" P. 15-25.

[2] چراغ راہ تحریک اسلامی نمبر۔ ص ۳۰۴

اس خون ریزی میں جماعتِ اسلامی کے دفاتر اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہم صرف پندرہ سولہ آدمی تھے۔ مولانا مودودی صاحب ان دنوں ہر چیز کی بذاتِ خود نگرانی کرتے تھے اور ہم لوگوں کو ہدایات دیا کرتے تھے۔ حفاظتی انتظامات میں بھی پیش پیش تھے اور بڑی خوبی سے ایک فوجی کمانڈر کے سے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ حفاظتی انتظامات کی مفصل منصوبہ بندی کرکے تقسیمِ فرائض کردی گئی تھی۔

ایک روز میں اور مولانا ایک چھوٹے بچے اور ایک نابینا حافظ صاحب کے ساتھ ٹہلنے کے لیے نہر کے کنارے کنارے جا رہے تھے، جب ہم پل کے قریب پہنچے تو اچانک خطرے کا الارم گونج اُٹھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی جتھا آبادی کے قریب پہنچ گیا ہے اور حملے کا خطرہ ہے پورا جنگل الارم کی آواز سے گونجنے لگا اور چاروں طرف گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہ موقع ایسا تھا کہ بچہ یا حافظ صاحب میں سے کسی کو چھوڑ کر بھاگا نہیں جا سکتا تھا۔ مولانا اس موقع پر بھی حسبِ عادت بالکل خوف زدہ نہیں تھے۔ میں حافظ صاحب کی اُنگلی تھامے ہوئے تھا اور بچے کو مولانا نے سنبھال رکھا تھا۔ قدرے تیز رفتاری سے لیکن عزم و استقلال کے ساتھ چل کر ہم لوگ کیمپ میں پہنچے تو سب ہمارے منتظر تھے۔ کیمپ میں پہنچ کر مولانا نے سب کو فالفور کرکے ہدایات جاری کیں اور مختلف لوگوں کے فرائض مقرر کر دیئے۔ کچھ لوگوں کو مورچوں پر بھیجا گیا۔ چند حضرات ناکہ بندی کے لیے روانہ کیے گئے اور کچھ لوگ آس پاس کی مسلمان آبادی کو تسلّی دینے کے لیے روانہ کیے گئے۔

مولانا کو نہ صرف بندوق چلانی آتی ہے بلکہ ان کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ وہ شکار کے شوقین ہیں۔ پٹھان کوٹ میں نہر کے کنارے خاصا گھنا جنگل تھا۔ شکار دستیاب ہونے میں کچھ مشکل پیش نہ آتی تھی اس لیے وہ شکار کے لیے عموماً جنگل میں جایا کرتے تھے۔ فسادات کے دنوں میں چونکہ ہر وقت خطرہ لاحق تھا۔ اس لیے ہر شخص کو ہدایت تھی کہ ہر دم اسلحہ اپنے ساتھ رکھے۔ کیونکہ چاروں طرف سے ہم لوگ ہندو آبادی میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ حکم صرف شدید حالات میں دارالاسلام کی حدود کے اندر کے لیے تھا۔ لیکن خطرناک فضا میں بھی رفقا کی جو ٹولیاں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی میں صلح و امن کے ماحول کے تحفظ کے لیے جاتی تھیں، ان کو ایک

چاقو اور ڈنڈا تک ساتھ رکھنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ مسلح ہو کر امن کے وعظ کہنے کو نکلنا مؤثر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ رفقاء بسا اوقات سخت خطروں میں پڑے رہے۔ اس طرزِ عمل سے علاقے پر ایک اخلاقی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

فسادات کے دنوں میں دارالاسلام کے آس پاس کے مسلمانوں کی نگہداشت بھی ہم لوگوں نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ چاروں طرف سے مسلمانوں کے قافلے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ انہیں بسانے کے لیے باقاعدہ کیمپ قائم کر دیا گیا تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب پاکستان قائم ہو چکا تھا۔ انہی دنوں ایک حادثہ رونما ہوا، جس نے لوگوں کو کسی قدر ہراساں کر دیا۔ دفتر کے ایک محافظ عبدالرحمان صاحب ایک دن کیمپ سے نکل کر کسی ضروری کام سے برابر کے مسلمان گاؤں جا رہے تھے کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔

ہم لوگوں کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو خاصے پریشان ہوئے۔ ناگزیر تھا کہ مولانا کو فوراً یہ خبر پہنچا دی جائے۔ ایک صاحب مولانا کو یہ خبر سنانے گئے۔ مولانا اس وقت ایک آم کے درخت کے نیچے کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک رفیق احسان الحق صاحب نے مولانا کو ایک طرف لے جا کر بتایا کہ عبدالرحمان صاحب شہید کر دیئے گئے۔ مولانا نے ایک خاص انداز میں انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ لیکن ان کے چہرے پر خوف و ہراس کا سایہ تک نہ آنے پایا۔ کچھ لوگ بندوقیں اور برچھیاں لے کر بھیجے گئے اور عبدالرحمان صاحب کو ایک درخت کے سائے میں دفن کر دیا گیا اس واقعہ کے بعد ہم سب لوگوں کے لیے ایک خاص حد مقرر کر دی گئی جس سے باہر جانے کی ہمیں سخت ممانعت تھی۔

اگلے دن ایک سکھ انسپکٹر پولیس اور چار پانچ پولیس کے سپاہی بستی میں آئے۔ دروازے پر پہرے دار نے انہیں روک دیا۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ ان لوگوں میں یہ جرأت کہاں سے آ گئی کہ پولیس والوں کو روک دیں۔ معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب مولانا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ اس وقت مولانا باہر نہیں آ سکتے آپ اندر تشریف لے چلیے۔ انسپکٹر صاحب اندر تشریف لائے تو دفاعی انتظامات دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ چاروں طرف مورچے بنے ہوئے تھے۔ زمین کے علاوہ مکانوں کی چھتوں پر بھی تمام انتظامات مکمل تھے۔ سکھ انسپکٹر یہ انتظامات

دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا "اِن مورچوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ لوگوں کے پاس سٹین گنیں اور برین گنیں بھی موجود ہیں۔"

اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ اس تمام آبادی میں بندوقوں کی تعداد محض دو تھی۔ ایک بندوق ناکارہ سی تھی جسے شمار کرنا فضول ہے۔ بہرحال مولانا سے مل کر انسپکٹر واپس چلا گیا۔ ان دنوں بستی میں فوجی پریڈ اور ورزش کی تربیت عام تھی اور آس پاس کے ہندو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شاید ان لوگوں کے پاس بے اندازہ اسلحہ اور جنگی سامان موجود ہے۔ دراصل ہم لوگوں کی تنظیم کو دیکھ کر آس پاس کے ہندو بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔ انسپکٹر صاحب تو چلے گئے لیکن ہم سب کو یقین تھا کہ وہ محض ہماری دفاعی تیاریاں دیکھنے کے لیے آئے تھے اور رات کو حملہ ضرور ہو گا۔

چنانچہ اس جنگ کی پوری طرح تیاریاں کر لی گئیں، دیہاتوں سے آنے والے لوگوں کو ملا کر ہمارے پاس مردوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی، ان سب حضرات کی ڈیوٹیاں مقرر کر دی گئیں۔ اس روز مولانا خود بھی ساری رات نہ سوئے اور جاگ کر چاروں طرف گشت کرتے اور پہرہ دیتے رہے۔ عورتوں کو مولانا کے مکان میں اکٹھا کر دیا گیا تھا اور انہیں ہدایات تھیں کہ مٹی کا تیل اور پتھر اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تیار رکھیں۔ جب سارے مرد ختم ہو جائیں اور حملہ آور اس مکان کی طرف پیش قدمی کریں تو عورتوں کو آخری دم تک مقابلہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ مولانا نے سمجھا دیا تھا کہ کوئی عورت خودکشی کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ لڑ کر جان دیدے[1]"۔ ——— اور رات خیریت سے گزر گئی۔

ہجرت

ملک غلام علی صاحب نے لکھا ہے "اس وقت دارالاسلام کی بستی میں ہم مرکزی ادارے کے چند گنے چُنے افراد تھے۔ مکانات ایک دوسرے سے علیحدہ تھے، چاروں طرف گھنا جنگل

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں

تھا، ارد گرد کے شہر جن میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بستے تھے دُور دُور تک مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔ ہر دم حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا، ہم میں ہر ایک شخص اگرچہ ہر وقت سر بکف رہتا تھا۔ لیکن مولانا کی ذمہ داری اس وجہ سے سب سے زیادہ کٹھن تھی کہ گشت یا پہرے اور دیگر سارے حفاظتی انتظامات آٹھوں پہر براہِ راست انہی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ وہ رات رات بھر جاگا کرتے تھے اور بار بار جا کر خود معلوم کیا کرتے تھے کہ کوئی آدمی غفلت یا نیند میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔

کچھ عرصہ اس طرح گزرنے کے بعد سرحدی فوج کے بعض مسلمان سپاہیوں نے آکر یہ پیش کش کی کہ وہ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو نکال کر لے جا سکتے ہیں۔ زائد آدمیوں کو لے جانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مولانا نے فرمایا "چاروں طرف کی مار دھاڑ سے بچ کر ہمارے ہاں بے سرو سامان مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی ہے انہیں چھوڑ کر جانا بڑی بزدلی کی بات ہے۔ ان کے دل پہلے ہی ڈوبے جا رہے ہیں اگر ہم اس نازک وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیں تو ان کے جان و مال اور عزت و ناموس کے بچاؤ کی کوئی شکل باقی نہ رہے گی۔ بعد میں رفیق گرامی غازی عبدالجبار صاحب ایک مختصر کنوائے لے کر پہنچے۔ ان کے ساتھ بھی جماعت کے افراد کے علاوہ مزید مسلمانوں کا جانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ بھی جانے سے انکار کر دیا گیا البتہ عورتوں اور بچوں کو غازی صاحب لاہور لے گئے[۱]"۔

باقی رُوداد یحییٰ صاحب سُناتے ہیں "پاکستان سے ایک اعلیٰ پولیس افسر ایک روز جیپ گاڑی اور مسلح دستہ لے کر پٹھان کوٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے مولانا سے گفتگو کی اور انہیں چاروں طرف کے حالات سے واقف کرانے کی کوشش کی کہ آس پاس کس طرح خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ بے چارے بہت بدحواس اور پریشان معلوم ہوتے تھے۔ مولانا نے انہیں اطمینان دلایا اور کہا اس طرح گھبرانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا کچھ لوگوں کے ساتھ بحفاظت پاکستان روانہ ہو جائیں۔ لیکن مولانا نے انکار کر

---

[۱] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں

دیا اور کہا اتنی بڑی آبادی کا سنبھالنا اور انہیں ضروری سہولتیں بہم پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ ان لوگوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر جانا ممکن نہیں البتہ مستورات اور بچوں کو روانہ کر دیا گیا۔

آس پاس کی آبادیوں کا ایک باقاعدہ کیمپ قائم کیا گیا تھا جنہیں راشن پہنچانے کا بھی پورا انتظام تھا، ہر شخص کے لیے دو روٹیوں کا راشن مقرر تھا۔ مولانا بھی ان دنوں دو روٹیاں کھاتے تھے، کچھ دنوں کے بعد رفقاء کے ایک گروپ کو کیمپ کا انچارج بنا کر مولانا دوسرے گروپ کے ساتھ مغربی پنجاب کو روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے کانوائے بھجوا کر پناہ گزینوں کو نکالنے کا انتظام کیا جاسکے۔ پھر بعد میں جب اس کیمپ کو فوج نے اپنے چارج میں لے لیا تو جماعت کے کارکنوں کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ کافی عرصے بعد خدا خدا کر کے فوجی قافلوں اور خاص ریل گاڑیوں کے ذریعہ ان تباہ حال لوگوں کو پٹھان کوٹ سے پاکستان لایا گیا اور یہ واقعہ ہے کہ آخر وقت تک بستی پر ہندوؤں نے حملہ نہیں کیا۔[1]"

سید مودودی صاحب ہجرت کر کے ۳۰ اگست ۴۷ء کو لاہور پہنچے۔ انہیں یونیورسٹی گراؤنڈ کے مشرق میں واقع وہ عمارت الاٹ ہوئی جہاں آج کل مدرسۃ البنات ہے۔ "لاہور پہنچ کر پہلے جماعت کو ایک بلڈنگ الاٹ ہوئی مگر لیکن کچھ عرصہ بعد چھین لی گئی اس تجربے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جماعت کی ضرورت کے لیے کوئی الاٹ منٹ نہ کرائی جائے۔ اب جماعت اسلامی نے کیمپ کی زندگی شروع کی۔ کرائے پر خیمے حاصل کیے گئے اور ایک ماہ تک ہم لوگوں نے ان خیموں میں زندگی بسر کی۔ مولانا بھی ایک خیمے میں رہتے تھے اور اپنے تمام کام خود کرتے تھے۔ وہ ہر روز مہاجرین کیمپوں کا گشت لگاتے اور ضروری ہدایات جاری کرتے۔[2]"

اور ملک غلام علی صاحب بتاتے ہیں "جب ہم لوگ لاہور پہنچے تو مرکزی ادارے کے سارے افراد کے لیے رہائشی مکانات کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ آخر کرائے کے چھوٹے

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔

[2] ایضاً۔

چھوٹے خیمے یعنی چھولداریاں لے کر انہیں ایک کھُلے افتادہ میدان میں گاڑ دیا گیا اور انہی میں ہم سب لوگ اقامت گزیں ہو گئے۔ مولانا محترم اور جماعت سے حُسنِ ظن رکھنے والوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر آ کر مولانا کے لیے مکان کی پیش کش کی اور اصرار کیا کہ کم از کم مولانا بمعہ اہل و عیال دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ خود ہماری بھی یہ دلی خواہش تھی کہ مولانا اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی تکلیف خود ہمارے لیے موجبِ تکلیف تھی۔ سردی اور برسات کا موسم قریب تھا۔ اس طرح کی خانہ بدوشانہ زندگی کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ بچوں کا ساتھ تھا، پردے کا، اُٹھنے بیٹھنے کا اور دیگر ضروریات کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ خیمے اتنے چھوٹے تھے کہ آدمی کا ان میں سیدھا کھڑا ہونا بھی محال تھا، اس کے باوجود مولانا اس طرح کی پیش کشوں کے جواب میں شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر معذرت کر دیتے تھے کہ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت۔ یہ بات مروت کے خلاف ہے کہ مَیں یا میرے بچے تو پختہ مکانوں میں رہیں اور میرے ساتھی اور ان کے بچے خیموں میں پڑے رہیں۔ بعد میں انہی خیموں میں ہم سب نے برسات اس شان سے گزاری کہ اوپر چھت سے بھی پانی برستا تھا اور نیچے زمین کا پانی بھی چاروں طرف سے اندر جمع ہو جاتا تھا۔ آخر کار تلاش کے بعد اچھرہ کی آبادی میں مسلمانوں کے چند کرائے کے مکان ایک دوسرے کے قرب و جوار میں دستیاب ہو گئے اور بد بایانہ زندگی کو خیر باد کہہ کر ہم ان مکانوں میں آ کر رہائش پذیر ہو گئے۔"[1]

سید صاحب اور ان کے رفقاء ابھی خیموں میں ہی تھے کہ سیّد صاحب اور جماعتِ اسلامی نے فیصلہ کیا کہ انہیں اپنی استطاعت کی حد تک لُٹے پُٹے مہاجرین کی امداد کرنی چاہیئے۔ اسلام اپنے معتقدین کو جس طرح خدمتِ انسانیت کے جذبہ سے سرشار کرتا ہے، اسی جذبے سے جماعتِ اسلامی کے لوگوں نے والٹن کے کیمپ میں کام کیا۔ جماعت کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ ۴۶ء میں یو پی، بہار اور پنجاب میں فسادات پھیلے تو ترجمان القرآن کے

---

[1] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔

ذریعہ ان حالات میں کام کرنے کی تفصیلی ہدایات دی گئیں۔ حکیم اقبال حسین صاحب نے جو جماعت اسلامی کے شعبۂ خدمتِ خلق کے انچارج ہیں لکھا ہے "جماعت اسلامی نے عبدالجبار غازی صاحب کی سرکردگی میں پٹنہ میں ایک ریلیف کیمپ لگایا تھا، وہ کیمپ تقریباً ایک سال تک قائم رہا اور پورے ملک سے جماعت اسلامی کے کارکنوں نے وہاں پہنچ کر کام کیا۔ وہاں جماعت نے ایک طرف اسلام کی حقیقی دعوت سے روشناس کیا اور دوسری طرف اپنے محدود وسائل کی حد تک اجڑے ہوئے خاندانوں کی آبادکاری کا کام کیا۔ اسی زمانے میں دہلی کے قریب میوات کے علاقے میں ہندوؤں کے مسلح جتھوں نے میواتیوں کی بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیں۔ اس وقت دہلی کی جماعت اسلامی نے مسلسل تین ماہ تک اپنے کارکنوں کو بھیج کر جس حد تک اس کے لیے ممکن تھا ان کی آبادکاری کا کام کیا"[1]۔

سیّد صاحب رقم طراز ہیں "مشرقی پنجاب کے ہنگامۂ قیامت سے گزر کر (جماعتِ اسلامی کے متعلقین) پہنچے۔ ہم نے فرداً فرداً ان کے حالات کا تفحص کیا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ صرف ارکانِ جماعت ہی نہیں، جماعت کے ہمدرد اور متاثرین تک ہمت و جرأت اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دے کر آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی لیگ کے لیڈروں کی طرح بھاگنے والوں میں سب سے آگے نہ تھا۔ کسی نے بزدلی نہیں دکھائی۔ کسی نے خود غرضی سے کام نہیں لیا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خطرے اور مصیبت میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہا۔ ہر ایک نے اپنی استطاعت کی حد تک مظلوم مسلمانوں کو بچانے، سنبھالنے اور منظم طریقہ سے نکالنے کی کوشش کی۔ بہت سوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کام کیا اور اکثر و بیشتر اپنے علاقوں سے اس وقت نکلے جب وہ مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔

دوسری آزمائش مغربی پاکستان میں پیش آئی جہاں سے غیر مسلم نکل رہے تھے۔ یہاں بھی ہم نے پوری دقتِ نظر کے ساتھ جماعت کے رویّہ کا جائزہ لیا۔ اور یہ معلوم کر کے ہمیں اطمینان ہوا

---

[1] چراغ راہ تحریک اسلامی نمبر۔ ص ۲۲۳

کہ جماعت کے ارکان ہی نہیں ہمدردوں اور متاثرین تک میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے کشت و خون یا لوٹ مار میں کوئی حصّہ لیا ہو۔ بعض مقامات پر تو پوری پوری بستیوں میں اگر لوٹ سے بچنے والے کچھ لوگ پائے گئے تو وہ صرف وہی لوگ تھے جنہوں نے جماعت اسلامی کا اثر قبول کیا تھا۔ متعدد مقامات پر جماعت کے لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی غیر مسلموں کو پناہ دینے میں تامّل نہ کیا اور کوئی ایک اطلاع بھی ہمیں ایسی نہیں ملی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا دامن کسی غیر مسلم عورت کی آبروریزی سے آلودہ ہوا ہو حالانکہ اس کے مواقع کی اس وقت کمی نہیں تھی۔

کراچی، پشاور، سیالکوٹ، سرگودھا، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں مجموعی طور پر جماعت کے تقریباً سات سو ارکان اور ہمدردوں نے پناہ گزینوں کی خدمت کا کام کیا۔ ان کارکنوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جو پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے اور ابھی کہیں جمنے بھی نہ پائے تھے۔ پھر بھی وہ خدمت کی پکار پر لبیک کہنے سے باز نہ رہے۔ ان لوگوں نے ایثار، جفاکشی، ہمدردی، دیانت، امانت، عفت اور نظم و ضبط کا پورا امتحان دیا اور نتیجہ میں کم از کم جو چیز ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ان اوصاف میں نہ حکومت کے عمّال ان سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ قومی جماعتوں کے کارکن۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے سات سو آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ناقابلِ اعتماد ثابت ہوا ہو اور جہاں تک نظم کا تعلق ہے دو تین خفیف شکایتوں سے زائد کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی۔"[1]

مرکز

ہجرت کے بعد سے اچھرہ کی جس کوٹھی میں سیّد مودودی صاحب کا اب تک قیام ہے وہ ذیلدار پارک میں ۵ - الف نمبر کی کوٹھی ہے۔ جس میں "کوٹھی" والا کوئی شکوہ اور دبدبہ نہیں ہے۔ اس کی ملکیت ایک ادارے کے پاس ہے۔ سیّد صاحب کے اہلِ خانہ اسی

---

[1] جماعت اسلامی اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل

کوٹھی کے پچھلے حصّے میں رہتے ہیں جس کا سیّد صاحب کرایہ دیتے ہیں۔ اس کوٹھی میں داخل ہوں تو اس کے مشرقی حصّے میں جماعت اسلامی کے دفاتر ہیں۔ قیّم جماعت، معاونِ امیر جماعت، استفسارات، نشرو اشاعت، پارلیمانی امور اور نائب امیرِ جماعت کے دفاتر وغیرہ اس میں ہیں۔ عین درمیان میں امیرِ جماعت اسلامی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا مرکزی کمرہ ہے جس میں ترتیب سے رکھی بڑی بڑی الماریوں میں ضخیم علمی کتابیں رکھی ہیں۔ سیّد صاحب کی کرسی کے سامنے ایک بڑی میز پھیلی ہوئی ہے جس پر قرینے سے لکھنے کا سامان اور کچھ کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ ایک کتاب اٹھاتے ہیں تو یہ ایک تفسیر ہے جس کے حاشیے پہ کالی پنسل سے چھوٹے چھوٹے اور نفیس حروف میں سیّد صاحب نے جابجا نوٹ لکھ رکھے ہیں۔ یہ کمرہ خیالات و افکار کا گویا سب سے بڑا بجلی گھر ہے جہاں سیّد صاحب سوچتے ہیں، اپنے خیالات کو قلم بند کرتے ہیں اور پھر افکارِ تازہ کی رَو پاکستان اور پورے عالمِ اسلام میں پھیلا دیتے ہیں۔

جماعت کے لوگ اسی کوٹھی کو اختصار سے "مرکز" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مرکزی جماعت اسلامی کا صدر دفتر ہے۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس یہیں ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے بڑے بڑے فیصلے اسی جگہ ہوئے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی زندگی کے تمام مسائل اور تفاصیل یہیں طے ہوئیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔ سیّد صاحب نے اسلامی قانون، اسلامی ریاست، خلافت و ملوکیت اور تفہیم القرآن جیسے شاہکار اسی جگہ لکھے۔ سوئے دار لے جانے کے لیے سیّد صاحب کو اسی جگہ سے گرفتار کیا گیا۔ باقی تینوں مرتبہ بھی وہ یہیں سے سوئے زنداں گئے۔ چنانچہ یہ کوٹھی واقعی ایک ایسا "مرکز" ہے جہاں جماعت اسلامی کی بیشتر تاریخ لکھی گئی۔

آپ کو شام کے وقت مرکز جانے کا اتفاق ہو تو اندر داخل ہوتے ہی چھوٹا سا سبزہ زار ہے۔ آپ تین سیڑھیاں اتر کر اس لان میں جاتے ہیں تو سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب درمیان میں آرام کرسی پہ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ عصر تا مغرب کی محفل جمی ہوئی ہے۔ سیّد صاحب کے دو اطراف کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ حاضرین میں مقامی لوگ ہیں، مغربی پاکستان کے دُور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے لوگ ہیں، کبھی کبھار مختلف مسلمان ممالک کے لوگ بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حاضرین میں چھوٹے بڑے، نوجوان اور بوڑھے، طلبہ و اساتذہ، علماء اور صحافی معتقدین

اور معترضین غرض ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں ۔

لوگ اپنے انفرادی معاملات اور جماعتی مسائل میں سیّد صاحب کی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں ۔ حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ لوگ سیّد صاحب سے اسلام کے علمی و عملی مسائل پوچھتے ہیں ۔ آپ اس محفل میں آنے والے لوگوں کے اشتیاق اور خلوص کو دیکھتے ہیں ، ان کی آنکھوں میں سید صاحب کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبات پڑھتے ہیں تو آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ واقعی مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی ۔ جب آپ معلوماتی اور عالمانہ گفتگو سنتے ہیں ، ہلکی پھلکی باتوں سے محفل مسکراہٹوں سے معمور ہو جاتی ہے ، سیّد صاحب کی باتوں سے سوز و سرورِ انجمن کا سامان ہوتا ہے تو اس خوشگوار فضا میں آپ کو علاّمہ اقبال مرحوم کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے :

ع نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

حصّہ سوم

آزمائش کا مرحلہ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
مَیں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خُرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند
پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

اقبالؒ

باب ۱۹

مطالبہ نظامِ اسلامی

فیصلہ کن اقدام

پاکستان قائم ہوتے ہی جماعتِ اسلامی آزمائش کے دور میں داخل ہوئی۔

برِصغیر پاک و ہند کی سیاسی تقسیم ہوئی تو اس نے مسلم لیگ کی طرح جماعتِ اسلامی کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے حالات اور مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ اس لیے دونوں ملکوں میں ایک قیادت، ایک پالیسی، ایک دستورِ جماعت اور ایک طریقِ کار سے کام کرنا ممکن نہ رہا۔ سیّد مودودی صاحب نے اپریل ۴۷ء میں اپنی مدراس والی تقریر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ نئے بننے والے دونوں ملکوں میں جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار میں فرق واقع ہو جائے گا۔ چنانچہ تقسیم کے بعد جوں ہی حالات ذرا نارمل ہوئے اور خبر رسانی کے ذرائع بحال ہوئے تو جماعتِ اسلامی بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی۔ بھارت میں جماعت کے ارکان کی تعداد ۲۴۰ رہ گئی۔ وہاں نیا نظام قائم ہوا تو مولانا ابو اللیث اصلاحی صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی ہند منتخب ہوئے۔ پاکستان میں کچھ ارکانِ جماعت ہجرت کر کے آ گئے۔

پہلے سے موجود اور نئے آنے والے ارکان کی کُل تعداد گویا قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۳۸۵ تھی۔ اس سے جماعتِ اسلامی پاکستان نے اپنے کام کا آغاز کیا، جس کے امیر سیّد مودودی صاحب ہی رہے۔

جماعتِ اسلامی پاکستان نے حالات کا جائزہ لیا تو پاکستان بننے کے بعد اہم ترین واقعہ یہ ہوا تھا کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر پاکستان آنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جبری ہجرت سے نہ صرف مشرقی پنجاب سے مسلمان پاکستان میں آئے بلکہ بہار اور باقی بھارت سے بھی لاکھوں کی تعداد میں مسلمان مشرقی اور مغربی پاکستان میں آکر آباد ہوئے۔ یہاں سے بھی ہندو اور سکھ چلے گئے تو مغربی پاکستان ۹۰ فی صدی اور مشرقی پاکستان ۸۰ فی صدی مسلم آبادی کا ملک بن گیا۔ اور قیامِ پاکستان سے پہلے کچھ لوگوں کا یہ اعتراض ختم ہو گیا کہ اگر پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کیا گیا تو پاکستان میں موجود مؤثر غیر مسلم اقلیت اس کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہو گی۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ قائدِ اعظم انتہائی محنت کرنے کی وجہ سے مضمحل ہو گئے۔ قدرت نے ان سے قیامِ پاکستان کی عظیم خدمت لینا تھی ان کی ذات نے اپنا مشن مکمل کر لیا تو ان کی صحت جواب دے گئی۔ جس بیماری کو انہوں نے اپنی قوتِ ارادی سے ٹالا ہوا تھا، بالآخر اس نے اپنا اثر دکھایا اور وہ زیارت جانے پہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے زندگی کے باقی دن وہیں گزارے۔ مسلم لیگ کے سر پہ نہ صرف یہ کہ قائدِ اعظم کا ہاتھ نہ رہا بلکہ پاکستان حاصل کر لینے کے بعد مسلم لیگ کے سامنے کوئی نصب العین بھی نہ رہا اور ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کے آفتابِ اقتدار کو طلوع ہوتے دیکھ کر جتنے یونینسٹ اور مفاد پرست عناصر مسلم لیگ میں آگھسے تھے اب انہوں نے پَر پُرزے نکالے۔ پھر سندھ اور پنجاب کی صوبائی وزارتوں میں لیگیوں نے ہی ایک دوسرے کی وہ سر پھٹول کی اور بلوچستان میں قاضی عیسیٰ اور سرحد میں قیوم خان نے اپنے دشمنوں کے ساتھ وہ سلوک کیے کہ مسلم لیگ کا وقار خاک میں مِل گیا۔

تیسری اہم بات یہ ہوئی کہ آزادیٔ ہند کے قانون کی رُو سے ۱۹۳۵ء والا انگریزی لادینی دستور ایک عارضی اور عبوری دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی

کو یہ فریضہ سپرد ہوا کہ وہ عوام کی خواہشات کے مطابق نیا دستور بناتے۔ دستور ساز اسمبلی میں متعدد اور مؤثر اراکین اس بات پر پر تول رہے تھے کہ وہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس وغیرہ کے دساتیر سے خوشہ چینی کر کے پاکستان کے لیے ایک نیا لادینی دستور بنا دیں اور اس ضمن میں وہ قائد اعظم کا حوالہ دیتے۔ جنھوں نے ترکِ وطن کر کے پاکستان سے جانے والے ہندوؤں وغیرہ کی ڈھارس بندھانے کے لیے ۱۴ اگست ۴۷ء والی تقریر میں اقلیتوں کو وطن نہ چھوڑنے کی ترغیب دی اور حفظ و امان کا یقین دلاتے ہوئے کہا تھا:

"آپ کسی مذہب، فرقہ یا عقیدہ سے تعلق رکھیں، اس کا کاروبارِ سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم اس بنیادی اصول سے اپنے نظام کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں اور مساوی الحیثیت۔ ہمیں اس مسلک کو اپنے نصب العین کے طور پر سامنے رکھنا چاہیئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا اور نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ تو ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہو جائیں گے۔"

قائد اعظم مرحوم کے ان الفاظ کو ان کے سیاق و سباق سے نکال کر دستور ساز اسمبلی کے اراکین لادینی دستور کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان الفاظ کا یہ مطلب نکالا کہ پاکستان کو ایک سیکولر یعنی لادینی ریاست ہونا چاہیئے۔ حالانکہ جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کی پوری قیادت نے بار بار کے وعدوں سے پورے برِّ صغیر کے مسلمانوں کو یقین دلا دیا تھا کہ پاکستان میں خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر چلنے والی اجتماعی زندگی قائم کی جائے گی اور جس ایک ہی نعرے نے تحریکِ پاکستان، مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی وہ نعرہ تھا پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

قائد اعظم مرحوم نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنے اسی عزم کا اظہار کیا۔ لادینی دستور لانے والے نہ جانے قائد اعظم کے ان الفاظ کو کیسے بھول جاتے ہیں جو انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی (بلوچستان) دربار سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے ——— "میرا ایمان ہے کہ

ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبرِ اسلامؐ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصوّرات اور اصولوں پر رکھیں۔"

سیّد مودودی صاحب نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا ——— "عوام تو درکنار اچھے خاصے نامور علماء تک اسلامی ریاست کا بس یہ تصوّر رکھتے تھے کہ حکومت چاہے جیسی اور جس اصول پر بھی ہو، اس میں ایک شیخ الاسلامی کا منصب قائم ہو جائے اور نکاح و طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے قضائے شرعی کا انتظام کر دیا جائے۔ ہمارے مذہبی طبقوں کی طرف سے جو مطالبات اس وقت پیش ہونے شروع ہوئے تھے وہ محض شراب کی بندش، قحبہ خانوں کے سدِّباب، بیت المال کے قیام اور ایسے ہی چند جزئیات پر مشتمل تھے .... اور ہماری قوم کے قائدین نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی اُلجھی اُلجھی اور متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سُنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکرے گروہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے۔ وہ یکایک کسی غلط نظریئے کو اس مملکت کی بنیاد بنا بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے[۱]۔"

چنانچہ لاہور میں جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ جس میں تقسیمِ ہند اور ہجرت کی وجہ سے منتشر، بے گھر اور اُجڑے ہوئے ارکان اور متفقین جماعت کا جائزہ لیا گیا۔ کام کی نئی صورتوں پر غور ہوا۔ سیّد صاحب نے شوریٰ کو بتایا کہ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ عوام و خواص دونوں کو صحیح اسلامی ریاست کا صاف اور واضح تصوّر دیا جائے۔ جس کے بارے میں اب تک

۱؎ تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

وہ صرف نعرے ہی لگانے کے عادی رہے ہیں ۔ ان کے شعور کو اسلام کے اجتماعی نظامِ زندگی کے لیے اتنا بیدار کر دیا جائے کہ دستور ساز اسمبلی اسلامی نظام کے علاوہ اور کوئی نظام تجویز ہی نہ کر سکے اور ہر طرف سے اسلامی نظام کی آواز بلند کی جائے۔

جماعت اسلامی کا یہ فیصلہ جماعت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا جس کے بعد جماعت کا رُخ عملی سیاست کی طرف پھر گیا۔ جماعت اسلامی خلوت نشینی سے باہر آئی۔ پہلے ان کا طریقہ یہ تھا کہ جماعت کا لٹریچر پھیلاتے تھے، نجی گفتگوؤں سے صالح افراد کی تلاش کرتے تھے، انہیں نظمِ جماعت میں لا کے تربیت دیتے تھے۔ اب جماعت کے ہر اس رکن کو جو ذمہ دارانہ طریقہ سے بول سکتا تھا، تقریر کا مجاز کر دیا گیا اور پاکستان کے گوشے گوشے میں جلسے کر کے عوام کو یہ بتایا گیا کہ آزاد ہو جانے کے بعد اب مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اسلام کیا نظامِ زندگی دیتا ہے۔ اسلامی ریاست فی الواقع کس قسم کی ریاست ہے۔ جس کے قیام کے لیے انہوں نے جان، مال اور آبرو کی اتنی بھاری قربانی دی ہے۔

جماعت اسلامی کا یہ فیصلہ ایک فیصلہ کن اقدام تھا کہ جس قدم کے اُٹھا لینے کے بعد پیچھے پلٹ کر جانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اسلامی قانون اور اس کا نفاذ

ریڈیو پاکستان لاہور نے سید مودودی صاحب کو تقاریر کے لیے مدعو کیا تو ۶ جنوری ۴۸ء کو سید صاحب نے "اسلام کا اخلاقی نظام" پہ تقریر کی پھر ۲۴ جنوری، ۱۰ فروری، ۲ مارچ اور ۱۶ مارچ ۴۸ء کو اسی سلسلے کی باقی تقاریر "اسلام کا سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور رُوحانی نظام" نشر کیں، یہ تقاریر "اسلام کا نظامِ حیات" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی، عربی، تامل اور بنگالی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سید صاحب کی ساری کتابوں میں اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے غالباً کوئی کتاب اس کی ہم پلہ نہیں ہے۔ ان مختصر اور (To the Point) تقاریر کے بارے میں بآسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس ننھی سی کتاب میں اسلامی زندگی کی معلومات کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

۶ر جنوری ۱۹۵۸ء کو سیّد صاحب نے لاء کالج لاہور میں ایک اہم تقریر کی۔ آپ نے تعلیم یافتہ اور قانون دان طبقہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا ——— "آج کسی ملک میں ——— غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں ——— اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جائے، تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے۔ جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی سوسائٹی اور سٹیٹ کی ضرورت کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذّب دَور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائیں گی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بِکا کریں گے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقہ کی فقہ جاری ہو گی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلّط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں اور یہ برسات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے۔"

سیّد صاحب کی اسلامی قانون پر کی ہوئی یہ تقریر ایک طرف علمِ قانون سے ان کی گہری واقفیت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف ان کے تفقہ فی الدین کی غمازی کرتی ہے۔ قانون، اِسلامی قانون اور شریعت کی تفصیلی وضاحت کے بعد بتایا ہے کہ شریعت کے بعض احکام کے متعلق غلط فہمیوں کی عام وجہ یہ ہے کہ لوگ اسلامی قانون کے ایک جُز کو پُورے نظامِ اسلامی کے ایک پُرزے کی حیثیت میں نہیں دیکھتے۔ وہ اس جُز کو ایک مختلف اور غیر اسلامی مشین میں فِٹ کر کے دیکھتے ہیں تو ناموزوں پاتے ہیں اور اس جُز کی شکایت کرتے ہیں۔ مثلاً سیّد صاحب کے الفاظ میں:

"بلاشبہ اِسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لیے نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ اسے اسلام ہی کی سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا۔ جس کے مال داروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو، جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لیے کُھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن کی ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب

لوگوں کے لیے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسبِ معاش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں، جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرے ہوؤں کا سہارا دینے کا عام چرچا ہو اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تُو مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تُو پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔

یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لیے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سُود کے بغیر نہیں دیتا، جس میں بیت المال کی جگہ بینک اور انشورنس کمپنی ہے، جس میں حاجت مند کے لیے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھتکار اور پھٹکار ہے، جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصّہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے، جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعہ سے ان کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے، ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جُرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت پیشِ نظر ہے۔

اس کے برعکس اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لیے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ خود ہی رضاکارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو، پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اس کے لیے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرت ناک سزا تجویز کرتا ہے کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔"

اس فاضلانہ تقریر کے آخر میں سیّد صاحب نے اسلامی قانون پہ اٹھائے جانے والے

تمام اعتراضات کا باری باری تسلّی بخش جواب دیا۔ فقہی اختلافات کا اعتراض کرنے والوں کو کہا:

"اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتدا سے آج تک یکساں مسلّم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں۔ تعبیرات احکام میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں اور دائرہ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوتے ہیں...... آگے آنے والے معاملات میں حکمِ خدا اور رسولؐ کی جس تعبیر یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اصحاب حلّ و عقد کا اجماع ہو جاتے گا یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کرے گی، وہ ہمارے ملک کے لیے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاویٰ پر مشتمل ہوتا تھا۔ جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلّم ہوتے تھے اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کون سی صورت تجویز کی جا سکتی ہے...... قلیل التعداد گروہ پرسنل لاء کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیئے۔ لیکن قانونِ ملکی بہر حال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔"

۱۹ فروری ۴۸ء کو اسی جگہ لاء کالج میں ایک اور تقریر کی۔ جو مذکورہ بالا تقریر کا دوسرا حصّہ تھی۔ اس میں بتایا کہ اسلامی قانون پاکستان میں اب کس طرح تدریج کے ساتھ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں تقاریر "اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر" کے عنوان سے اکٹھی شائع ہو چکی ہیں۔ سیّد صاحب نے اس دوسری تقریر میں کہا کہ یہ غلط فہمی ہے کہ نظامِ حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی پچھلے تمام قوانین یک لخت منسوخ ہو جائیں گے۔ فطرت کا قانون ہے کہ اجتماعی زندگی میں بتدریج انقلاب آتے ہیں۔ ایک مستحکم اور پائیدار انقلاب کے لیے لازمی ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں پورے توازن کے ساتھ کار فرما ہو کہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشے کو سہارا دے سکے۔

"قرآن اور حدیث کے غائر مطالعہ سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپؐ نے

یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ وراثت کا قانون ۲ھ میں جاری کیا گیا، نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ۷ھ میں جا کر مکمل ہوئے، فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کر کے نافذ کیے جاتے رہے، یہاں تک کہ ۸ھ میں ان کی تکمیل ہوئی، شراب کی بندش کے لیے بتدریج فضا تیار کی گئی اور ۸ھ میں اس کا قطعی انسداد کر دیا گیا، سود کی برائی اگرچہ مکہ ہی میں صاف صاف بیان کی جا چکی تھی مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے یک لخت بند نہیں کر دیا گیا، بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب نئے سانچوں میں ڈھال لیا گیا تب کہیں ۹ھ میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا سا کام تھا، جس نے اپنے پیشِ نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لیے کاریگر اور مزدور جمع کیے، ذرائع و وسائل مہیّا کیے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا ہوا اوپر تک لے گیا اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل کر دی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔"

سیّد صاحب نے بتایا کہ اب پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی اس بات کا اقرار کرے کہ پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر تمام قوانین اسلام کے مطابق بنائے جائیں۔ پھر جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظامِ زندگی کو ڈھالنا بھی چاہتے ہوں۔ پھر قوم کی اجتماعی زندگی کی ہمہ گیر اصلاح کے لیے اس کے تمام شعبوں کے لیے ایک عظیم منصوبہ بنایا جائے۔

"تعلیم کا نظام بدلا جائے، ریڈیو، پریس، سینما اور خطابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں، معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے، سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج ان عناصر کو خارج کیا جائے جو پرانے فاسقانہ و کافرانہ نظام کی عادات و خصائل میں ڈھل کر سُوکھ چکے ہیں اور ان نئے عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں، معاشی نظام میں بنیادی

تبدیلیاں کی جائیں اور اس کا پورا ڈھانچہ جو پرانی ہندوانہ اور جدید فرنگیانہ بنیادوں پر چل رہا ہے، ادھیڑ ڈالا جائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پورے نظم و نسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کر دے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدل ڈالا جا سکتا ہے اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جائے ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں باقی نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے نہ رہ جائے۔"

مطالبۂ نظامِ اسلامی

لاء کالج میں سید مودودی صاحب کی ۶؍جنوری ۴۸ء کی اسلامی قانون والی تقریر گویا نقطۂ آغاز تھا کہ جماعتِ اسلامی نے عوام و خواص کے سامنے اسلامی ریاست کا تصور پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ سید صاحب نے گویا اپنی تقریر سے اس مہم کا افتتاح کر دیا۔ پھر جہلم، گجرات، سرگودھا اور میانوالی میں جماعتِ اسلامی کے ضلعی اجتماعات منعقد ہوئے۔ جنہیں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب (جنہوں نے کچھ ہی عرصہ بعد اسلامی ریاست کے چار مباحث پر کتب تحریر کیں) اور محمد عبدالجبار غازی صاحب نے ۲۹؍جنوری سے ۹؍فروری ۴۸ء تک خطاب کیا، عوام کو آزادی کے اسلامی تقاضوں سے آگاہ کیا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"جب کوئی حکومت مسلمان بننے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کے لیے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ وہ پہلے اپنے دائرے کے اندر شادی بیاہ اور نکاح و طلاق سے متعلق اسلامی قوانین جاری کر دے یا کچھ مولویوں کو بھرتی کر کے پولیس کو نماز پڑھانے کی مہم جاری کر دے۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے کانسٹی ٹیوشن (دستور) کی زبان سے جو کسی سٹیٹ کے ارادۂ عمومی (General Will) کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ خدا کی حاکمیت اور محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واجب الاطاعت لیڈر ہونے کا اقرار کرے۔ یہ اقرار کر لینے کے بعد سٹیٹ نے گویا کلمۂ طیبہ پڑھ لیا۔ اب اس کو مہلت دی جائے گی کہ جس ترتیب و تدریج کے ساتھ اسلام کے اجتماعی قوانین اختیار کرنے کی اسلام میں ہدایت کی گئی ہے، اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ وہ اسلام کے تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی ضابطوں کو اختیار کرنا شروع کر دے۔ یہاں تک کہ ایک دن پورے طور پر اسلام کے رنگ میں رنگ جائے اور اس کی زندگی کے کسی گوشے میں بھی جاہلی نظامِ زندگی کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔"

سید مودودی صاحب نے لاء کالج میں ۱۹ فروری ۴۸ء والی تقریر میں دستورِ اسلامی کا مطالبہ پیش کر دیا تھا۔ لیکن انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سرکارِ برطانیہ کے نقشِ قدم پہ چلنے والی موجودہ قیادت کسی بھی مطالبے پر خواہ وہ کتنا ہی معقول، درست اور صحیح کیوں نہ ہو توجہ دینے کے لیے تیار نہ ہو گی جب تک اس مطالبے کے پیچھے عوامی طاقت نہ ہو گی۔ چنانچہ اس مطالبے کو عوامی بنانے کے لیے جماعتِ اسلامی نے ایک جامع پروگرام بنایا، عوام تک اس آواز کو پہنچانے کے لیے عوامی خطابات رکھے، سب سے پہلا جلسہ پاکستان کے اس وقت کے دارالحکومت کراچی میں مارچ ۴۸ء میں منعقد کیا۔ یہ جماعتِ اسلامی کا پہلا عوامی جلسہ تھا۔ سید صاحب نے ان الفاظ سے اپنے خطاب کا آغاز کیا:

"حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم گزر رہے ہیں ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوئے ہیں، ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقعہ پر جو فیصلہ بحیثیت قوم ہم کریں گے۔ وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پہ بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیادیں کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں، ہماری ساری کی ساری زندگی ـــــــ ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست غرض سب کچھ ان اصولوں پر استوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے

نظامِ زندگی کو قبول کر لیں۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظامِ زندگی ہو۔"

سید صاحب نے بھارت کے مسلمانوں کی حالتِ زار کی مثال دیتے ہوئے کہا :

"اب اگر وہاں کوئی مسلمان رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ اس میں اسلام کی بُو بھی باقی نہیں ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو آئندہ دس سال میں ہندوستان میں مسلمان کا وجود عنقا ہو جائے گا۔ ہمارے اسلاف نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی کوششوں سے پھیلایا تھا وہ اب آٹھ سو سال کے بعد پاکستان کے دو خطّوں میں سُکڑ کر رہ گیا ہے۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا اور اس برِّ عظیم ہند کے تین چوتھائی حصّے سے تو اسلام دوسروں کے مٹانے سے مٹ رہا ہے۔ یہاں یہ ہمارے اپنے مٹانے سے مٹے گا۔ اس لیے اب ہمیں اگلا قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ اب صرف ایک ٹھوکر ہمارے اور اسلام کے مٹنے میں حائل ہے۔ اگر ہم نے اس موقعہ پر ٹھوکر کھائی تو ہمارے اسلاف کے دینی کارنامے کی ساری تاریخ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔"

آخر میں سید صاحب نے مطالبہ نظامِ اسلامی پڑھ کر سُنایا۔ یہی تقریر سید صاحب نے بعد ازیں لاہور، راولپنڈی، ملتان، سیالکوٹ اور پشاور میں کی اور یہاں بھی مطالبہ نظامِ اسلامی دہرایا، جو بعد ازیں جماعتِ اسلامی کی مہم کا مرکز و محور بن گیا اور چار نکاتی مطالبہ کے نام سے مشہور ہوا۔

"چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدّ و جہد اور قربانیاں صرف اسی خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں ——

لہٰذا اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ :

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے اور حکومتِ پاکستان کی کوئی حیثیت

اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اِسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں، منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

۴۔ حکومتِ پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔"

شاہ ضرب

سیّد مودودی صاحب نے عوام کو بتایا کہ اس مطالبے کو منوانے کا طریقِ کار کیا ہوگا ——

"ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اٹھایئے اور جن صحیح اور مؤثر تدابیر کو آپ نے اس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے۔ ان سب کو نظامِ اسلامی کے مطالبے کے لیے بھی اختیار کیجیے۔ یہ مطالبہ بھی مخلصانہ کوشش چاہتا ہے۔ یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پُورا کر کے آپ یہ ثابت کر دیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لیے جلسے کیجیے، اس کے لیے ریزولیشن پاس کیجیے، اس کے پوسٹر آویزاں کیجیے، اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں لکھوایئے، اسے اپنی خط و کتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرایئے، تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے بچے بچے کی زبان پر ہوں۔"

اور ابھی سیّد مودودی ان تقاریر کے سلسلے میں پشاور تک نہیں پہنچے تھے کہ جماعت اِسلامی کے ہزاروں کارکن میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ پاکستان (زیادہ تر مغربی پاکستان) کے بڑے اور چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں دیواروں پر "ہمارا مطالبہ —— اِسلامی دستور" کے موٹے موٹے الفاظ دُور سے ہی نظر آنے لگے۔ دوسرے فقرات "حاکمیت صرف خدا

کی ـــــــــ پاکستان کا قانون اسلامی شریعت" وغیرہ ہر آنے جانے والے کو یہ احساس دلانے لگے کہ اصل کام جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا وہ تو یہ ہے، جس کے لیے ہم نے کروڑوں اور اربوں روپے کی جائیداد مشرقی پنجاب اور باقی ہندوستان میں چھوڑی، ہزاروں معصوم بچوں کو یتیم کروایا، لاکھوں شیشہ ہائے عصمت چور ہوئے اور خون کے دریا بہائے گئے، مطالبہ نظامِ اسلامی کے کتبے اور دیواری عبارتیں ـــــــــ "پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کی صدائے بازگشت معلوم ہونے لگیں۔

ابھی حکومت اور اخبارات جماعت اسلامی کے خلاف نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسے بے ضرر سی تبلیغی جماعت سمجھتے تھے۔ اس لیے اخبارات میں ان کے جلسوں کی رُودادیں آتیں، ان کے خیالات پھیلتے، شہروں کے ہر موڑ پر، اڈے پہ، سٹیشن پر اور ہر ایک مسجد میں مطالبہ نظام اسلامی کے پوسٹر لگ گئے۔ مساجد میں خطیبوں نے اس مطالبے کے حق میں خطبے دیئے اور لوگوں نے اس کے حق میں ہاتھ بلند کیے۔ جماعت اسلامی نے مقامی طور پر چھوٹے چھوٹے جلسے کر کے اس مطالبے کو عام کیا۔ جماعت کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے وکیلوں، پروفیسروں، افسروں اور پڑھے لکھے لوگوں کو مطالبے کے حق میں قائل کیا۔ اس طرح نہ صرف مطالبہ نظامِ اسلامی عوامی مطالبہ بنتا چلا گیا بلکہ جماعت اسلامی بھی رابطۂ عوام سے عوامی جماعت بننے لگی۔ اس کا حلقۂ تعارف تیزی سے پھیلنے لگا۔

جماعت اسلامی نے مطالبہ نظامِ اسلامی کی پیش قدمی کر کے اپنے طریقِ کار میں ایک اہم تبدیلی کی۔ سید مودودی اور جماعت اسلامی نے پہلے سے کوئی سکیم نہ ہوتے ہوئے بھی یہ جو نیا قدم اٹھایا، یہ ان کا اجتہاد تھا۔ سیاسی بصیرت، تنظیمی قابلیت اور مدبّرانہ قیادت نے مضبوط کردار لوگوں کی قوت کے ساتھ مل کر اس مطالبے کو پاکستان کے دس کروڑ باشندوں کی اکثریت کا مطالبہ بنا دیا۔ سید صاحب نے اس اقدام کے بارے میں ماچھی گوٹ کے اجتماع ۵۷ء میں بڑی دل لگتی بات کہی ـــــــــ "ہم نے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ٹھیک موقعے پر یہ رائے قائم کی کہ کشمکش کا آغاز کرنے کے لیے اسلامی دستور کے مطالبے سے زیادہ موزوں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اس کے سوا جس دوسری چیز کو بھی ہم نقطۂ آغاز بناتے، وہ ایک شاہ ضرب کا کام نہ

دے سکتا تھا"

اور مطالبہ نظامِ اسلامی واقعی ایک شاہ ضرب تھا!

لیگی حکومت بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اسلام کا نام لے کر ہی تو وہ دس سال سے عوام کی ہمدردیاں جیتتے ہوئے تھی۔ اب وہ چپ چاپ لادینی دستور بنا دیتی تو عوام کالانعام کو پتہ بھی نہ چلتا۔ لیکن اب واسطہ ایک ایسے 'مولوی' سے آپڑا تھا جو نِرا مولوی ہی نہ تھا، ان سے بڑھ کر مسٹر اور دستور و قانون کا ماہر تھا۔ اس نے نہ صرف علمی و عقلی میدان میں ثابت کر دیا تھا کہ پاکستان میں صحیح اِسلامی دستور اور قانون نافذ ہونا چاہیئے بلکہ اس مطالبے کے لیے ایک منظم، سنجیدہ اور مستحکم عملی تحریک اٹھائی تھی۔ جو پروپیگنڈے کے جدید ہتھیاروں سے لیس تھی۔ پھر عوام کی ہمدردیاں بھی اس مطالبے کے ساتھ وابستہ تھیں۔ کیونکہ اسلام سے محبت تو ہمارے عوام کے لاشعور تک میں بیٹھی ہوئی ہے۔

جماعت اِسلامی کی یہ مہم تین مہینوں میں ہی اتنی تیزی اور شدت کے ساتھ پھیلی کہ برسرِاقتدار طبقہ اس مہم سے بوکھلا اٹھا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ کھُل کر اس کا مقابلہ کرتا تو عوام میں بدنام ہو جاتا۔ اس لیے انہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق سیّد مودودی صاحب اور جماعت اِسلامی کو بدنام کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کا آغاز اس بات سے کیا کہ یہ جماعت قیامِ پاکستان کی مخالف تھی۔ چنانچہ ۱۶ رمئی ۱۹۴۸ء کو روزنامہ انجام کراچی کے شمارے میں ایک بڑے لیگی لیڈر اور حاکم کا بیان شائع ہوا۔

"مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سرگرمیاں حکومتِ پاکستان کے لیے تشویش ناک بن گئی ہیں۔ چنانچہ ان کی حرکات وسکنات کی نگرانی کے لیے خفیہ پولیس مامور کر دی گئی ہے۔ نیز حکومت کے مختلف شعبہ جات میں مولانا مودودی کے پیرووں کے خلاف بھی خفیہ ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ دنوں حکومت کے اہم ترین محکمہ کے چند ملازمین نے جو جماعت اِسلامی کے پیرو ہیں۔ یہ مطالبہ کیا کہ محکمہ کے نظم ونسق کو خالص

۱؎ تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل۔

اسلامی طریق پر چلایا جائے۔ اب ان کی جماعت کے خلاف انتہائی سخت کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا مودودی حکومتِ الٰہیہ کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے جماعتِ اسلامی کی تاسیس کی ہے، جس کے پیروؤں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ گزشتہ ماہ مولانا کراچی تشریف لائے تھے اس کے بعد کراچی میں ان کی جماعت کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور حکومت پر نکتہ چینیاں عام ہو گئی ہیں۔ اس جماعت کی طرف سے کچھ پوسٹر بھی چسپاں کیے گئے جن میں مجلس دستور ساز سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مملکت کے لیے اسلامی آئین وضع کرے۔"

گویا آسمانِ حکومت پر مخالفت کے طوفان جمع ہونے شروع ہو گئے۔

باب ۲۰

طوفان کے آثار

جھوٹے بہتان

۱۸ مئی ۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے سیّد صاحب کا ایک مباحثہ نشر ہوا۔ جس میں ایک وجیہہ الدین صاحب نے ریڈیو کے نمائندے کی حیثیت سے سوالات کیے اور سیّد مودودی صاحب نے ان کے جوابات دیئے۔ یہ مباحثہ "کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے" کے نام سے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ سوالات بڑے مؤدب اور مناسب الفاظ میں کیے گئے۔ اگرچہ یہ اس وقت کی لیگی حکومت کے طرزِ فکر کی غمازی کر رہے تھے، جس کے رہنماؤں کے ذہن میں یہ بات کلبلا رہی تھی کہ اگر پاکستان میں واقعی اسلامی حکومت قائم کی جائے تو وہ ملاؤں کی حکومت ہوگی، جنہیں دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں ہوگا۔ پھر یہاں کس فرقے کی فقہ کو ملک کا قانون بنایا جائے؟ کیا یہاں کی اقلیتیں مذہبی ریاست کے قیام کو گوارا کر لیں گی؟ وجیہہ الدین صاحب نے کہا کہ کیوں نہ ہم پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں۔ جب یہ کام ہو جائے گا تو ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔

سید مودودی صاحب نے تمام اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ لیگی حکومت عقلی میدان میں شکست کھا گئی۔ ادھر عوام میں مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم عروج پہ پہنچ گئی۔ حکومتِ وقت کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ مطالبے کو ماننے کے لیے ان کا دل تیار نہیں تھا اور انکار کرتے ہیں تو عوام میں رسوائی ہوتی ہے۔ اس لیے جماعتِ اسلامی کے خلاف محاذ کھولنے کا پروگرام بنا۔ پورا پریس حکومت کے قبضہ میں تھا، حزبِ اختلاف کا تصوّر تک نہیں تھا۔ اس لیے حکومت کے محکمہ تعلقاتِ عامہ اور پورے پریس کے ذریعے جماعتِ اسلامی کی تخفیف شروع کر دی کہ یہ ایک دینی جماعت ہے۔ اسے سیاست سے سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ لوگ پاکستان کے مخالف تھے اور اب انتشار پھیلا رہے ہیں۔ اس کے بعد حکومت نے جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لیے خود شوشے چھوڑے۔ اسے پریس، ریڈیو اور محراب و منبر سے خوب اُچھالا۔ کہا کہ جماعت اسلامی لوگوں کو روک رہی ہے کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھائیں، فوج میں بھرتی ہونے سے روک رہی ہے اور جہادِ کشمیر کو حرام کہتی ہے۔ یہ بہتان اس لیے اُچھالے کہ جب رائے عامہ پوری طرح سیّد صاحب کے خلاف ہو جائے تو ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔

حلفِ وفاداری والی بات یہ ہوئی کہ اِدھر جماعت نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم شروع کی ادھر حکومتِ پاکستان نے اپنے ملازموں سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی غیر مشروط وفاداری کا حلف لینا شروع کیا۔ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی بات حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطبۂ خلافت میں کہی کہ تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک مَیں تمہیں معروف (نیکی) کا حکم دوں۔ اس لیے مسلمان خدا کے علاوہ اور کسی کی غیر مشروط وفاداری کا حلف نہیں اٹھا سکتا۔ جب حکومتِ پاکستان نے عہدِ انگریزی کے دستور کی غیر مشروط وفاداری کا حکم دیا تو جو لوگ سیّد مودودی صاحب کے افکار سے متاثر تھے اور جن کے ضمیر اور ایمان اس حکم پہ ٹھٹکے، ان میں سے بعض نے اس بارے میں شرعی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے امیرِ جماعتِ اسلامی کی طرف رجوع کیا۔

سیّد صاحب نے اس خط کا جواب وہی دیا جو شرعاً انہیں دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے کسی لاگ لپیٹ، ہیر پھیر اور ڈپلومیسی کے بغیر جواب دیا کہ ایک مسلمان خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی کی غیر مشروط وفاداری کا حلف نہیں اُٹھا سکتا۔ سیّد صاحب کا جواب ایک ذاتی خط تھا لیکن جونہی لیگی حکومت کو اس بارے میں علم ہوا اسے گویا گوہرِ مطلوب مل گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس سے اس کے اپنے مؤقف کو نقصان پہنچے گا، بھارت کے ریڈیو کو پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملے گا۔ حکومت نے "بُغضِ معاویہ" کے جوش میں پورے زور شور سے یہ بات پھیلادی کہ سیّد مودودی اور جماعتِ اسلامی نے فتویٰ دیا ہے کہ حکومت کی وفاداری کا حلف اٹھانا حرام ہے۔ وہ حکومت کے ملازمین کو پاکستان کی وفاداری کا حلف اُٹھانے سے روکتے اور اسے ناجائز کہتے ہیں۔

لیگی حکومت نے نہ صرف اس ذاتی خط کو اس انداز میں اُچھال کر رائے عامہ کو سیّد صاحب کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی بلکہ متاثرین جماعتِ اسلامی پہ حکومت اور ملازمتوں کے دروازے بھی بند کرنے شروع کر دیئے۔ ان دنوں کم از کم پچیس لوگ ایسے تھے جنہیں حکومت نے جماعتِ اسلامی سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا۔ یا علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ ان میں کراچی کے محمود اعظم فاروقی صاحب بھی تھے جو بعد ازیں جماعت کی طرف سے منتخب ہو کر صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے اور صوبہ سرحد کے معروف عالم دین مولانا شمس الرحمان بھی تھے۔ چنانچہ یہ خبر شائع بھی ہوئی "سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ مَیں اس صورت میں حلف اُٹھانے کے لیے تیار ہوں کہ اس کا نظام حکومت شرعی ہو۔"[1]

اکبر الہ آبادی مرحوم نے سچ کہا تھا کہ:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

۱۹۴۷ء سے پیشتر جماعتِ اسلامی کی پالیسی یہ تھی کہ یہ اپنے دستورِ جماعت کی رُو سے

---

[1] روزنامہ نوائے وقت ۱۲ ستمبر ۴۸ء

ملکی انتخابات، ملازمتوں اور فوج میں حصہ لینے کو حرام سمجھتی تھی کیونکہ انگریزی حکومت طاغوت کی حکومت تھی۔ اگست ۴۸ء میں گویا قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد کسی صاحب نے مرکز جماعت اسلامی سے خط کے ذریعہ دریافت کیا کہ اس میں شک نہیں کہ پاکستان اسی لیے حاصل کیا گیا تھا کہ اسے دارالاسلام بنایا جائے۔ مگر حالت یہ ہے کہ دستورِ مملکت، نظام اجتماعی، قانونِ ملکی، حکومت کی پالیسی اور اس کے سارے طور طریقے اور عزائم بدستور وہی ہیں جو انگریزی دَور میں انگریزوں کے تھے۔ ان حالات میں فوجی ملازمت کی شرعی حیثیت وہی رہے گی جو انگریزی دَور میں تھی یا بدل جائے گی۔ اس کے جواب میں میاں طفیل محمد صاحب نے لکھا کہ جب تک حکومت اپنے اسلامی ہونے کا اعلان نہ کرے اصلاً اس کا حکم نہیں بدلتا۔ لیکن قومی ہنگامی حالات کی صورت میں دفاعِ ملک کے لیے جو شکل بھی ممکن اور مناسب ہو گی اختیار کی جائے گی کیونکہ اس ملک اور قوم کو ہمیں بہر حال اسلام کے لیے محفوظ کرنا ہے۔

برسرِ اقتدار طبقہ تو اس ٹوہ میں لگا ہوا تھا کہ ذرا کوئی بات ملے اور وہ اس کا بتنگڑ بنائے۔ چنانچہ میاں صاحب کے خط کے باقی مندرجات کو روک کر صرف اتنی عبارت کو خوب اُچھالا کہ جب تک حکومت اپنے اسلامی ہونے کا اعلان نہ کرے اس کا حکم اصلاً نہیں بدلتا۔ پھر خود ہی حکومت نے اس کی تشریح کی کہ موجودہ حکومت اور انگریزوں کی حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ پھر پریس اور پلیٹ فارم سے شہر شہر اور گاؤں گاؤں یہ چرچا کیا کہ جماعت اسلامی مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے سے روکتی اور اسے حرام کہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حلفِ وفاداری اور فوج میں شمولیت کے ان دونوں مسئلوں پر بعض جیّد علماء نے مضبوط دلائل اور اخلاص کے ساتھ سیّد مودودی کی رائے سے اختلاف کیا لیکن ان کے اختلاف اور دیگی حکومت کے اختلاف میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

سیّد مودودی صاحب کا جواب ایک ذاتی نوعیت کا خط تھا، انفرادی جواب تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے بیٹھ کر جماعتِ اسلامی کا فیصلہ نہیں دیا تھا۔ لیکن حکومت جو اس وقت جماعتِ اسلامی کے مطالبۂ نظامِ اسلامی سے پریشان تھی اور اس مطالبے کا توڑ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے جوشِ عناد میں ان دونوں آراء کو پوری محنت اور جانفشانی سے پھیلا

دیا اور صحیح بات یہ ہے کہ حکومت نے سیّد مودودی کے خلاف رائے عامہ کو کافی ہموار کر لیا تھا اور بہت سی مساجد میں مولویوں نے سیّد صاحب کے خلاف تقریریں کیں۔

اس سارے کھڑاگ کے باوجود حکومت نے سیّد مودودی پہ ہاتھ ڈالنے کے لیے جس مسئلے کو ترپ کے پتّے کے طور پر استعمال کیا وہ جہادِ کشمیر کا مسئلہ تھا۔

جہادِ کشمیر کا مسئلہ

سیّد مودودی صاحب راوی ہیں:

"مَیں ۲۹ اگست ۴۷ء کو مشرقی پنجاب سے لاہور پہنچا اور دوسرے ہی دن صبح وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواب افتخار حسین ممدوٹ سے خود مِلا اور مَیں نے ان سے کہا کہ ریڈکلف ایوارڈ ہندوستان کے لیے کشمیر کا راستہ کھول رہا ہے۔ اس معاملہ کی اتنی اہمیت میری نگاہ میں تھی کہ مَیں نے چند گھنٹے بھی ضائع کرنے مناسب نہیں سمجھے۔ رانا اللہ داد خاں صاحب کو بھیج کر خود وقت طے کروایا۔ جب ریڈیو سے ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو مَیں نے اسی وقت اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کشمیر ہاتھ سے گیا۔ چنانچہ میں نے یہاں پہنچتے ہی نواب ممدوٹ صاحب سے کہا کہ گورداسپور اس لیے ہندوستان کو دیا گیا ہے کہ وہ کشمیر پر قابض ہو سکے۔ مَیں نے نواب صاحب سے یہ بھی کہا کہ پنجاب میں لاکھوں سابق ملازمینِ فوج موجود ہیں ان کو منظم کر کے جلدی سے جلدی کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کو اسلحہ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ کچھ نہ کچھ اسلحہ ان کے پاس موجود ہے مہاراجہ کشمیر سے سٹینڈ سٹل معاہدہ نہ کیا جائے۔

اس کے بعد اگلے ہی روز مَیں چوہدری محمد علی صاحب سے مِلا اور یہی بات ان سے بھی کہی۔ مَیں نے ان سے کہا کہ میری یہ بات لیاقت علی خاں صاحب تک پہنچا دیں کہ وہ فی الفور کشمیر کی فکر کریں ——— جب میرے خلاف جہادِ کشمیر کی مخالفت کا پروپیگنڈہ کیا گیا تو عین اس وقت جماعتِ اسلامی کے متعدد آدمی کشمیر کی لڑائی میں شریک تھے۔

مئی ۴۸ء میں جماعتِ اسلامی حلقۂ پشاور کا اجتماع ہو رہا تھا کہ میرے پاس آزاد کشمیر

گورنمنٹ کے پبلسٹی آفیسر نبی بخش نظامی صاحب آئے۔ مجھ سے کہا کہ میں علیحدگی میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تخلیہ میں اُن کو بلا لیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس وقت کشمیر میں جو جہاد ہو رہا ہے آپ اس میں حصّہ کیوں نہیں لیتے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ براہِ کرم مجھے اس سوال سے معاف فرمائیں۔ انہوں نے پھر اصرار کیا۔ میں نے پھر ان سے معذرت چاہی۔ تیسری مرتبہ جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا بھائی میرے دل میں ایک خلش ہے۔ مسلمان کا ضمیر ڈپلومیسی کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہی لفظ ڈپلومیسی میں نے استعمال کیا تھا۔

حکومتِ پاکستان کو چاہیئے کہ وہ کھُلم کھُلا جہاد کا اعلان کرے۔ میں اگلی صفوں میں جانے کو تیار ہوں۔ اس بات کو میں اسلامی اخلاق کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھتا کہ دنیا بھر میں تو یہ اعلان کیا جاتے کہ ہم نہیں لڑ رہے ہیں اور اندر اندر ہم لڑ رہے ہوں۔ اس سے ہمارے اخلاقی وقار کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور عملاً بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہم کشمیر حاصل نہیں کر سکتے۔

نبی بخش نظامی نے کہا کہ آپ اپنی اس رائے کا اظہار و اعلان کیوں نہیں کرتے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کو بالکل نامناسب سمجھتا ہوں کہ جو خلش میں اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں، اس کا اظہار کر کے دوسرے لوگ جو کوشش کر رہے ہیں اس کو کوئی نقصان پہنچاؤں۔ اس نے کہا کہ کیا میں آپ کی اس رائے کا اظہار و اعلان کر دوں۔ میں نے کہا کہ اگر یہ کام کرنا ہوتا تو میں خود کرتا آپ کو کیسے اس کی اجازت دے سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ آپ آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پبلسٹی آفیسر ہیں۔ میرے نام سے آپ اس طرح کا اعلان کر کے مجھے بدنام تو کر سکتے ہیں مگر اس گورنمنٹ کے کاز کو نقصان پہنچائیں گے جس کے آپ پبلسٹی آفیسر ہیں۔

یہ بات کر کے وہ میرے پاس سے تشریف لے گئے۔ دوسرے روز میں نے اخبارات میں یہ اطلاع پڑھی کہ مودودی نے جہادِ کشمیر کو حرام قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جو لوگ وہاں مر رہے ہیں وہ حرام موت مر رہے ہیں۔ پشاور سے واپسی کے بعد میں نے اس چیز کی تردید کی جتنی کوشش کی، اس کو نیل کر دیا گیا۔ اخبار تسنیم کے ذریعے سے تردید کرنے کی کوشش کی تو تسنیم کو بند کر دیا گیا۔ پھر جب آل انڈیا ریڈیو نے اس بات کو اُچھالنا شروع کیا تو میں نے ریڈیو پاکستان کو لکھ کر بھیجا کہ میں خود آ کر ریڈیو سے اس چیز کی تردید کرنا چاہتا ہوں تاکہ کشمیر میں

لڑنے والی فوجوں کی ہمّت پست نہ ہونے پائے۔ لیکن مجھے یہ موقع دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ دراصل اس وقت میں اسلامی دستور کے لیے جو جدوجہد کر رہا تھا وہ اس وقت کے حکمرانوں کو اتنی ناگوار تھی کہ انہوں نے کشمیر کے کاز کو نقصان پہنچانا پسند کیا۔ اس طرح مجھے گرفتار کرنے کے لیے ماحول پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں[1]،،

سیّد صاحب نے ایک دفعہ ایک تمثیل سے بتایا کہ میں کشمیر کے جہاد کا ایک سیدھا اور اسلامی طریقہ بتلا رہا تھا۔ حکومت نے اپنے خاص مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اس کا کچھ سے کچھ مطلب نکالا ــــــ "اس معاملے کا پس منظر سمجھنے کے لیے ایک مثال دیتا ہوں۔ کسی گاؤں میں دلدل میں ایک بھینس پھنس گئی۔ لوگ اسے نکال رہے تھے۔ ایک شخص نے نکالنے کا طریقہ بتلایا۔ اس پر ان لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ شخص نہیں چاہتا ہے کہ یہ بھینس نکلے۔ دوسرے نے کہا یہ کہتا ہے کہ اگر اس طریقے سے نکلے جیسے ہم نکال رہے ہیں تو اس کا دودھ پینا حرام ہوگا۔ تیسرے نے کہا یہ کہتا ہے کہ جو اس کا دودھ پیئے گا وہ حرام پیئے گا۔ چوتھے نے کہا کہ یہ شخص کہتا ہے جو اس کا دودھ پیئے گا جہنّم میں جائے گا۔ یہی مثال میری ہے۔"

لیکن جو مقتدر حضرات پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانا چاہتے تھے اور سیّد مودودی، ان کے ساتھ جماعت اسلامی اور ان کے پیچھے پاکستان کے کروڑوں عوام سے چار نکاتی مطالبے کو سن سن کر پریشان ہو چکے تھے۔ وہ تو سیّد مودودی کی کوئی بات ڈھونڈ رہے تھے جس کا وہ بتنگڑ بنا سکتے۔ یہ بات سیّد مودودی کی کشمیر کو حاصل کرنے کے بارے میں ان کی رائے تھی۔ ان کی بلا سے اس رائے کی اشاعت سے مجاہدین کے حوصلے پست ہوں یا مقبوضہ کشمیر کا ریڈیو اس رائے کو فتوے کی حیثیت سے اچھالے یا تحریکِ آزادئ کشمیر کو نقصان پہنچے۔ ان کا مقصد تو پورا ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ پاکستان کے کروڑوں باشندوں کو جماعت اسلامی نے اس بات پہ خبردار کیا ہے کہ دیکھنا کہیں ہمارے اربابِ اقتدار

---

[1] روداد اجتماع ۶۳ء۔

اسلام کے لیے قوم کی قربانیوں کو فراموش کر کے یہاں لادینی نظام قائم نہ کر دیں اور چونکہ جماعت اسلامی کی قوت کو مہمیز دکھانے والا دماغ سید مودودی کا ہے۔ اس لیے اس شخص کو بہر صورت عمل کی دنیا سے دور ہٹا دو۔ ان لوگوں کے لیے آزادیٔ کشمیر سے زیادہ اہم مسئلہ گرفتاریٔ مودودی تھا۔ گرفتار کرنے کے لیے یہ سب سے اچھا بہانہ ہے کہ مودودی جہادِ کشمیر کو حرام کہتا ہے۔

طوفان کے آثار

چنانچہ حکومتِ وقت نے خود اور اس کے زیرِ اثر سارے اخبارات نے جہادِ کشمیر کے بارے میں شہ سرخیوں کے ساتھ سید مودودی صاحب کو بدنام کرنا شروع کیا۔ اس پر اداریئے اور کالم اور پمفلٹ لکھے اور لکھوائے۔ پھر ریڈیو پاکستان بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔ کچھ مولویوں نے جنہیں جماعتِ اسلامی کے خلاف کچھ کہنے کو نہیں ملتا تھا، اپنے آقایانِ ولی نعمت سے بڑھ کر وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس موقعے پر دل کی بھڑاس خوب نکالی اور کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جماعتِ اسلامی کو ہندوستان سے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے کے منی آرڈر آتے ہیں (منی آرڈر اور وہ بھی ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے کے، حالانکہ منی آرڈر ایک ہزار روپوں سے زیادہ کا ہو ہی نہیں سکتا اور غیر ملکوں سے منی آرڈر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) جماعتِ اسلامی نے اس پورے شاخسانے کی تفصیل "مودودی کی گرفتاری کیوں؟" کے نام سے شائع کی اور اکثر لوگوں کے شکوک و شبہات دور ہو گئے اور کئی مخالفین حقیقتِ حال پا کر جماعتِ اسلامی کی صفوں میں آشامل ہوئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ۴۸ء میں اس پروپیگنڈے سے سید صاحب اور جماعتِ اسلامی دونوں کو بدنام کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی اور فضا بہت مسموم ہو گئی۔

اس مسموم فضا کے زہر کو دور کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی کے پاس بس ایک سہ روزہ اخبار "کوثر" تھا۔ یہ بھلا پورے پریس کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ آخر ۱۰ اگست ۴۸ء کو ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے ہزار مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود روزنامہ "تسنیم" جاری کیا اور اس کے

ذریعے فضا کو صاف کرنا شروع کیا۔ یہ بات لیگی حکومت کو کیسے پسند آسکتی تھی جس نے مسئلۂ کشمیر کی قیمت پر سیّد مودودی کے خلاف بڑی مشکل سے یہ فضا ہموار کی تھی۔ چنانچہ تسنیم کے صرف چودہ پرچے شائع ہوئے تھے کہ لیگی حکومت نے آزادیٔ صحافت کی کمال سرپرستی کرتے ہوئے کوثر اور تسنیم دونوں کو پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت ۲۳ اگست ۴۸ء کو چھ چھ ماہ کے لیے بند کر دیا اور اس کے بعد ۱۰ اکتوبر ۴۸ء کو جہانِ نو کراچی کو بھی بند کر دیا۔

نعیم صدیقی صاحب لکھتے ہیں "جن دنوں کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف جہادِ اکبر لڑا جا رہا تھا۔ لاہور کے ایک روزنامے نے (جسے جماعتِ اسلامی سے خدا واسطے کا بَیر رہا ہے) ایک زہریلا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا ملا کر فتویٰ دے دیا کہ یہ لوگ غدّار ہیں۔ میں تسنیم کے ادارے میں شریک تھا۔ مولانا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ لکھنا چاہیے۔ مولانا مودودی مزاحاً کہنے لگے۔ تردید کیوں، صاف صاف کہیئے کہ ہم اقراری مجرم ہیں۔ بس اتنے فقرے نے مجھے اور دوسرے شرکائے مجلس کو متاعِ عزم و ہمت سے مالا مال کر دیا اور اس وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا 'ہم لوگ اقراری مجرم ہیں'۔ اگلی صبح تک نظم مکمل ہو گئی۔ پھر یہ ہنگامہ اور بڑھا اور جوابی کارروائی کرنے کے لیے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی[1]"

حکومت، سیّد مودودی اور ان کے رفقاء پر ہاتھ ڈالنے کا تہیہ کر چکی تھی، لیکن شاید وہ عوامی ردِّ عمل کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ جماعتِ اسلامی کے عام ارکان کو گرفتار کرنے پر کوئی ہلچل نہیں ہوتی ہے تو وہ جماعتِ اسلامی کے لیڈروں پر ہاتھ ڈالے۔ چنانچہ اس "نیک کام" کا آغاز صوبہ سرحد سے ہوا۔ نوشہرہ میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ وسط اگست ۴۸ء تک فضل معبود صاحب اور مولانا معین الدین صاحب کو بھی گرفتار کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی یہ سلسلہ دراز ہوگا۔ اس لیے سیّد مودودی صاحب نے آنے والے دورِ ابتلا کے لیے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا، ان کے دلوں کو گرمایا اور ہدایات

---

[1] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف ص ۹۷۔

دیتے ہوئے لکھا:

"آخر کار جس چیز کا مدت سے انتظار تھا وہ پیش آگئی۔ صوبہ سرحد سے اطلاع ملی ہے کہ نوشہرہ سے جماعت اسلامی کے کارکنوں کی گرفتاری کا آغاز ہو گیا ہے اور بظاہر یہ سلسلہ آگے چلتا نظر آتا ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز خلافِ توقع نہیں ہے۔ جس وقت ہم نے ۱۹۴۱ء میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تھا اس وقت ہمیں پورا اندازہ تھا کہ ہم کیا کام کرنے چلے ہیں اور اس کا خیر مقدم دنیا میں ہمیشہ سے کس طرح ہوتا آیا ہے۔ اس لیے ہم پہلے ہی اس راستہ کی آزمائشوں کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

دوسرا مرحلہ شروع ہے جس میں اس (جماعتِ اسلامی) کو جبر و زور سے مٹانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس میں ہم کو صبر و ثبات اور تحمل و استقلال اور اپنے اصولوں کے سچے عشق کا ثبوت دینا ہے۔ اگر ہم اس مرحلہ سے بھی بخیریت گزر گئے تو انشاء اللہ پھر کوئی طاقت ہمیں اپنے مقصد کو پہنچنے سے نہ روک سکے گی۔ میں جماعت کے کارکنوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس مرحلہ میں حسبِ ذیل امور پر سختی سے عمل کریں:

۱۔ گرفتاری سے بچنے کی ہرگز کوشش نہ کریں، نہ رہا ہونے کے لیے ضمانت دیں، نہ کوئی جرمانہ ادا کریں اور نہ کسی ظلم و ستم یا بے عزتی سے خوف زدہ ہو کر کمزوری دکھائیں۔

۲۔ اگر کسی پر مقدمہ چلایا جائے تو وکیل نہ کریں، بلکہ خود اپنی مدافعت کریں۔

۳۔ گرفتاری کے بعد جماعت کے کسی فرد کو حکومت سے کسی رعایت کا مطالبہ نہ کرنا چاہیئے۔ کسی زیادتی پر احتجاج نہ کرنا چاہیئے اور کسی رعایت کے نہ ملنے پر شکوہ نہ کرنا چاہیئے۔ وہ پورے صبر و سکون کے ساتھ ہر زیادتی کو برداشت کرے اور ہر شکایت کو صرف خدا کے سامنے پیش کرے۔

۴۔ پولیس افسر تحقیر آمیز سلوک کریں، گالیاں دیں، یا قانون سے باہر جا کر ستانے کی کوشش کریں، تو ان کے خلاف دل میں غصہ نہ لائیں، اور ان کے لیے وہی دعا مانگیں جو ایسے حالات میں نبی کریمؐ نے مانگی تھی کہ خدایا میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں بے جانے بوجھے کر رہے ہیں۔

۵۔ جماعت کے کسی فرد کی خواہ وہ امیرِ جماعت ہی کیوں نہ ہو، گرفتاری پر جماعت کے ارکان اور اس کے ہمدردوں کو نہ تو مشتعل ہو کر کسی قسم کے مظاہرے کرنے چاہئیں، اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے نصب العین کی جدّوجہد میں سست پڑنا چاہیئے، ہر شخص کی گرفتاری کو اس طرح نظرانداز کیجئے کہ جیسے کچھ واقعہ ہوا ہی نہیں اور اپنے کام کو یہ سمجھ کر پہلے سے زیادہ تیز کر دیجئے اور یہ محسوس کیجئے کہ گرفتار ہونے والے کے کام کی ذمہ داری بھی آپ پر ہی آ پڑی ہے۔

۶۔ جو لوگ باہر رہیں انہیں گرفتار ہونے والوں کے اہل وعیال کی خبرگیری اور ان کے کاروبار کی دیکھ بھال بالکل اسی طرح کرنی چاہیئے جس طرح کوئی شخص چاہتا ہو کہ اس کے گرفتار ہونے کے بعد اس کے دوسرے رفقا اس کے لیے کریں۔

۷۔ گرفتار ہونے والوں کو جیل میں وہی فریضہ ادا کرنا چاہیئے جو حضرت یوسفؑ نے انجام دیا تھا۔ ہمارے لیے ہر جگہ کام کی جگہ ہے۔ جہاں انسان پایا جاتا ہے وہیں ہمارے لیے کام کا میدان موجود ہے۔"

ہدایات دینے کے بعد سیّد مودودی صاحب نے حکومت کے بہتانوں اور مولویوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے آخر میں لکھا ——— "آپ جھوٹ اور فریب کے ہتھیاروں سے ہمارے خلاف کام نہیں لے سکتے۔ ان تدبیروں کو انشاءاللہ ہم چلنے نہیں دیں گے۔ آپ کے لیے صاف اور سیدھا طریقہ یہ ہے کہ ہم کو اس جرم پر پکڑیں جو آپ کی نگاہ میں ہمارا اصل جرم ہے اور جس کے ہم خود معترف ہیں یعنی نظامِ اسلامی کا مطالبہ۔"

مولانا معین الدین صاحب

ان ہدایات پر کس طرح عمل ہوا اور حکومتِ وقت نے جماعتِ اسلامی کے زعما کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کی ایک روشن مثال کوہاٹ کے مولانا معین الدین صاحب ہیں۔ یہ مردِ کوہستانی جو اپنے حیران کُن حافظہ اور وسیع علم کی بنا پر اپنی ذات میں ایک چھوٹے مودودی ہیں۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد (یوپی) میں درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان

کی آپ بیتی دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس لیے انہی کی زبان سے سُنتے ہیں:

"مولانا مودودی صاحب کا نام مَیں نے سب سے پہلے مُراد آباد میں ترمذی شریف کے استاد مولانا محمد میاں صاحب سے سُنا۔ انہیں سیاست اور سیاسی معاملات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ حدیث پڑھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح بات کو سیاست کی طرف لے جاتے تھے۔ ذہنی طور پر جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ تھے جو ان دنوں کانگرس کی ہمنوا تھی۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں ہی خلافت کو قائم نہ رکھ سکے لیکن پنجاب میں ایک مولوی ابُوالاعلیٰ مودودی ہے جو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ مَیں پھر سے خلافتِ راشدہ کا نظام قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مَیں نے مولانا کا نام سُنا تھا۔ اس سے مَیں نے یہ تاثر لیا کہ یہ آدمی مخلص ضرور ہو گا۔ لیکن بے چارہ زمانے کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ بھلا صحابہ کرام کے زمانہ میں خلافتِ راشدہ قائم نہ رہ سکی تو اب یہ بے چارہ کیا کرے گا۔ لیکن ایسے شخص کے خلوص میں شبہ نہیں۔

۴۴ء کے لگ بھگ ہفت روزہ کوثر میں ایک اشتہار شائع ہوتا تھا کہ مولانا مودُودی کی انقلاب انگیز کتابیں پڑھیئے اور نیچے ان کی کتابوں کی فہرست دی ہوئی تھی۔ مَیں سوچتا تھا کہ بھلا ایک ایسے مولوی کی کتابیں کیا انقلاب انگیز ہو سکتی ہیں جو بے چارہ زمانے ہی سے ناواقف ہے، جو ایسی ناممکن بات کا دعوٰے کرتا ہے کہ وہ اس زمانے میں خلافتِ راشدہ کا نظام برپا کر دے گا۔ انہی دنوں مجھے مولانا مودودی کا ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا جس میں انہوں نے دستوری اور قانونی مسائل پہ اظہارِ رائے کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص نہ صرف زمانے سے واقف ہے بلکہ یہ تو بہت زیادہ عِلم رکھتا ہے۔ پھر مجھے مودودی صاحب کی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصّہ دوم مِل گئی۔ جب مَیں نے اسے شروع کیا تو مَیں تو اس کے مضامین میں کھو گیا۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا گویا صدیوں کے پیاسے کو سمندر کا کنارہ مِل گیا تھا۔ مولانا کی ایک ایک بات دل میں اُترتی جاتی تھی۔ دِل نے بے اختیار کہا:

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

میرا یہ حال تھا کہ میرے طالب علموں نے کہا کہ کھانا کھا لیجئے! مَیں نے کہا اب مجھے کچھ نہ کہو! انہوں نے کہا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے! مَیں نے کہا ہونے دو اور میں کتاب میں مستغرق تھا۔ مجھے شروع سے ہی فلسفہ وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ امام غزالی وغیرہ کے رُتبے کے مصنفوں کو پڑھا کرتا تھا اور دقیق اور گہرے مطالعے کا ذوق تھا۔ لیکن مولانا کی باتیں تو گویا دل میں ترازو ہو کر رہ گئیں۔ ان کے مضامین کا تحقیقی مواد، طرز استدلال کی دل نشینی، اندازِ بیان کی سادگی و پرکاری اور معلومات کا سمندر مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ مَیں نے کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھا تو یوں محسوس ہوا جیسے مَیں زندگی کا سب سے خوشگوار تجربہ کر کے واپس اس دنیا میں لوٹا ہوں [۱]"

جب مولانا معین الدین صاحب کو ایک مردِ راہ داں مِل گیا اور انہوں نے سیّد مودودی کا سارا لٹریچر پڑھ لیا تو عمل پہ کمر باندھ لی۔ پاکستان بن گیا تو ان کا جوشِ عمل تحریکِ اسلامی کے پیغام کو دُور دُور تک پھیلا رہا تھا اور جب مطالبۂ نظامِ اسلامی کا وقت آیا تو انہوں نے کس خندہ پیشانی سے دُشنام و سلاسل کو خوش آمدید کہا اس کا حال انہی سے سُنتے ہیں۔

"ضلع کوہاٹ کے گاؤں گاؤں میں تقریریں کرتے ہوئے مَیں ٹل کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ۹ راگست ۱۹۴۸ء کو مَیں نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کی وضاحت کی کہ پاکستان کی بادشاہی اور حاکمیت اللہ کے لیے ہے۔ اس ملک میں حکومت کی اس کے سوا کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی پُوری کرے۔ میری تقریر ختم ہو گئی تو بس اڈے پہ میرے پاس ایک تھانیدار صاحب آئے اور انہوں نے کہا آئیے آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ ان کے ساتھ چلتے ہوئے تھانے پہنچ گئے۔ انہوں نے دفعہ ۱۰۹ کے تحت ہمارا چالان کاٹا۔ گویا حکومت کی نظروں میں ہم آوارہ گرد تھے۔ وہ رات حوالات میں گزاری۔ یہ ایک چھوٹی سی

---

[۱] ہفت روزہ آئین ۱۴ر ستمبر ۶۹ء۔

کوٹھڑی تھی جس کے ایک کونے میں گندگی پڑی ہوئی تھی۔ موسم گرما کی رات تھی، بدبُو اور تعفن سے طبیعت متلا رہی تھی، اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی جگہ تھی، جو بیٹھنے کے لیے بھی تھی اور سونے کے لیے بھی اور نماز پڑھنے کے لیے بھی یہی جگہ تھی۔ دعوتِ اسلامی کی رہ میں یہ پہلی آزمائش تھی۔

دوسرے روز ہمیں ہنگو لے جایا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی بغیر کسی بات، تمہید یا اشتعال کے غلیظ، ننگی اور ناقابلِ ذکر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حوصلہ دیا اور مَیں صبر و تحمل سے سب کچھ سُنتا رہا اور وہ ہمارے اور جماعتِ اسلامی کے خلاف بولتا رہا۔ میری جیب میں جماعتِ اسلامی ضلع کوہاٹ کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ تھی۔ اے سی صاحب نے اس رپورٹ کی بنا پر مجھے پشاور بھجوا دیا کہ اس شخص کی جامہ تلاشی سے کچھ کاغذات برآمد ہوتے ہیں۔ یہ شخص بھارت کا جاسوس معلوم ہوتا ہے اور اس کے پاس بڑی معلومات ہیں۔ صوبہ سرحد کی سی آئی ڈی کے انسپکٹر نے تحقیقات کی اور لکھا کہ یہ شخص تو فلاں مقام سے تعلق رکھتا ہے اور اسی ضلع کوہاٹ کا باشندہ ہے یہ تو آوارہ گرد نہیں ہے۔

لیکن حکومتِ سرحد اس رپورٹ سے مطمئن نہیں تھی۔ انہوں نے اب دفعہ ۱۱۰ کے تحت چالان بنا دیا گویا مَیں حوالات میں رہتے رہتے آوارہ گرد سے بدمعاش ہو گیا تھا۔ تھانیدار نے مجھے بہت کہا کہ اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے اگر آپ وکیل کر لیں تو مقدمہ بڑی آسانی سے خارج ہو جائے گا۔ مَیں نے اسے بتایا کہ معاملہ اصول کا ہے، ہمارے ملک پہ ابھی تک انگریزوں کا بنایا ہوا ۱۸۶۱ء والا ایکٹ مسلط ہے، ہم اسے طاغوت کا دستور سمجھتے ہیں، اس لیے ہم ان عدالتوں میں کبھی مدعی کی حیثیت سے نہیں جائیں گے، نہ ہم وکیل کریں گے اور نہ کوئی رعایت مانگیں گے۔

عدالت نے کہا دو سال کے لیے نیک چلنی کی بیس ہزار روپے کی ضمانت دیدو تو رہا کر دیتا ہوں۔ ضمانت دینے کا مطلب تو گویا یہ تھا کہ مَیں جماعتِ اسلامی کی دعوت سے دستبردار ہو جاؤں۔ لہٰذا مَیں نے کہا کہ آپ تو بیس ہزار روپے کی ضمانت کہتے ہیں۔ مَیں ایک آنے کی بھی ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں۔ عدالت نے مجھے ایک سال قید بامشقت کی سزا

سُنائی۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور دونوں پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اسی حالت میں مجھے کوہاٹ سٹیشن لے چلے تو پاؤں کی بیڑیوں سے میرے پاؤں زخمی ہو گئے۔ سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے اِن میں سے خون رِسنا شروع ہو گیا۔ اسی حالت میں مجھے سنٹرل جیل ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچا دیا گیا۔ میرے زخم ایک ماہ تک مندمل نہ ہو سکے اور مَیں اٹھارہ روز تک ہسپتال میں رہا اور اشاروں سے نماز پڑھتا رہا۔

اسی جیل میں کافی تعداد میں سُرخ پوش قیدی بھی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی وجہ سے ہڑتال کر دی اور سب قیدیوں سے کہا وہ بھی ان کے ساتھ ہڑتال میں شریک ہوں کہ جب تک جیل کے حکام ان کے راشن میں ان چیزوں کا بندوبست نہیں کرتے وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ مجھے بھی ہڑتال میں شریک ہونے کے لیے کہا مَیں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مَیں آپ کو مظلوم سمجھتا ہوں اور آپ کا مطالبہ بھی جائز ہے۔ لیکن ہمارا یہ اصول ہے کہ ہم اربابِ اقتدار سے نہ تو کوئی رعایت مانگیں گے، نہ کوئی درخواست کریں گے اور نہ کسی سہولت کے طلبگار ہوں گے[1]۔"

گویا علامہ اقبال کے الفاظ میں

ع اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دَوراں کا ہے جس کی زباں پہ گِلہ

---

[1] ہفت روزہ آئین ۲۴ ستمبر ۶۹ء۔

باب ۲۱

سنٹرل جیل ملتان

قائدِ اعظم کی رحلت

نوشہرہ اور کوہاٹ وغیرہ میں جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں کی گرفتاریاں وسط اگست ۱۹۴۸ء میں عمل میں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم کو مزید تیز کر دیا گیا اور یہ پروپیگنڈہ صرف حلفِ وفاداری، فوج میں ملازمت اور جہادِ کشمیر کے تین معاملات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ یہاں تک خرافات تھوپی گئیں کہ سیّد مودودی اور جماعتِ اسلامی والے ہندوستان کے ایجنٹ اور ان کے تنخواہ یافتہ ہیں۔ اخبارات نے انہیں غدّار لکھا اور کہا کہ یہ پاکستان کے مخالف تھے۔ محراب و منبر ہر جمعہ کے خطبہ میں جماعتِ اسلامی اور سیّد مودودی پر برستے کہ یہ اپنے آپ کو جماعتِ اسلامی کہتے ہیں اور دوسروں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ یہ تقریریں اتنی جوشیلی اور گرما گرم ہوتیں کہ ان کا صاف مطلب یہ تھا کہ عوام سیّد مودودی کو قتل کر دیں۔ غرض یہ کہ حکومت نے سیّد صاحب پر ہاتھ ڈالنے کے لیے زمین اچھی طرح ہموار کر لی تھی۔ حکومت شاید وسط ستمبر میں سیّد صاحب کو گرفتار کر لیتی لیکن ۱۱ ستمبر

کو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رحلت اور ۱۲ ستمبر کو سقوطِ حیدر آباد دکن کے ایسے اہم واقعات ہوتے کہ حکومت نے اپنے فیصلے کو کچھ دیر مؤخر کر لیا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ کوئی پاکستانی نہیں بھول سکتا۔

اس روز دو بجے دوپہر کوئٹہ سے گورنر جنرل پاکستان کا خصوصی طیارہ اڑا جس میں دس کروڑ پاکستانیوں کے عظیم لیڈر قائدِ اعظم محمد علی جناح موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے کوئٹہ سے آگے ایک صحت افزا مقام زیارت میں صاحبِ فراش تھے۔ نوزائیدہ مملکت کے لیے بہت زیادہ اور لگاتار محنت سے ان کے پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے تھے اور ان کی صحت ڈاکٹروں کی انتہائی کوششوں کے باوجود بہت ہی کمزور ہو چکی تھی، حتیٰ کہ ان کا وزن ایک من سے بھی کم رہ گیا تھا۔ طیارہ کوئٹہ کی خشک پہاڑیوں پر سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا کہ محترمہ مس فاطمہ جناح نے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو طیارے کے دوسرے کیبن سے بلوایا جو قائدِ اعظم کے آخری دنوں میں ان کے معالج تھے۔ طیارے کی اتنی بلندی کی وجہ سے نرس کو چکر آ رہے تھے اور فاطمہ جناح صاحبہ اپنے قابلِ قدر بھائی کو آکسیجن دے دے کر تھک گئی تھیں، اب کرنل الٰہی بخش نے محبت اور مستعدی سے قائدِ اعظم کو آکسیجن دینا شروع کی لیکن انہیں معلوم تھا کہ ان کے مریض اور محبوب قائدِ اعظم کے یہ آخری لمحات ہیں۔

طیارہ کراچی میں ماڑی پور کے ہوائی اڈے پہ شام کے سوا چار بجے اُترا تو قائدِ اعظم کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولنس کار میں پہنچایا گیا۔ چار میل چلے ہوں گے کہ ایمبولنس خراب ہو گئی اور دو گھنٹے تک متبادل انتظام نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ خدانخواستہ قائدِ اعظم نے سڑک کے کنارے جان دے دی تو یہ کتنا زبردست سانحہ ہو گا۔ چھ بجے سبھی گورنر جنرل ہاؤس پہنچے۔ ڈاکٹر نے قائدِ اعظم کو تسلی دینے کی کوشش کی تو انہوں نے نحیف آواز میں اپنے آخری الفاظ کہے "نہیں۔ میں نہیں بچوں گا" اس سے آدھ گھنٹے بعد رات کے دس بج کر بیس منٹ پر مرحوم و مغفور نے ہچکی لی اور پوری قوم کو سوگوار چھوڑ کر پروردگارِ حقیقی سے جا ملے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن[1]

---

[1] کرنل الٰہی بخش: قائدِ اعظم کے آخری ایام۔

سیّد مودودی صاحب نے قوم کے عظیم قائد کو جس کے سر پر قدرت نے مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے قیام کی کامیابی کا تاج ہمیشہ کے لیے رکھ دیا ہے، بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ ترجمان القرآن کے اشارات میں آپ نے قائداعظم مرحوم و مغفور کے بارے میں لکھا:

"ان کی شخصیت پچھلے دس بارہ سالوں سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور بنی ہوئی تھی۔ ساری قوم ان پر مجتمع تھی، ان کی رہنمائی پر سب کو بھروسہ تھا، ان ہی کے ذاتی اثر و رسوخ نے تمام مختلف عناصر کو جوڑ کر مسلمانوں کو ایک متحدہ قوم بنایا تھا، ان ہی کے اعتماد پر قوم نے اپنی پوری طاقت اس جدّوجہد میں لگا دی تھی، جس کے نتیجے میں آخر کار پاکستان قائم ہوا اور قیامِ پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کی عمارت جس مضبوط ستون کے سہارے پر تعمیر ہو رہی تھی وہ بھی ان ہی کی جامع اور معتمد علیہ شخصیت تھی۔ صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کی جو ساکھ اور دھاک تھی وہ زیادہ تر اسی آزمودہ کار قائد کی بدولت تھی۔ کوئی دوسری شخصیت ہمارے ہاں ایسی نہیں کہ اس کے وقار اور تدبر کو بین الاقوامی برادری میں اس درجہ بھروسہ اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ دنیا کے لیے تو مرحوم کی وفات محض ایک بڑے اور مشہور رہنما کی رحلت ہے، مگر ہمارے لیے یہ ایک بہت بڑی قومی مصیبت ہے۔ کیونکہ اس سے ہماری نوخیز مملکت کی طاقت اور ہماری قومی زندگی کو ایسا صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے اور ہماری مدد کرے[1]۔"

ادھر قائداعظم محمد علی جناح نے آنکھیں موندلیں اور مسلمانانِ عالم ان کے غم میں سوگوار تھے، ادھر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا اور بھارت نے حیدر آباد دکن کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا۔

سقوطِ حیدر آباد دکن

۴۶ء میں ہندوستان کے مسلمان جس پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے اس میں پورا بنگال،

---

[1] ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۴۸ء۔

پورا پنجاب اور پورا کشمیر تھا۔ اس کے علاوہ اس میں حیدر آباد دکن کی ریاست بھی شامل تھی۔ لیکن جب پاکستان بنا تو نقشہ مختلف تھا۔ آسام اور بنگال کی تقسیم ہوئی، کلکتہ کا شہر پاکستان کو نہ ملا۔ پنجاب کی نہ صرف تقسیم ہوئی بلکہ فیروز پور، جالندھر، امرتسر اور گورداسپور کی مسلم اکثریت کے اضلاع بھی ہندوستان کو مل گئے۔ گورداسپور کے راستے کشمیر پر بھی بھارت نے قبضہ کر لیا اور اب حیدر آباد دکن کی ریاست کا معاملہ بھی دگرگوں تھا، جہاں عثمانی خاندان نے صدیوں سے اپنی بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ سید مودودی صاحب نے دسمبر ۴۷ء میں حیدر آباد دکن کی مشہور و معروف تنظیم "انجمن اتحاد المسلمین" کے صدر کے نام ایک خط لکھا جو ان کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی پہ دلالت کرتا ہے۔ سید صاحب اس ریاست کے شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ گزارا تھا۔ یہیں سے انہوں نے ترجمان القرآن کے ذریعے اپنے پیغام کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے لکھا:

"میں اس تمام تشویش اور فکر مندی میں بُعدِ مقام کے باوجود حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں، جس میں وہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی وجہ سے اپنے آپ کو مبتلا پا رہے ہیں۔ یہی چیز مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ میں بِلا طلب اپنا مشورہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کروں جو اس وقت مسلمانانِ حیدر آباد کی رہنمائی سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور سرسری طور پر انہیں نظر انداز نہیں کر دیں گے۔ تاہم اگر وہ ایسا کریں تو میں اپنی اخلاقی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاؤں گا اور میرا ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے بھائیوں کا جو حق مجھ پر عاید ہوتا تھا اسے ادا کرنے کی میں نے کوشش کر دی تھی۔"

سید صاحب نے اس خط میں لکھا کہ ہندوستان پہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے غیر مسلم رعایا کو سیاسی اور معاشی طور پر دبائے رکھنے میں اپنی عظمت سمجھی۔ حالانکہ اگر وہ ان کے دل جیتنے کی کوشش کرتے تو اسلام کی کشش سے ہی موجودہ ہندوستان کی چالیس کروڑ آبادی مسلمان ہوتی اور یہاں کی تاریخ قطعی مختلف ہوتی۔ لیکن جب مسلمان اپنا بنیادی فرض بھولے تو اب حال یہ ہے کہ حیدر آباد کی مسلمان حکومت کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد صرف

پندرہ فی صدی ہے ـــــــ "انڈین یونین کی ہندو اکثریت جو سابق انگریزی طاقت کی وارث ہوئی ہے حیدر آباد کے چاروں طرف محیط ہے، حیدر آباد اس کے محاصرہ میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ وہ کسی طرف سے مدد نہیں پا سکتا، ریاست کی ۸۵ فی صدی آبادی غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتی ہے، موجودہ جمہوریت کے دور میں پندرہ فیصدی مسلمانوں کا یہ دعوٰے کہ حکمرانی ان کے ہاتھ رہے یا وہ کم از کم آدھے اقتدار کے شریک ہوں کسی طرح نہیں چل سکتا۔"

سیّد صاحب کی مندرجہ ذیل یہ دو پیشین گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔

"رئیس کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اور اپنے خانوادہ کے مفاد کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو بھی نواب جُوناگڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرلے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے ـــــــ شاید حیدر آباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا، جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ حیدر آباد کے مسلمانوں پر اگر ایک طرف خود گھر کی اکثریت، دوسری طرف گرد و نواح کے علاقوں کے مسلح جتھے اور تیسری طرف انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں اور خود ریاست کے نظم و نسق نے ان کا ساتھ نہ دیا تو ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی ـــــــ یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا کہ آپ انڈین یونین میں حیدر آباد کے داخلے کو اور حیدر آباد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کو روک سکیں گے۔ یہ چیز بہرحال ہو کر رہے گی۔ آپ کے روکے نہ رُک سکے گی اور روکنے کی کوشش کا حاصل اس کے سوائے کچھ نہ ہوگا کہ ریاست اور مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں یا صرف مسلمان تباہ ہوں اور ریاست مسلمانوں کی بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو بچالے۔"

پس چہ باید کرد؟ سیّد مودودی صاحب نے صدر انجمن اتحاد المسلمین کو لکھا کہ اس وقت انڈین یونین ان کی شرائط کو ماننے کے لیے بآسانی تیار ہو جائے گی اور مناسب شرائط یہ ہو سکتی ہیں:

"ریاست کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے کہ ان کے تہذیبی اور مذہبی

معاملات کے لیے ان کا اپنا ایک الگ ادارہ ہو جیسے مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد کرنے، اس کو وصول کرنے اور خرچ کرنے کے لیے اور مذہبی اوقاف کا انتظام کرنے اور ان کی آمدنی کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرنے کے لیے، نیز مسلمانوں کا پرسنل لاء، ان کے معاملات نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ پر جاری کرانے کے لیے، ضروری قانون اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔ دوسرے مسلمان اپنے خرچ پر ایک مذہبی درس گاہ قائم کر سکیں۔ اور اسی طرح سرکاری تعلیم گاہوں میں مسلمان بچوں کے لیے اپنے خرچ پر لازمی مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ تیسرے اسمبلی میں ہر گروہ کو متناسب نمائندگی ضرور ملے اور نظام کے لیے دستوری فرمانروا سے بڑھ کر کسی پوزیشن کا مطالبہ کرنے پر مسلمانوں کو اصرار نہ کرنا چاہیئے۔"

افسوس کہ سید صاحب کا یہ خط، یہ نیک خواہشات اور یہ تجاویز صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

نظام حیدر آباد دکن کا شاید یہ خیال تھا کہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو انگریزی عملداری ختم ہوتے ہی وہ اپنی ریاست میں خود مختار ہو جائے گا۔ لیکن بھارت کے اشتعال انگیز اور جارحانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اور قائداعظم کے اس حقیقت پسندانہ بیان کے پیشِ نظر کہ ہم بھارتی حملے کی صورت میں حیدر آباد کی کوئی مادی مدد نہیں کر سکیں گے، نظام نے ۲۰ نومبر ۴۷ء کو بھارت سے معاہدہ قائمہ کر لیا۔ قاسم رضوی ایک پُرجوش مسلمان اور ولولہ انگیز خطیب تھے، وہ مجلس اتحاد المسلمین کے رُوحِ رواں بن گئے، ان کے پرچم تلے مسلمان رضا کار بھارت سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ جنوری ۴۸ء میں رضا کاروں کی تعداد تیس ہزار تھی، اگلے آٹھ مہینوں میں اگست ۴۸ء تک مردوں، عورتوں اور لڑکوں پہ مشتمل یہ پُرجوش لیکن غیر تربیت یافتہ تعداد ایک لاکھ کو پہنچ گئی۔ بھارت کا وزیر امور ریاست سردار ولبھ بھائی پٹیل اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا اور حیدر آباد دکن کے آخری وزیر اعظم میر لائق علی مصنف "المیہ حیدر آباد" اس کی چالوں کو ناکام بنا رہے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو نظام پہ پوری طرح دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ پوری طرح بھارت سے الحاق کرلے، لیکن میر لائق علی نے شکست خوردہ ذہنیت والے نظام کو آخری دم تک سہارا دیا۔

۱۱ ستمبر ۴۸ء کو قائدِ اعظم خدا کے حضور پہنچے اور ۱۳ ستمبر کی صبح جنرل چوہدری کی قیادت میں بھارتی افواج کے ٹڈی دَل نے پولیس ایکشن کے نام پر حیدرآباد دکن ریاست پہ بغیر کسی اعلان یا انتباہ کے حملہ کر دیا۔ بے در ،ورنگل اور عادل آباد کے ہوائی اڈوں پہ تباہ کن بمباری کی۔ سیّد مودودی صاحب کے مولد اورنگ آباد پہ بھی بمباری کی۔ رضا کاروں نے بے سروسامانی کے باوجود ٹینکوں، توپوں اور ہوائی جہازوں سے لیس بھارتی فوج کا مقابلہ کر کے سرفروشی اور جانفشانی کا باب رقم کیا۔ ریاستی افواج کے سپہ سالار العدروس نے منصوبے کے مطابق مسلم رضاکاروں کو محاذ پہ پہنچنے میں تاخیر کروائی۔ پھر انہیں اسلحہ نہ دیا اور خود نظام کو آکر کہ دیا کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ۱۷ ستمبر کو دل برداشتہ میر لائق علی نے استعفیٰ دے دیا، جسے نظام نے فوراً منظور کر کے ریڈیو پہ عوام کو خطاب کیا ——— "میں باشندگانِ حیدرآباد سے خاص طور پر کہ دینا چاہتا ہوں کہ اب ان کی قسمت ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔"

استعمار پسند پنڈت نہرو نے فتح کے نشے میں بھارتی ریجنٹ منشی کو جس نے سقوطِ حیدرآباد دکن پہ انگریزی میں ایک کتاب "ایک دَور کا خاتمہ" لکھی، تار دیا جس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو حیدرآباد کے مسلمانوں اور عثمانیوں سے ان تمام شکستوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا جو بھارتی راجاؤں کو محمود غزنوی اور اس کے پیروکاروں نے پچھلی آٹھ صدیوں میں دی تھیں۔ تار میں لکھا "حیدرآباد کی فوج باقاعدہ طور پر ہمارے آرمی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈالے گی۔ ہتھیار ڈالنے کی رسم بالکل فوجی انداز کی ہو گی۔"

۱۸ ستمبر ۴۸ء کی سہ پہر بھارتی فوج مسلمانوں کا قتلِ عام کرتی ہوئی، عثمانی دارالسلطنت حیدرآباد میں داخل ہو گئی۔ ریاست کو بزورِ قوت ہندوستان میں شامل کر لیا گیا۔ نظام کی تسکینِ خاطر کے لیے پہلے کچھ عرصہ کے لیے اسے 'راج پرمکھ' بنا دیا، پھر یہ خطاب بھی ختم کر کے اسے عام شہری بنا دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد ریاست کو تین ٹکڑے کر کے آندھرا پردیش، اُترپردیش اور بمبئی میں شامل کر دیا۔ آپ اب ہندوستان کا نقشہ اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو حیدرآباد کی ریاست کا نام و نشان تک نہ ملے گا جو ہندوستان پہ مسلمانوں کی سطوت کی آخری نشانی تھی اور جس نے اسلامی معاشرت کے احیاء اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے قابلِ قدر

کام کیا تھا۔

گرفتاری

اگست ستمبر ۴۸ء کے دورِ ابتلاء کے بارے میں نعیم صدیقی صاحب رقم طراز ہیں:

"اس زمانے میں حکومت کے براہ راست اور بالواسطہ پروپگنڈہ نے نیز بعض اخبارات کے مخالفانہ محاذ اور بعض مولویوں کے فتووں اور خطبوں نے رائے عامہ کی فضا کو اتنا مکدّر کر دیا تھا کہ دماغی سکون کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن مولانا مودودی اس طوفانی ماحول میں جس شان سے عزیمت کی چٹان بنے رہے، اس نے جماعت کے ایک ایک فرد میں سچائی پر قائم رہنے کا مضبوط جذبہ پیدا کر دیا۔ حال یہ تھا کہ مسجد کے منبروں سے مولانا کے قتل کیے جانے کی علانیہ ترغیب دلائی جا رہی تھی اور سڑکوں پر چلتے پھرتے کارکن بسا اوقات یہ اندیشہ محسوس کرتے تھے کہ ہم پر کہیں بھی غنڈوں کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور ایک ایک چیز کی اطلاع لے کر ہم سب بار بار مرکز آتے تھے۔ لیکن مولانا سے بات کرتے ہی ساری تشویش رخصت ہو جاتی اور عزم و ہمت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ مولانا کارکنوں کی گھبراہٹ کا پرتو قبول کرنے کے بجائے ہمیشہ ان پر اپنی عزیمت کا پرتو ڈال دینے میں کامیاب رہے۔ جب کوئی آتا تو وہ دور ہی سے اس کے چہرے سے نفسیاتی مطالعہ کر لیتے اور سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ پوچھتے ——— دکھیے جناب! کیا حالات ہیں، اور آنے والے کی جذباتی کیفیت بات کرنے سے پہلے ہی بدل جاتی۔

مولانا کی تلقین یہ تھی کہ مخالف سے مخالف ماحول کے خطرناک ترین گوشوں میں گھسیے اور پوری ہمت کے ساتھ اپنی صحیح پوزیشن پیش کر دیجیے۔ چنانچہ کارکنوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے حکومت، پریس اور مولویوں کے وسیع مخالفانہ محاذ کے بالکل سامنے آ کر جھوٹ کے غبار سے فضا کو صاف کرنے کی حوصلہ افزا مثالیں قائم کر دیں۔ پھر جب مولانا نے تجویز کیا کہ شہر کے عین طوفانی مرکز میں جلسے کیے جائیں اور عوام کو براہِ راست اپنے مؤقف سے آگاہ کیا جائے۔ تو پہلا آزمائشی موقعہ برکت علی محمڈن ہال کو مقرر کیا گیا جس میں باقر خاں صاحب کو

صدارت کے لیے اور مجھے تقریر کے لیے بھیجا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری میں جب ہم نکلے تو ہر اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ ایک بڑی بازی کھیل جانے کی سپرٹ دلوں میں کام کر رہی تھی۔ مولانا خود اس روز یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا امکان ہے اور ہماری واپسی تک برابر دفتر کے صحن میں موجود رہے اس کے بعد شہر کے تمام حصوں میں پے در پے چھوٹے چھوٹے جلسے کیے جانے لگے۔

اس دوران میں متعدد لوگوں نے مولانا کی گرفتاری کے امکان سے آگاہ کر دیا تھا، دوسری طرف ایک خطرناک ترسازش کی بھی افواہ ملی اور ہم نے چاہا کہ مولانا کسی قدر احتیاط سے کام لیں۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے، مَیں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا اور جب اس کی طرف سے یہ مہلت ختم ہو جانے والی ہو گی تو پھر کوئی احتیاط حفاظت کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مَیں دفتر "کوثر" میں کام کر رہا تھا کہ اچانک اپنے ہی ایک نوجوان آئے اور انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کہا کہ مولانا کی گرفتاری کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ مَیں نے یہ خبر سُن کر کام فوراً بند کر دیا اور معمول کے خلاف قبل از وقت مرکز آ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا، مولانا کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ مَیں نے کسی بچے کے ذریعے کہلوایا کہ بہت ضروری پیغام دینا ہے اور مولانا جس حال میں ہوں مجھے ابھی ملنا ہے۔ اطلاع اندر گئی دروازہ کھُلا اور مولانا کو مَیں نے مطلع کر دیا۔ مولانا کے چہرے پر کوئی معمولی فرق نہیں آیا ——— یہ تھی اس شخص کی عظمت![1]"

آخر ۴ اکتوبر ۴۸ء کو سید مودودی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا!

اس روز نعیم صدیقی صاحب گلے کی شدید خرابی اور ہلکے بخار کی وجہ سے گھر میں تھے کہ نماز مغرب کے وقت انہیں عبدالوحید خاں صاحب کے ایک عزیز نے آ کر اطلاع دی کہ قیم جماعت میاں طفیل محمد صاحب گرفتار ہو چکے ہیں۔ نعیم صاحب فوراً نکلے کہ جا کر مرکز میں

---

[1] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف ص ۱۶۱ تا ۱۶۳

اطلاع دیں پھر کیا ہُوا؟ انہی کی زبانی سُنتے ہیں :

"وہاں پہنچا تو (مولانا مودودی کا درس قرآن) آخری مرحلے پر تھا، وہ ختم ہُوا تو ڈی ایس پی صاحب جو وہاں موجود تھے، انہوں نے مولانا سے علیٰحدگی میں بات کرنے کی خواہش کی اور بات ہو گئی۔ بلکہ فوراً ہی بات کُھل گئی۔ مولانا کھانا کھانے اور تیار ہونے کے لیے اندر چلے گئے، ہم سب لوگوں پر اس بات کا گہرا اثر تھا کہ حکمراں طاقت مسلمانوں اور ان کے ملک کے حقیقی خیر خواہ کے ساتھ بالآخر وہی ظالمانہ سلوک کرنے پر تُل گئی ہے، جس کے نمونوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا کا بستر آ گیا، پھر کچھ وقفے کے بعد مولانا شیروانی پہنے ٹھیک اسی طرح ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے، جیسے وہ کسی سفر پر جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کوئی فرق نہیں تھا۔

اور برآمدے کے کنارے پر کھڑے انہوں نے یہ کہہ کر پان طلب کیا کہ 'ڈبیہ کہاں ہے آخری پان کھا لیا جائے'۔ پوچھا گیا آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے فرمانے لگے 'بس اب طلاق دے رہا ہوں'۔ پان جیسے رفیق کے بارے میں مولانا کا یہ فیصلہ سُن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا 'نہیں! یہ طلاق رجعی ہے مغلّظ نہیں'، اس پر سیّد نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدّت کی قید کے لیے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔[۱]"

میاں طفیل محمد صاحب کو اس سے پیشتر گرفتار کیا جا چکا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو اگلی صبح چار بجے راولپنڈی میں ان کی قیام گاہ سے گرفتار کیا گیا۔ حکومت کا یہ خیال تھا کہ جماعت اسلامی کے ان تین بڑوں کو گرفتار کرنے کے بعد وہ جماعت اسلامی کے کام کو روک دے گی، دستور کو اپنی مرضی سے مرتب کر لے گی اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیکن جلد ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ جماعت اسلامی، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات نہیں ہے۔ ان

---

[۱] نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف۔ ص ۱۶۴-۱۶۵

کے خیالات و افکار بھی ہیں، جنہیں کبھی پابندِ سلاسل نہیں کیا جا سکتا اور جنہیں کوئی طاقت دار پر کھینچنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ ان افکار کو قلم بند کرنے، محفوظ و منشور کرنے کے لیے سیّد مودودی نے پوری پوری راتیں جاگ کر خونِ دل و جگر سے سرمایۂ حیات اکٹھا کیا ہے۔ ان خیالات و افکار پہ تربیت حاصل کیے ہوئے ہزاروں کارکنوں کی ایک فعال ٹیم ہے، جنہیں اپنے مقصدِ زندگی اور نصب العین سے اتنا عشق ہے کہ وہ اس کے حصول کے لیے اپنا وقت، اپنا سرمایہ اور اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بھلا ایسی فعّال اور سرگرم ٹیم کی موجودگی میں، سیّد مودودی صاحب کی گرفتاری سے ان کے بدخواہوں کو کیا حاصل ہو سکتا تھا؟

سنٹرل جیل ملتان

سیّد مودودی صاحب آخری پان کھا کر، احباب کو الوداع اور خدا حافظ کہ کر ۹ بجے رات مرکز سے روانہ ہوئے۔ پہلے تھانہ پُرانی انارکلی پہنچے، وہاں سے رات کو گیارہ بجے روانہ ہو کر رات کے دو بجے لائل پور پہنچے۔ رات کوتوالی میں بسر کی اور صبح انہیں جیل میں پہنچا دیا گیا۔ جیل کا عملہ ان سے احترام سے پیش آتا رہا۔ سات روز کے بعد انہیں موٹر کے ذریعے جھنگ کے راستے ملتان پہنچا دیا گیا، جہاں انہوں نے سنٹرل جیل ملتان میں باقی پوری قید کاٹی، جو ڈیڑھ سال سے زائد رہی۔

شروع میں جو حکم دیا گیا تھا، اس کی رُو سے ان تینوں حضرات کو ایک ایک ماہ کی سزا دی گئی تھی۔ لیکن جب صیادوں نے دیکھا کہ یہ تو برضا و رغبت قفس میں آ پہنچے ہیں، یہ تو ذرا سا بھی نہیں پھڑپھڑائے ہیں، تو انہوں نے میعادِ قفس میں اضافہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو انہوں نے سوچا انہیں اکٹھا ہی کر دیا جاتے تو کیا حرج ہے۔ خوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے تین۔ چنانچہ کیمبل پور سے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو اور قصور سے میاں طفیل محمد صاحب کو بھی ملتان سنٹرل جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر ۴۸ء کو عیدالاضحیٰ تھی، سیّد مودودی صاحب نے اکیلے گزاری۔ لیکن اس

کے بعد اگلے روز ۱۵ اکتوبر کو میاں طفیل محمد صاحب ان کے پاس پہنچ گئے اور ایک ہفتہ بعد ۲۲ اکتوبر کو اصلاحی صاحب بھی آ گئے۔ یوں سرزمینِ ملتان کو جماعت اسلامی کے زعماء کی "سرکاری مہمان نوازی کا شرف" حاصل ہوا۔ یہ شرف، سنٹرل جیل ملتان کو ایک مرتبہ اور بھی حاصل ہوا۔ مارشل لاء کے دوران ۵۳ء والی گرفتاری کے بعد بھی سید صاحب کا نشیمن اسی جگہ بنا۔

میاں طفیل محمد صاحب نے ۴۸ء سے ۵۰ء تک کے حالات "اسیری، گرفتاری سے رہائی تک" کے عنوان سے قلم بند کیے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"ماڈل ٹاؤن سے آگے بڑھے تو سڑک بالکل صاف تھی۔ ہر طرف بالکل خاموشی تھی۔ ذی الحجہ کا چاند غروب ہو چکا تھا اور چاروں طرف سخت اندھیرا تھا۔ میرے ساتھی پولیس والوں کو معلوم کرنے کا اور خود مجھے یہ واضح کرنے کا شوق تھا، کہ آخر مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے جماعت کی دعوت، اس کا طریقِ کار، جہادِ کشمیر، حلفِ وفاداری اور فوجی بھرتی کے بارے میں جماعت کے مؤقف اور اس بارے میں مرکزی وزیرِ داخلہ اور وزیر اعظم پنجاب سے تبادلۂ خیالات سب کو بالاختصار ان کے سامنے رکھ دیا اور ان پر واضح کیا کہ ہم انہی خیالات و نظریات اور اسی مؤقف کو حق سمجھتے ہیں انہی پر ساری قوم کو لانا چاہتے ہیں۔ کوئی قوت جبر و زور کے ذریعہ ہمیں انشاء اللہ اس سے پھیر نہ سکے گی۔"

اس کے بعد میاں صاحب کو قصور میں لے جا کر جیل میں سرکاری مہمان بنا دیا گیا۔ جب دوسرے قیدیوں نے ان سے پوچھا کہ کس جرم میں یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے جماعت اسلامی اور مطالبۂ نظامِ اسلامی کا ذکر کیا تو ایک قیدی نے کہا "تے فیر مولوی جی تہانوں مبارک ہووے ایہہ سعادت تے اللہ سبھناں نوں نصیب کرے (ایسی بات ہے تو مولوی صاحب آپ کو مبارک ہو۔ ایسی سعادت تو خدا ہر ایک کے نصیب میں کرے)۔"

میاں صاحب کو سنٹرل جیل ملتان میں پہنچا دیا گیا تو ———— "ایک اسسٹنٹ

سپرنٹنڈنٹ صاحب مجھے جیل کے اندر لے چلے۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ یہ ایک دوسرا ہی عالم ہے اور ایک پورا شہر آباد ہے، جہاں نہ باہر کی دنیا کی کوئی خبر ہے اور نہ باہر کی دنیا کو اس کی کوئی خبر ہے۔ ڈیوڑھی کے دو تالوں سے گزر کر پہلے گودام آئے۔ اس کے بعد کچن اور پھر ایک گلی میں سے ہوتے ہوئے، جیل کے ہسپتال کے دروازے پر پہنچے، تالا کھلا، ہم اندر داخل ہوئے اور یہ تیسرا تالا بھی بند ہوگیا۔ ہسپتال میں سے گزر کر ایک اور دروازہ پر پہنچے، اندر سے سنتری نے دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور یہ تالا بھی بند کر دیا گیا۔ اب میں چار تالوں کے اندر تھا۔ یہ سیاسی قیدیوں کا وارڈ تھا، اس جیل کے دوسرے وارڈوں کی طرح یہ وارڈ بھی دو منزلہ تھا، نو کوٹھڑیاں نیچے اور نو ہی ان کے اوپر تھیں۔

مجھے بتایا گیا کہ کوٹھڑی نمبر چار میں مولانا مودودی صاحب رہتے ہیں لیکن وہ اپنی کوٹھڑی میں موجود نہیں تھے۔ میرے لیے کوٹھڑی نمبر ۹ کھول دی گئی اور اس میں ایک چار پائی، ایک کرسی، ایک تپائی، ایک سٹول اور ایک گنجینہ (جالی کی چھوٹی سی الماری) لگا دی گئی۔ مولانا کے متعلق پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ وضو کے لیے غسل خانہ میں گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے۔ پاؤں میں کھڑاویں، ہاتھ میں لوٹا، کندھے پر تولیہ اور سر کے بال پریشان۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ گویا انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے سامنے واقعی میں کھڑا ہوں۔ انہیں میری آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ خیر خوب خوب ملاقات ہوئی اور مجھے تو یہ سمجھئے کہ دنیا بھر کی دولت مل گئی۔

۲۲ر اکتوبر کو ہم نمازِ مغرب کے بعد کھانے سے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ وارڈ کا بیرونی دروازہ کھلا اور دو تین قیدی بستر اور ٹرنک اور اسی طرح کا سامان لے کر داخل ہوئے اور مولانا امین احسن صاحب نے نہایت مضبوط آواز کے ساتھ "السلام علیکم" کہا۔ ان کی آمد ہمارے لیے اور ہماری یہاں موجودگی ان کے لیے بالکل خلافِ توقع تھی۔ اس اجتماع پر ہم بہت مسرور ہوئے۔ لیکن اس سے ہم نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اب ہماری نظر بندی کے ابتدائی ایک ماہ کے حکم کی توسیع لازمی ہے۔ اصلاحی صاحب کی آمد سے پہلے کبھی یہ خیال ہوتا تھا

کہ شاید مولانا مودودی کو رکھ کر مجھے یا مجھے اور اصلاحی صاحب دونوں کو چھوڑ دیا جائے لیکن اب ہمارے نزدیک ہم سب کی نظر بندی میں توسیع ایک طے شدہ امر تھی۔ چنانچہ نظر بندی کی میعاد ۳۰ اپریل ۴۹ء تک بڑھا دی گئی۔

ملتان جیل میں پہلی ششماہی کے تقریباً دو ماہ اس طرح گزرے کہ مولانا مودودی صاحب کے پاس ایک قرآن مجید اور اصلاحی صاحب کے پاس انگریزی کی دو کتابیں تھیں۔ اور کاغذ، قلم، دوات یا کوئی اور لکھنے پڑھنے کا سامان کچھ نہ تھا۔ پھر کچھ صفحات لگے ہوئے سفید کاغذ اور قلم دوات ملنے لگے اور پھر گھر سے کتابیں منگوانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن قرآن مجید اور حدیث شریف تک بھی سنسر کے بغیر نہ آسکتی تھی۔ اب ہمارا پروگرام معمولاً یہ تھا کہ علی الصبح نماز فجر، اس کے بعد ٹہلنا اور ورزش، ناشتہ اور غسل۔ اس کے بعد میں مولانا مودودی صاحب سے کم و بیش ایک گھنٹہ قرآن مجید پڑھتا اور پھر دوپہر تک قرآن مجید کے حواشی کو نوٹ کرتا اور اگلے سبق کی تیاری کرتا۔ مولانا مودودی صاحب اور اصلاحی صاحب اپنے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد نماز ظہر اور پھر اخبارات اور عام مطالعہ ہوتا، جس کا سلسلہ عصر تک رہتا۔ عصر کے بعد چائے اور پھر ٹہلنا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا اور اس کے بعد تبادلۂ خیالات اور مسائلِ حاضرہ پر گفتگو اور تبصرہ۔ پھر عشا کی نماز پڑھ کر سو جاتے۔"

گرفتاری سے ساڑھے تین ماہ بعد ۲۰ جنوری ۴۹ء کو سیّد مودودی صاحب نے سنٹرل جیل ملتان سے حافظ آباد کے حکیم محمد شریف صاحب کو ایک خط لکھا، جس سے نہ صرف سیّد صاحب کی صحت کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ ان کے کردار کا بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا نے تحریکِ اسلامی کو کس عظیم کردار کے مالک انسان کی قیادت عطا کی ہے۔ سیّد صاحب نے لکھا:

"جس روز میں گرفتار ہوا تھا اس سے پانچ چھ روز پہلے مجھے محسوس ہوا کہ ایک پتھری گردے سے مثانے میں منتقل ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں نے پیس کر پینے کی دوا اور جوشاندے کا استعمال فوراً شروع کر دیا جس سے پتھری بالکل احلیل میں آ کر اڑ گئی اور پیشاب رک رک

کرآنے لگا، جو اس بات کی علامت تھی کہ اب پتھری خارج ہوا چاہتی ہے۔ ٹھیک اسی زمانے میں وہ تاریخ آگئی جو خدا نے میری گرفتاری کے لیے مقرر کی تھی۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ نہ پیس کر پینے کی دوائیں استعمال ہو سکتی تھیں اور نہ جوشاندے کا اہتمام ہو سکتا تھا۔ اس لیے دوائیں چھوڑ چھاڑ کر پولیس کے ساتھ ہو لیا، لائل پور جیل میں پیشاب بیحد تکلیف سے آتا رہا بلکہ ایک دن تو بالکل ہی رُک گیا تھا۔ اس وقت اگر دوا مل جاتی تو غالباً اسی وقت پتھری خارج ہو جاتی مگر دوا نہ ملنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور تکلیف جاتی رہی۔

اس وقت پتھریاں پھر اخراج کی طرف مائل ہیں، مگر خدا کی مرضی کچھ اور معلوم ہوتی ہے اور غالب بہر حال اسی کی مرضی کو ہونا ہے۔ آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ مَیں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے۔ لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کیخلاف ہے۔ مَیں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کرتا۔ لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہوں بس اسی پر اکتفا کیجیے۔"[1]

اس سے چار ماہ بعد ۲۰ مئی کو سیّد صاحب نے اپنے بیٹے احمد فاروق مودودی کو خط لکھا، جس سے ان کی صحت اور عزم دونوں کا پتہ چلتا ہے:

"گرفتاری کے روز تم لوگوں کے سامنے گھر سے جو پان کھا کر چلا تھا، اسے راستے میں تھوک کر کُلّی کی اور ایک لمحہ کے اندر اٹھارہ برس کی تمباکو نوشی کی عادت کو اس طرح چھوڑ دیا کہ پھر مجھے پان اور زردے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ چلنے پھرنے کی عادت برسوں سے چھُوٹ گئی تھی اور گردے کی بیماری نے تو مجھے چند فرلانگ چلنے کے قابل بھی نہ رکھا تھا۔ مگر اب مَیں نے چلنے کی عادت بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دی ہے کہ تقریباً آٹھ میل روزانہ چل لیتا ہوں

---

[1] حکیم محمد شریف: مکاتیبِ زنداں۔

اور کوئی تکان نہیں ہوتی۔ جاڑے میں تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ٹھنڈے پانی سے وضو اور کُلّی تک کرنے سے مجھے نزلہ ہو جاتا تھا اور ہفتوں تنگ کرتا تھا۔ مگر یہاں سارے جاڑے کھُلی جگہ ٹھنڈے پانی سے نہایا اور ٹھنڈے ہی پانی سے وضو کیا اور تقریباً کھُلی جگہ سوتا رہا اور ایک دن بھی نزلہ کی شکایت نہیں ہوئی۔ اب جب سے گرمی شروع ہوئی ہے، ہاتھ کا پنکھا تک استعمال نہیں کیا ہے اور لکھنے پڑھنے کا کام اس رفتار سے جاری ہے جس طرح اچھے موسم میں ہو رہا تھا۔ خدا نے چاہا تو پنکھے اور ہوا کی غلامی سے بھی چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ صحت اب میری اس قدر اچھی ہے کہ برسوں سے کبھی اتنی اچھی نہیں ہوئی تھی۔ اب انشاءاللہ پہلے سے زیادہ کام کروں گا اور زیادہ قوت اور زور سے کروں گا۔"

باب ۲۲

قرارداد مقاصد

چار نکاتی مطالبہ

کچھ لوگوں کی یہ بھول ہے کہ جماعت اسلامی صرف سیّد مودودی کی ذات کا نام ہے۔ ان کے بعد جماعت اسلامی میں کچھ باقی نہیں ہے۔ یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ سیّد مودودی صاحب اب تک چار مرتبہ اور مجموعی طور پر قریباً چار سال کے لیے جیل میں گئے، بیماری کی وجہ سے انہوں نے امارت سے ایک سال چھٹی لی، اس دوران جماعت ان کے بغیر پوری طرح کام کرتی رہی۔ اس بات سے بھی سیّد مودودی صاحب کی عظمت آشکارا ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی ایسی تربیت کی ہے اور جماعت اسلامی کا نظام ایسی مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ یہ افراد کی محتاج نہیں رہی، خواہ وہ سیّد مودودی صاحب کی طرح عظیم کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ۴ر اکتوبر ۴۸ء کو سیّد صاحب گرفتار ہوئے اور ۱۱ر اکتوبر کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے نئے امیر کا انتخاب کیا۔ جماعت اسلامی پاکستان کے دوسرے امیر عبدالجبار غازی منتخب ہوتے انہوں نے مطالبۂ نظام اسلامی کی مہم کو منظم کیا۔

جماعت اسلامی نے "مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں؟" نامی پمفلٹ شائع کر کے خوب پھیلایا۔ لوگوں کے ذہنوں سے ان تمام اعتراضات کو صاف کیا، جو حکومت نے جہادِ کشمیر وغیرہ کے سلسلے میں اُٹھائے تھے۔ پھر مثبت طور پر چار نکاتی مطالبے کے لیے شہروں اور قصبوں میں، دیہاتوں اور میلوں میں تقریریں کیں، جلسے کیے، کتبے لکھے، مطالبے کے ہزاروں نہیں لاکھوں خطوط وزیر اعظم پاکستان، صدر دستور ساز اسمبلی اور اراکینِ دستور ساز اسمبلی کو بھیجے۔ حتیٰ کہ ان کے مطالبے کو نظر انداز کرنا ایوانِ حکومت، اخبارات، مخالفین اور مولویوں سب کے لیے ناممکن ہو گیا اور رائے عامہ جماعت اسلامی کے چار نکاتی مطالبے کے حق میں ہموار ہوتی گئی۔

اسعد گیلانی صاحب لکھتے ہیں "اکتوبر ۴۸ء تا جنوری ۴۹ء ———— مولانا کی گرفتاری بجائے مخالفین کے تحریکِ اسلامی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ ان چار مہینوں میں مولانا اور جماعت کے خلاف پھیلائی ہوئی بدگمانیاں دُور ہو گئیں اور ملک کی رائے عامہ بڑی تیزی سے مطالبہ کی مہم پر مجتمع ہو گئی اور عوام کی ہمدردیاں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئیں۔ فروری ۴۹ء کے مہینے میں جماعت اسلامی نے "اسلامی دستور کے مطالبہ" کا تیسرا ریلہ پوری شدت کے ساتھ اُٹھایا۔ اس کے کارکن ایک مستحکم عزم کے ساتھ مطالبہ کے محاذ پر جم گئے اور مارچ ۴۹ء میں عوام کے مکمل تعاون و اشتراک کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے اَن تھک کارکنوں نے اسلامی مطالبہ کا یہ ریلہ اس طوفانی انداز سے اُٹھایا کہ اس کا مقابلہ کسی کے بس میں نہ رہا اور حکومت نے مجبور ہو کر ۱۲ مارچ ۴۹ء کو وہ مشہور و معروف "قراردادِ مقاصد" منظور کر لی جو پاکستان کے لیے صحیح اسلامی سمتِ سفر متعین کرتی ہے۔"

"قراردادِ مقاصد پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت کی حامل ہے۔ اس لیے اس کا سرسری ذکر مناسب نہیں ہوگا، اگرچہ اسے مسلم لیگی قیادت نے پیش کیا اور دستور ساز اسمبلی میں پاس کیا، تاہم سیاست دانوں کے علاوہ اس قراردادِ مقاصد کے پیچھے دو اور عوامل بھی تھے۔ علمائے کرام اور جماعت اسلامی، علمائے کرام نے مسلم لیگی حکومت کے کارپردازوں

سے قرارداد میں قرآن اور سنت کے الفاظ لکھوائے، خدا کی حاکمیت کا اقرار کروایا۔ لیکن جماعتِ اسلامی نے چار نکاتی مطالبے کو عوامی مطالبہ بنا کر، حکومت کے لیے اس مطالبے کو نظر انداز کرنا مشکل بنا دیا۔ بائنڈر نے لکھا ہے :

"(جماعت اسلامی) نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ علمی و فکری اثر رکھتی ہے، بلکہ اس نے اسلامی دستور کی بحث میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد جماعت نے اسلامی دستور کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا۔ اپنے پروپیگنڈہ اور طریقِ کار سے اس نے دونوں طبقوں یعنی علماء اور جدید طبقہ یا لادینی سیاست دانوں کو اپنے اپنے مؤقف سے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور ایک ایسا حل پیش کیا جو دونوں طبقوں کے درمیان اتفاق رائے کی بنیاد بن سکا[۱]۔"

علمائے کرام کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے بائنڈر نے لکھا ہے "جمعیت العلمائے اسلام جو ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ کی امداد و اعانت کے لیے منظم کی گئی تھی، اسے توقع تھی کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی۔ پاکستان بننے کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء تک علمائے اسلام کی تنظیم مکمل نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کراچی پہنچ گئے اور انھوں نے جیکب لائنز میں مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کے گھر میں ایک دفتر بنایا۔ چند ہی دنوں میں یہ چھوٹا سا گھر کراچی کے علماء اور ان کے معاونین کی آمد و رفت کا مرکز بن گیا۔ ان معاونین میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب بھی تھے، جن کا اب تک مسلم لیگ سے تعلق تھا۔ حالانکہ عثمانی صاحب کو اب کسی درمیانی واسطے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کو جمعیت العلمائے اسلام کے ایک اجلاس نے ایک ریزولیشن پاس کیا، جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایک ممتاز عالمِ دین کو شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز کرے جو ملک میں تمام قاضیوں پہ مناسب، وزارتی اور انتظامی اختیارات کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ علمائے اسلام کی تمام شاخوں کے ذریعے پورے ملک کی رائے عامہ کو پاکستان کے لیے خالص اسلامی دستور بنانے کے حق میں ہموار کرنے کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ دینیات کی وزارت کی پوری تنظیم کا خاکہ مرتب کیا گیا۔ حتیٰ کہ مختلف عہدوں

---

۱ "Religion and Politics in Pakistan", p. 76 : Leonard Binder.

کے سامنے نام بھی تجویز کر دیئے گئے۔

اگست ۴۷ء میں قائد اعظم نے دستور ساز اسمبلی سے کہا تھا کہ آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ بات سیاسی مفہوم میں اور ریاست کے باشندوں کی مساوی حیثیت کی وجہ سے ہوگی ـــــــ اگست ۴۷ء میں قائد اعظم نے کسی بھی وجہ سے مندرجہ بالا بات کہی ہو بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اواخر جنوری ۴۸ء تک ماحول چار نکاتی مطالبے اور اسلامی دستور کے حق میں اس حد تک تبدیل ہو گیا کہ قائد اعظم مرحوم نے لادینی دستور کے خلاف یہ کہہ کر ویٹو استعمال کیا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک کیوں پیدا ہو رہے ہیں کہ پاکستان کا آئندہ دستور قانونِ شریعت سے متصادم ہوگا۔ لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو ہر ایک کو کہتا پھرتا ہے کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد شریعت پر رکھی جانی چاہیئے۔ دوسرا گروہ جان بوجھ کر شرارت کر رہا ہے اور ہنگامہ آرائی پر اکسا رہا ہے کہ شریعت کا قانون ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینا چاہیئے[1]۔"

قراردادِ مقاصد

"قائد اعظم زندہ رہ جاتے تو وہ دیکھتے کہ ان کے فیصلوں کا ان کے پیروکاروں نے کیا حشر کیا۔ قائد اعظم نے کہا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی لیکن انگریزی عہد کا طوقِ زبان انگریزی ابھی تک ہماری گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔ دوسرا انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد شریعت پر رکھی جائے گی اور مسلم لیگ کے بڑے بڑے قد آور اور کج کلاہ لیڈر قائد اعظم کے ان "منسوخ" الفاظ کو اپنی مطلب براری کے لیے بیس سال بعد تک استعمال کرتے رہے ہیں کہ مذہب انفرادی معاملہ ہے۔

"قائد اعظم کی رحلت کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خاں ان کے جانشین کی حیثیت سے اُبھرے۔ ان کی حُبّ الوطنی، بے لوثی اور خدمتِ ملک قابلِ رشک ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ حالات نے انہیں یہ احساس دلا دیا کہ وہ پاکستان میں "انا ولا غیری" ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے وہ

---

[1] Ibid; P.97-100

وزیر اعظم تھے، پھر وزیر دفاع بھی ہو گئے اور پھر مسلم لیگ کے صدر بن کر انہوں نے پارٹی اور حکومت کو ایک کر کے، آمریت کا پہلا پتھر رکھا جس پر بعد کے آنے والوں نے عمارتیں تعمیر کر دیں۔ اکتوبر ۴۸ء میں وہ پنجاب میں میاں دولتانہ اور ممدوٹ کی سیاسی اُلجھنوں کو سُلجھانے کے لیے آئے تو ان کی موجودگی میں ۴؍اکتوبر کو پنجاب کی حکومت نے سید مودودی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جہادِ کشمیر کا جھوٹا الزام لگا کر گرفتار کر لیا، حالانکہ اس سے دو ہفتے پہلے سر ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کے لیے سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو جماعت اسلامی کی شوریٰ نے اعلان کر دیا تھا کہ کشمیر کی لڑائی جہاد ہے۔

حالات کی نبض علمائے کرام کو احساس دلا رہی تھی کہ سیاست دانوں کی نیتیں قانونِ شریعت کے بارے میں کھوٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی لیے ۹؍فروری ۴۹ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں جمعیت العلمائے اسلام کی کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ان خدشات کا اظہار کیا۔ بائنڈر لکھتا ہے:

"انہوں نے حصولِ پاکستان کے لیے علماء کی کوششوں اور ان کے عظیم کارناموں کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد انکشاف کیا اور مسلم لیگ پہ الزام لگایا کہ اب جب کہ پاکستان علماء کی کاوشوں اور اعانت سے معرضِ وجود میں آ چکا ہے۔ وہ علماء سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ عثمانی صاحب نے اس بات کو بار بار دہرایا کہ پاکستان صرف اس لیے بنا ہے کہ یہ اسلامی ریاست بنے۔ انہوں نے اس کی تائید میں جناح اور لیاقت علی خاں کے اقوال کا حوالہ دیا۔ پھر عثمانی صاحب نے پاکستان کی اسلامی مملکت کے لیے ۹ بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی، جن میں مولانا مودودی کے خیالات منعکس نظر آتے ہیں۔ لیکن باقی اصولوں میں علمائے کرام کے پسندیدہ مشغلے یعنی فقہی اختلافات اور فرقوں کے احترام پر زور تھا۔ پھر انہوں نے اسلامی دستور پہ اُٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا۔"[1]

مسلم لیگ جس نے ابھی ابھی حصولِ پاکستان کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کے

---

[1] Ibid; P. 139.

بڑے بڑے جغادری لُوٹ کھسوٹ، اُکھاڑ پچھاڑ اور بدنظمی میں اس وقت مصروف تھے۔ وہ بھارت پدھارنے والے ہندو سیٹھوں کی جائیدادوں، کارخانوں اور ملوں کو اس طرح لڑ جھگڑ کر اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے نام الاٹ کروانے کی کوشش کر رہے تھے، جس طرح چوری کے مال پر چوروں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ قائداعظم ابھی صاحبِ فراش بھی نہیں ہوتے تھے کہ عہدوں، وزارتوں اور کرسیوں کے لیے لیگیوں میں سرپھٹول شروع ہو گئی تھی۔ لیگی حکومت اپوا جیسی تنظیموں کی بنیاد رکھ کر اس کی سرپرستی کے راستے ملک میں بے پردگی کو رواج دینے کی کوشش کر رہی تھی اور ملک جس مقصد یعنی اسلام کے لیے حاصل کیا گیا تھا، اس کی طرف ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا تھا، کہ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں بھارتی پارلیمنٹ کو بھارتی دستور کے مسودے کی اطلاع دی گئی۔ اب حکومتِ پاکستان کو احساس ہوا کہ بھارت تو دستور سازی میں آگے نکل گیا۔ ہم تو دنیا میں نکوّبن جائیں گے۔ اس لیے ہمیں بھی کوئی قدم اس سمت میں ضرور اُٹھانا چاہیئے۔

لیونارڈ بائنڈر نے لکھا ہے:

"جب بھارتی پارلیمنٹ کو ۱۹۴۸ء کے آخر میں یہ بتایا گیا کہ بھارت کے دستورِ اساسی کا مسوّدہ تیار ہو چکا ہے تو حکومتِ پاکستان پر دستور مکمل کرنے کے لیے بہت زور دیا جانے لگا۔ کیونکہ پاکستان کی عزّت خطرے میں تھی۔ حکومت نے تہیہ کر لیا کہ دستور سازی کا کام شروع کر دیا جائے۔ حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر قوم کو متحد کرنے والا ایک ڈرامائی بیان دے گی، جس میں بتایا جائے گا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے ——— ۲۵ فروری ۴۹ء کو مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی مجوزہ قرارداد مقاصد پر غور کرنے کے لیے انتہائی رازداری سے جمع ہوئی۔ اس روز تو کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لیکن ۲ مارچ کے انگریزی روزنامہ ڈان کراچی میں منظور کردہ قرارداد کا متن شائع ہو گیا۔ تمام مذہبی مدارسِ فکر نے اس قرارداد پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اخبارات نے اسے چیختی ہوئی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔"[۱]

۱؎ Ibid; P. 142.

۷ رمارچ ۴۹ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے قراردادِ مقاصد کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا۔

"چونکہ پوری کائنات پہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور چونکہ وہ اختیار ایک مقدّس امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریاست پاکستان کو اس کے باشندوں کی وساطت سے تفویض کیا ہے اور جو اسی کی ہی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے باشندگانِ پاکستان کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی عزم کرتی ہے کہ وہ آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستورِ اساسی تشکیل دے گی جس میں ریاست، لوگوں کے منتخب نمائندوں کے ذریعے، طاقت اور اختیارات کو استعمال کرے گی۔ جس میں اسلام کے بتلائے ہوئے اصولِ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف پہ عمل کیا جائے گا۔ جس میں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ قرآن اور سُنّت میں دی ہوئی اسلامی تعلیمات اور احکامات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منضبط کر سکیں جس میں اقلیتوں کے لیے مناسب اہتمام کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب پر عمل درآمد کر سکیں اور اپنی تہذیب و تمدن کو نشو و نما دے سکیں۔ جس میں قانون اور اخلاقِ عامہ کے اصولوں کے اندر رہتے ہوئے تمام بنیادی حقوق کی، جن میں مرتبہ، مواقع اور قانون کی مساوات، معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف، خیال، اظہار، عقیدہ، مذہب، عبادت اور اجتماع کی آزادی شامل ہیں، ضمانت دی جائے گی۔ تاکہ پاکستان کے عوام خوشحال ہوں اور وہ اقوامِ عالم میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کریں اور وہ بین الاقوامی امن اور انسانیت کی ترقی و خوشحالی میں اپنا پورا حصّہ ادا کر سکیں۔"

قراردادِ مقاصد پہ کانگرسی ارکان مسٹر بی کے دتّہ اور مسٹر چٹو پادھیا نے اعتراضات کیے اور کہا کہ اگر اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے تو پھر یہ لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہوا۔ لہٰذا پاکستان جمہوریت نہ ہوئی۔ میاں افتخار الدین نے جو بعد میں مسلم لیگ سے نکالے گئے اور انہوں نے کمیونسٹ پارٹی اور اخبارات جاری کیے کہا کہ یہ بات کہہ کر کہ اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے کوئی غیر معمولی بات نہیں کی گئی ہے۔ سردار عبدالرب نشتر نے کہا کہ بھئی خدا کی حاکمیت تو امرِ واقعہ ہے۔ ہم اسے زبان سے کہیں یا نہ کہیں یہ حقیقت ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب

نے پیاری بات کہی "ہماری قرارداد یہ کہہ رہی ہے کہ ہماری سیاست کی بنیاد خدا شناسی پر استوار کی جائے"

دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں پر مشتمل ضخیم جلدوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کے الفاظ محفوظ ہیں، جنہوں نے قرارداد کی ترتیب و پیش کش میں اہم حصہ لیا تھا "اب اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ تو خدا کی دی ہوئی اجازت کے بغیر ہم اس کی ملکیت میں کسی قسم کا تصرف کرنے کے حق دار نہیں ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے انبیاء کرام کو دنیا میں اس لیے مبعوث کیا اور انہیں آسمانی کتابیں دیں کہ بنی نوع انسان کو حلال و حرام کا پتہ چل جائے۔ اسی ہمہ گیر حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرارداد میں 'اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر' کے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ اسلامی ریاست اور ایک لادینی مادی ریاست میں یہی بنیادی اختلاف ہے۔"

ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب نے ۱۲ مارچ کو جس روز یہ قرارداد صرف کانگرسی ارکان کے مختصر ووٹوں کی مخالفت کے بعد پاس ہوئی۔ اسلامی نقطۂ نظر کی بہت اچھی ترجمانی کی" ——— یہ ایک محدود جمہوریت ہو گی۔ عوام کے ہاتھ میں اختیارات ہوں گے لیکن کلّی اختیارات نہیں ہوں گے۔ کچھ امور ایسے ہیں جنہیں صرف خدا ہی فیصل کر سکتا ہے۔ اور وہ اسی کے اختیارات میں آتے ہیں۔ باقی معاملات لوگوں کے لیے چھوڑ دیئے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کریں۔ ریاست قرآن کے اصول و قوانین کی پابند ہو گی۔ جنہیں عوام یا ریاست تبدیل کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک وسیع میدان ہے جس میں لوگ آزادی سے قانون سازی کر سکیں گے۔ اسے آپ 'خدائی جمہوریت' کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایسی جمہوریت جو خدا کے احکامات کی پابند ہے۔ لیکن چونکہ خدائی کا لفظ عام رواج میں نہیں ہے، ہم اسے اسلامی جمہوریت کہہ سکتے ہیں۔"

اہم نقطۂ انقلاب

لیونارڈ بائنڈر نے قراردادِ مقاصد کے بارے میں تاثرات لکھے ہیں "مولانا مودودی

کے چار نکاتی مطالبے اور علماء کے خیالات کو منظور کر لیا گیا تھا۔ لیکن قرارداد میں ایسی لچک اور وسعت رکھ دی گئی تھی کہ اس سے اسلام کا جدید تصور بھی مجروح نہیں ہوتا تھا۔ شریعت کا لفظ نکال دیا گیا۔ مقرر کردہ حدود اور اسلامی تعلیمات و احکامات کی کوئی وضاحت نہیں تھی ——— ایسی خود آشکار اور بے کار قراردادِ مقاصد علمائے کرام کے لیے نہایت اہم تھی۔ کیونکہ ابتدائے اسلام سے عربی زبان میں خدا کی حاکمیت کا واضح اور متعین مفہوم ہے، اس لیے علماء نے اس قرارداد کے پاس ہونے کا منطقی مطلب یہ لیا کہ خدا کا قانون ہی ریاست کا قانون ہوگا۔ اس مبہم اعلان کا یہ مطلب سمجھا گیا کہ سیاست دان شریعت کے اس قانون پر عمل کرانے کے پابند ہو گئے ہیں، جس کے مطالبے پر انہوں نے یعنی علماء نے اپنی عمریں گزار دی تھیں۔ حالانکہ ان میں سے کتنے لوگ تھے جو لفظ اقتدارِ اعلیٰ کے اس مفہوم کو جانتے تھے، جس میں یہ مغربی اصطلاح علمِ سیاست میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن انہیں کچھ کچھ ضرور معلوم ہو گیا کہ اقتدار اعلیٰ قانون کا مآخذ ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی مرضی کو قانون کہا جاتا ہے۔ مغربی اصطلاح کے اس مفہوم کو عام کرنے کا کریڈٹ مولانا مودودی کو جاتا ہے۔ جنہوں نے اپنے چار نکاتی مطالبے کے آخری نکتے سے ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ کتاب و سنّت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکے گا۔[1]"

سید مودودی صاحب نے قراردادِ مقاصد کے بارے میں کچھ تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ یہ تحریکِ اسلامی کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہے۔ سیّد صاحب نے لکھا ہے:

"جماعتِ اسلامی کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مطالبے کی یہ مہم سراسر اس کی طاقت سے کامیاب ہوئی ہے۔ بلاشبہ ملک کی تمام اسلامی جماعتوں اور تمام دین پسند عناصر کی قوت اس میں شریک تھی اور اس میں ان لوگوں کا بھی حصّہ تھا جو نہ اس وقت جماعت کے دوست تھے نہ آج ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جماعتِ اسلامی ہی اس کی اصل محرک تھی اور اگر یہ منظم طاقت اس کی پُشت پر نہ ہوتی تو ان منتشر آوازوں سے جو وقتاً فوقتاً اس نظام کے حق میں اُٹھتی رہتی

---

[1] Ibid; P. 145.

تھیں، اس مطالبہ کا ایک باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرنا اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے اس مہم کے سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے اور وہ برسرِ اقتدار گروہ بھی جانتا ہے جسے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔

قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلم قوم اور پاکستانی مملکت کا نصب العین واضح صورت میں متعین ہو گیا اور اس نے ایک پختہ آئینی شکل اختیار کر لی، جس کا بدلنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کا دوسرا اور اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا کہ مملکتِ پاکستان اصولاً ایک اسلامی مملکت میں تبدیل ہو گئی۔ اس دوسرے فائدے کی اہمیت بھی وہ لوگ ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں جنہیں آئینی مسائل کا فہم حاصل نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر ان کی سمجھ میں اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس مملکت کی حیثیت میں اس قرارداد کی بدولت کیا بنیادی فرق واقع ہو گیا ہے۔ لیکن ہم نے چونکہ تمام آئینی و شرعی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد خوب سوچ سمجھ کر یہ سوال اٹھایا تھا، اس لیے ہم پر اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج ہی نہیں، قانونی اور شرعی نتائج بھی پوری طرح روشن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہوتے ہی جماعتِ اسلامی نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور اپنے دستور، پالیسی اور طریقِ کار میں اس تغیر کا اعلان کر دیا جو مملکت کی آئینی حیثیت کے تغیر سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔

اصولاً ایک تحریری دستور رکھنے والے مُلک میں صرف اس کی دستور ساز اسمبلی یا اسی نوعیت کے اختیارات رکھنے والی کوئی مجلس ہی وہ آئینی زبان ہو سکتی تھی، جس سے شہادتِ اسلام ادا ہونے پر اسے اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا تھا۔ ہماری نوزائیدہ مملکت نے جب اپنی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا کر دی تو جس روز شہادت ادا ہوئی، ٹھیک اسی روز جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اس کے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا۔ اور اس کے ۲۴ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ اب اس کی ملازمت جائز ہے، اس کے قوانین اپنی عارضی نوعیت میں قابلِ تسلیم ہیں، اس کی عدالتوں میں جانا

حلال ہے اور اس کی اسمبلی و پارلیمنٹ کے انتخابات میں ہر حیثیت سے حصہ لیا جاسکتا ہے، اس دستوری تغیر کے ساتھ جماعت نے اپنی پالیسی میں بھی یہ تغیر کیا کہ وہ آئندہ اس ملک کے انتخابات میں حصہ لے کر آئینی طریقوں سے اس کو مکمل دارالاسلام بنانے کی کوشش کرے گی۔

یہ ہماری تحریک کی تاریخ میں ایک اہم نقطۂ انقلاب تھا جس نے ہمارے لیے ایک طریقِ کار کے بجائے دوسرے طریقِ کار کا دروازہ کھول دیا۔ اب ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دارِ عدو نہیں رہی، جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو بلکہ دارِ دوست، ہمارا اپنا دار بن گئی، جسے بنانا سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا۔[1]"

توسیعِ نظربندی

۱۷ تا ۱۸ اپریل ۴۹ء لاہور میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس مولانا عبدالجبار غازی صاحب کی امارت میں منعقد ہوا۔ جس نے قراردادِ مقاصد پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیا۔ حکومت سے ہمہ قسم کے تعاون و اشتراک کا اعلان کیا، تاکہ قرارداد کے مطابق دستور سازی کو اسلامی خطوط وہدایات پر اٹھایا جائے۔ ۹ رمئی ۴۹ء کو غازی صاحب ہی کی امارت میں پہلا کل پاکستان اجتماعِ عام منعقد ہوا، جس میں قیام نظامِ اسلامی میں حکومت کی ممکنہ مدد کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح جماعت نے کھلے دل سے حکومت کی طرف دستِ تعاون بڑھایا ______ لیکن حکومت اس ابھرتی ہوئی طاقت کو اب 'لفٹ' نہیں دینا چاہتی تھی۔ کیا معلوم یہ لوگ پھر قابو میں ہی نہ لائے جاسکیں؟

میاں صاحب ملتان سنٹرل جیل میں اپنی داستان سنا رہے ہیں: "جیل کی چار دیواری میں جو معلومات چھن چھنا کر آتی تھیں، ان سے ہمارا تاثر ایک حد تک یہی تھا کہ ملک کے حکمرانوں نے اس مطالبہ کو بالکل مجبوراً نہیں نگلا ہے بلکہ کسی حد تک بات ان کی سمجھ میں آگئی

---

[1] جماعت اسلامی، مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل ص ۷۰ تا ۷۲

ہے۔ اس لیے ہمیں یقین تو نہیں البتہ یہ خیال ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ غالباً اب نظر بندی میں توسیع نہیں ہو گی۔ لیکن اس ششماہی کا آخری دن آیا اور گزر گیا، مگر نہ تو ہمیں رہا کیا گیا اور نہ کوئی دوسری اطلاع ملی۔ چند روز بعد گورنر بہادر پنجاب کا 'پروانۂ خوشنودی' موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں شخص فلاں قانون کے تحت حکومت پنجاب کے حکم سے نظر بند ہے۔ اب حضور گورنر بہادر پنجاب اس کی نظر بندی میں فلاں تاریخ تک 'بمسرت' توسیع فرماتے ہیں —— اس سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ اب جب تک بر سرِ اقتدار گروہ کا بس چلتا ہے، ہمیں جیل میں ہی رہنا ہے۔"

مولانا مودودی صاحب نے ۳۱ر جولائی کو حکیم محمد شریف کے خط کے جواب میں لکھا:

"یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں ہیں کہ میری اور میرے رفقاء کی نظر بندی کے کچھ وجوہ ہیں، یا تھے، حضرت وجوہ نہیں اغراض ہیں اور وہ بھی اتنی گھناؤنی ہیں کہ ہمارے حکمران تک انہیں پبلک یا کسی عدالت میں پیش کرتے شرماتے ہیں۔ وجوہ کی بنا پر کسی کو پکڑنا ہو تو اس کے لیے تعزیراتِ ہند کافی سے زیادہ ہے۔"

اکتوبر ۴۹ء میں میاں طفیل محمد صاحب کی ایک دلچسپ "شرارت" سے جیل کی اکتا دینے والی یکسانیت میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا۔ جس سے کچھ رونق پیدا ہو گئی۔ وہ خود ہی اس چھیڑِ خوباں کی حکایت بیان کرتے ہیں۔ "اکتوبر ۴۹ء میں دوسری مرتبہ گورنر بہادر پنجاب کی طرف سے ہماری میعادِ نظر بندی میں چھ ماہ کی توسیع کے احکام آئے۔ طریقہ یہ ہے کہ اصل حکم کے ساتھ ایک نقل آتی ہے۔ اصل حکم پر نظر بند سے دستخط لے کر اسے واپس بھیج دیا جاتا ہے اور نقل اسے دے دی جاتی ہے۔ پچھلے بادشاہوں کی طرح پاکستان کے گورنر صاحبان بھی کوئی کام 'مسرت' کے بغیر نہیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی کو قید یا پھانسی کا بھی حکم دیتے ہیں تو یہی فرماتے ہیں کہ ہم مسرت کے ساتھ فلاں شخص کو قید یا پھانسی کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ نظر بندی میں توسیع کا حکم جب میرے سامنے دستخطوں کے لیے جیل والوں نے پیش کیا تو میں نے گورنر صاحب کے اس حکم کے جواب میں کہ —— ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب کو فلاں کی نظر بندی میں توسیع فرما کر مسرت ہوئی ہے —— یہ لکھ دیا کہ یہ جاننا باعثِ تسکین ہے کہ ہز ایکسیلنسی کو توسیع سے مسرت ہوئی ہے اور افسوس نہیں ہوا ہے۔

جب یہ کاغذ سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل کے پاس پہنچا تو دفتر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ گویا پورے سٹاف کی نوکریاں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ فوراً ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہانپتے کانپتے تشریف لائے اور میری خوشامدیں کرنے لگے کہ اس عبارت کو قلمزد کر دیجئے۔ ہم لوگ مارے جائیں گے، یہ ہوگا وہ ہوگا، ہم پر رحم کیجئے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آخر آپ پر کوئی حرف آنے کے کیا معنی۔ آپ گورنر صاحب کی ایک چٹھی میرے لیے لائے۔ میں نے جو جواب مناسب سمجھا، اس پر لکھ دیا، آپ کا کام یہ ہے کہ اسے واپس پہنچا دیں۔ آخر ہمارے اور حکومت کے مابین معاملات میں دخل دینے والے آپ کون ہیں؟ وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لائے اور انہوں نے خوشامد شروع کی۔ میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا اور ان کو سمجھایا کہ آپ کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی جان جا رہی تھی۔ آخر میں نے ان کو کہا کہ آپ اپنے قلم سے اسے کاٹ کر بھیج دیجئے، میں نہیں کاٹوں گا۔ لیکن یہ جرأت کرنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ آخر وہ مولانا امین احسن صاحب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ یہ عبارت مجھ سے قلمزد کروا دی جائے۔ پہلے تو انہوں نے بھی اسے سمجھایا کہ اس میں آپ کا کیا حرج ہے آپ اسے واپس بھیج دیجئے۔ لیکن جب انہوں نے بہت مسکینی اور لجاجت کے ساتھ اپنے لیے اسے خطرے کا موجب بنایا تو مولانا نے مجھ سے کہا کہ اسے قلمزد کر دو۔ خیر میں نے اسے کاٹ کر دستخط کر دیئے اور سٹاف کی جان میں جان آئی۔"

باب ۲۳

سُود

حکومت کو چیلنج

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں سید مودودی صاحب کی نظر بندی میں توسیع کرتے ہوئے حکومتِ مغربی پنجاب نے اخبارات کو ایک بیان دیا جس میں کہا کہ حکومت کے پاس کچھ اطلاعات ہیں جن پر خوب غور کرنے کے بعد اس نے سید مودودی اور ان کے رفقاء کی نظر بندی میں تیسری ششماہی کے لیے توسیع کی ہے۔ حکومت کو کسی فرد یا پارٹی کے سیاسی و تمدّنی نظریات اور پروگرام سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مگر وہ ایسی صورتوں میں سیفٹی ایکٹ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

الف: جب کہ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی کی جائے۔

ب: جب کہ تحفظ و استحکام کے اس اہم ترین بنیادی مقصد کے ساتھ اہلِ ملک کی وفاداری کو متزلزل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ج: جب کہ بیرونی اغراض کے آلۂ کار لوگ جاسوسی کریں یا داخلی خلفشار پیدا کریں۔

سید مودودی صاحب نے نیو سنٹرل جیل ملتان سے ۲۴ اکتوبر کو چیف سیکرٹری حکومت مغربی پنجاب لاہور کو ایک مفصل اور دبنگ خط لکھا:

"۳۰ ستمبر ۴۹ء کے اخبارات میں وہ پریس نوٹ میری نگاہ سے گزرا جو میری اور میرے رفقاء کی میعادِ نظر بندی کی تیسری ششماہی تک توسیع کرنے کے حق میں آپ کی حکومت نے شائع فرمایا ہے۔ اگر یہ توسیع بھی اسی طرح خاموشی کے ساتھ ہو گئی ہوتی، جس طرح ہماری نظر بندی کی ابتداء اور اس کی پہلی توسیع ہوئی تھی تو ہم اسی طرح صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے، جس طرح پہلے کرتے رہے ہیں۔ لیکن حکومت کا یہ بیان ہمارے لیے تکلیف پر توہین کا اضافہ ہے اور اس میں ایک صریح ناروا زیادتی کو حق بجانب ثابت کرنے کی ایسی کوشش کی گئی ہے، جسے چیلنج کیے بغیر گزر جانے نہیں دیا جاسکتا۔

الزام دہی کا یہ طریقہ بڑا ہی نازیبا ہے۔ ممکن ہے حکومتیں اخلاق کے معمولی تقاضوں سے بالاتر ہوا کرتی ہوں، لیکن ہم عامی انسان تو اپنے آپ کو اس طرزِ عمل سے کسی طرح مانوس نہیں کر سکتے کہ چند آدمیوں کو پکڑ کر آپ سال بھر تک بلا مقدمہ چلائے بند رکھیں اور پھر مزید کئی مہینہ تک انہیں بند رکھنے کو جائز ثابت کرنے کے لیے ان پر پبلک میں اس طرح کے مبہم اور گھناؤنے الزامات لگائیں، جب کہ وہ ان الزامات کی تردید پبلک میں کر سکتے ہوں نہ عدالت میں۔

میں آپ کی حکومت کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی اطلاعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہو کہ میں نے یا میرے رفقاء نے مذکورہ بالا افعال میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی اطلاعات کو چھپا کر نہ رکھے۔ بلکہ انہیں یا تو شائع کرے اور مجھے پبلک میں جواب دہی کا موقع دے یا پھر بالفاظِ قائدِ اعظم مرحوم مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقہ پر مقدمہ چلائے، جس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔

الزام الف کے متعلق میں پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے اور میرے رفقاء نے اس کے سوا کوئی قصور نہیں کیا کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس ریاست کو فی الواقع ایک

اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا تھا اور جب اربابِ اقتدار کو اس معاملہ میں تساہل کرتے دیکھا تو بالکل جائز، آئینی اور جمہوری ذرائع سے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس ضمن میں اس کے سوا حکومت کوئی اور "اطلاعات" رکھتی ہے تو وہ انہیں ضرور پبلک میں یا عدالت میں سامنے لائے۔

الزام ج اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے دلی نفرت محسوس کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ حکومت نے اپنے پریس نوٹ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے، اس لیے میں صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ جو شخص ان جرائم کا مرتکب ہو وہ یقیناً واجب القتل ہے۔ نہ صرف از روئے قانونِ ملکی بلکہ از روئے شریعت اسلامی بھی۔

حکومت جس چیز کا بھی ہم سے انتقام لینا چاہے لے، اور جب تک چاہے لیتی رہے، انشاء اللہ وہ ہم کو بالکل صابر پائے گی۔ لیکن اگر وہ چاہتی ہے کہ اس کی یہ کارروائی اخلاقی حیثیت سے بھی درست مانی جائے، تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ غیر اخلاقی طریقِ کار چھوڑ کر ایسے سیدھے اور معقول طریقے اختیار کیے جائیں جو اخلاقی مسلمات کے مطابق ہوں، خواہ ان سے انتقام کے مقاصد پورے ہو سکیں، یا نہ ہو سکیں۔ انسانی عقل اصولی طور پر اس حقیقت کو جانتی ہے اور اس کے وجدانی علم کو کسی طرح محو نہیں کیا جا سکتا کہ جو روشنی میں آنے سے گھبراتا ہو اور تاریکی ہی میں کام کرنے پر اصرار کرے، وہ ضرور اپنے دامنِ کردار پر کوئی داغ رکھتا ہے جس کے ظاہر ہو جانے کا اسے خوف ہے۔"

سیّد مودودی صاحب کی اس صاف گوئی کا حکومت کے پاس کیا جواب تھا؟ —— مزید توسیع!

جیل کے لیل و نہار

جماعت اسلامی نے سیّد صاحب کی رہائی کے لیے قانونی چارہ جوئی کی کوشش کی تو سیّد صاحب نے ۲۳ نومبر ۴۹ء کو اپنے بڑے بھائی سیّد ابوالخیر مودودی صاحب کو ایک مکتوب لکھا جس میں لکھا کہ آپ لوگ کیوں میری رہائی کے لیے کوشاں ہیں۔ "میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے

بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں جنہوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میدان کے مقابلہ سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے۔ اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرمانروائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار، جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے اور جن کے لیے حقیقت وصداقت کا روشنی میں آجانا خطرے کا حکم رکھتا ہے، اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے سیفٹی قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولہے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے، قانونِ فطرت کے خلاف ہے، اور ہزارہا برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے، تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں، بہر حال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔"

اس سے قریباً ایک ماہ بعد ۳۰ دسمبر ۴۹ء کو سیّد صاحب نے اپنے بیٹے احمد فاروق صاحب کو خط لکھا جس میں اس صاحبِ عزیمت نے لکھا:

"اپنی والدہ سے کہہ دینا کہ مجھے نہ تو یہ اندازہ ہے کہ میرے مالی حالات آج کل کیا ہیں، نہ میں یہ جانتا ہوں کہ آج کل لاہور میں گرانی ہے یا ارزانی، اور فی کس خرچ کا کیا اوسط پڑتا ہے۔ نہ مجھے اس بات کا کوئی اندازہ ہے کہ گھر میں معمولی اخراجات کے علاوہ بیماریوں اور دوسرے اسباب کی وجہ سے غیر معمولی اخراجات کیا آن پڑتے ہوں گے۔ ان حالات میں میں کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ تم لوگ اچھی طرح گزر کر رہے ہو یا بُری طرح۔ اور اگر بالفرض مجھے اس معاملہ میں کوئی اچھا یا بُرا اندازہ ہو بھی، تو اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے تم لوگوں کو خدا کے حوالے کر کے صبر کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کو بالکل اسی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے جس طرح میرے مر جانے کی صورت میں کرتے۔ یہ بھی خدا کی شانِ پروردگاری ہے کہ اس نے میری زندگی میں تم لوگوں کو ان حالات کے تجربے کا موقع دے دیا جو دوسروں کو اپنے سرپرست کی موت ہی کی شکل میں پیش آیا کرتے ہیں۔"

سیّد مودودی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو عام قیدیوں سے الگ رکھا جاتا تھا اور نیو

سنٹرل جیل ملتان کا سیاسی وارڈ تو دوسرے وارڈوں سے بالکل ہی الگ تھلگ ہے۔ اس لیے انہیں عام قیدیوں سے میل جول کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے حضرت مجدّد الفِ ثانی کی روایت کو زندہ کیا۔ ان کے باورچیوں میں سے دو نے جو تھوڑا بہت اُردو لکھ پڑھ سکتے تھے، جماعت کا آسان لٹریچر قریبًا سارا پڑھ لیا اور فرائضِ اسلام کے پہلے سے بھی زیادہ اہتمام سے پابند ہو گئے۔ ان کا حجام تو اس قدر بدلا کہ اس کے فارغ اوقات، قرآن مجید کی تلاوت، اس کے معنی سیکھنے اور دین کو جاننے کی کوشش میں صرف ہونے لگے۔ جیل کے سٹاف میں سے ایک صاحب متاثر ہوتے۔ چنانچہ پہلے تو ان کا اس وارڈ میں داخلہ حکمًا بند کر دیا گیا، پھر انہیں ملتان سے بدل دیا گیا۔ ایک بھنگی چند ماہ ان کے ساتھ رہنے سے اسلام لے آیا۔ انگریز کے بنے ہوئے قانون کہ جیل میں کوئی قیدی اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتا، کی وجہ سے وہ چھپ چھپ کر نماز پڑھتا۔ لیکن جیل کے حکام کو اس کا پتہ چل گیا تو انہوں نے اس نومسلم کو جُدا کر دیا۔

قریبًا پونے دو سال کی قید کے دوران ان تینوں قیدیوں کی عام زندگی کا معمول یہ تھا کہ نمازِ فجر کے بعد لمبی سیر کے لیے نکل جاتے۔ میاں صاحب اور اصلاحی صاحب ورزش بھی کرتے، ناشتہ اور غسل کے بعد میاں صاحب سیّد صاحب سے ایک گھنٹہ قرآن پاک پڑھتے، پھر تینوں دوپہر تک اپنے اپنے مطالعے میں مصروف رہتے، ظہر کے بعد اخبارات کا اور عام مطالعہ ہوتا، پھر رات تک ٹہلنا، کھانا، تبادلۂ خیالات اور مسائلِ حاضرہ پر گفتگو ہوتی۔ میاں صاحب نے رہائی سے پہلے سیّد صاحب سے قرآن کا آخری ثُلث پڑھا اور اصلاحی صاحب سے مؤطا امام مالک پڑھی اور زبان عربی سیکھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے فقہ و حدیث اور دساتیرِ عالم پر وسیع مطالعہ کرنے کے علاوہ "پاکستانی عورت دوراہے پر" اور "اسلامی ریاست" نامی کتابیں تصنیف کیں۔ سیّد مودودی صاحب نے وسیع مطالعے کے علاوہ اپنی چند کتب پر نظرِ ثانی کی اور انہیں کتابی صورت میں مرتّب کیا، تفہیم القرآن کا بہت کافی کام مکمل کیا اور سود حصّہ دوم لکھی۔

سُود ـــــــ مولانا مودودی کی شاہکار کتب میں سے ایک ہے۔

سُود کے بارے میں اِسلامی احکام

یہ کتاب سید صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ترجمان القرآن اور اپنی دعوت کے آغاز سے لے کر اب تک مختلف اوقات میں سُود کے موضوع پہ لکھے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے پہلے سید صاحب کی ایک اور کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" پڑھنا مفید ہوگا۔ کیونکہ ابتدا میں جب "سود" نامی کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی تو وہ کتاب اسی کا ابتدائیہ تھی جو سرمایہ داری اشتراکیت اور نازی ازم کے تقابلی مطالعے کے بعد اسلام کے متوازن اور عادل معاشی نظام کے تعارف پہ ایک مختصر لیکن جامع کتاب ہے۔ اور سود تو سید صاحب کی ایسی کتاب ہے جس کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی رہے گی۔ کیونکہ اسلامی معاشیات کے طالب علم کو اپنے تقریباً ہر سوال کا جواب اس میں مل جاتا ہے۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے معاشیات کے نصاب کی مجوزہ کُتب میں ایک عرصہ شامل رہی ہے۔

سید صاحب نے لکھا ہے "عام طور پر سود کے متعلق اِسلامی قانون کے احکام کو سمجھنے میں جو غلطی واقع ہو رہی ہے، اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہو گیا ہے، جس کی بنیاد سرمایہ داری کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت نہ صرف عملاً ہم پر محیط ہے بلکہ ہمارے دل و دماغ پر بھی اس کے اصول و نظریات چھا گئے ہیں" ——— پھر آگے چل کر بتایا ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری اپنے اصول اور نظریہ، مقصد اور رُوح، ہر اعتبار سے مختلف نظمِ معیشت رکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ اِسلامی نظمِ معیشت اور سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت کے اصولی اور روحی فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں اور قرآن و حدیث کے احکام پر غور کر کے ان اصول و قواعد سے باخبر ہو جائیں، جن پر اسلام نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک متوسط

نظامِ معیشت قائم کیا ہے۔ اس تحقیق سے آپ پر خود بخود منکشف ہو جائے گا کہ اسلام جس ڈھنگ پر انسان کے معاشی معاملات کی تنظیم کرتا ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ سُود کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ سرے سے اس نظریہ اور اس ذہنیت اور ان معاشی حالات ہی کا استیصال کر دیتا ہے جن کی وجہ سے سودی معاملات کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں۔"

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے اس قدر سخت الفاظ کے ساتھ سُود کو بند کرنے کا حکم دیا کہ "اللہ سے ڈرو اور جو تمہارا سود لوگوں پر باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔ سورۂ بقرہ۔ ۳۸ ـــــ قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی ہیں۔ لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں سُود کو رد کرنے کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ آپؐ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے، تو معاہدہ کالعدم ہو جائے گا۔ اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔ بنو مغیرہ کے سُود خوار عرب میں مشہور تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ان کی تمام سُودی رقمیں باطل کر دیں اور اپنے عامل کو لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔ خود حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ ایک بڑے مہاجن تھے۔ حجۃ الوداع میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سُود ساقط کیے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا سُود ساقط کرتا ہوں۔ آپؐ نے یہاں تک فرمادیا کہ سُود لینے والے اور دینے والے اور اس کی دستاویز کے کاتب اور اس پر گواہی دینے والے سب پر اللہ کی لعنت!"

اصلاح کی کوشش

سیّد صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ سُود کے بغیر بنکوں کا نظام چلنا غیر ممکن ہے یہ خیال ناقابلِ عمل ہے:

"آپ انسانی سعی کے امکانات کا بہت ہی غلط اندازہ لگائیں گے اگر رائج الوقت نظام کے خلاف کسی تجویز کو بھی ناقابلِ عمل سمجھیں گے۔ جس دنیا میں انفرادی ملکیت کی تنسیخ اور اجتماعی ملکیت کی ترویج جیسی انتہائی انقلاب انگیز تجویز تک عمل میں لا کر دکھا دی گئی ہو۔ وہاں یہ کہنا کس قدر لغو ہے کہ سُود کی تنسیخ اور زکوٰۃ کی تنظیم جیسی معتدل تجویزیں قابلِ عمل نہیں ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ رائج الوقت نظام کو بدل کر کسی دوسرے نقشے پر زندگی کی تعمیر کرنا، ہر عمرو زید کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو پرانے نظام سے منحرف ہو چکے ہوں اور سچّے دل سے اس تجویز پر ایمان رکھتے ہوں جس کے مطابق نظامِ زندگی میں تغیر کرنا پیشِ نظر ہے۔ دوسرے یہ کہ ان میں تقلیدی ذہانت کے بجائے اجتہادی ذہانت پائی جاتی ہو۔ وہ محض اس واجبی سی ذہانت کے مالک نہ ہوں جو پُرانے نظام کو اس کے اماموں کی طرح چلائے جانے کے لیے کافی ہوتی ہے بلکہ اس درجے کی ذہانت رکھتے ہوں جو پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہ بنانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔"

"اسلام سودی کاروبار کی محض اخلاقی مذمت پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ایک طرف وہ اس کو مذہبی حیثیت سے حرام قرار دے کر اس کے خلاف شدید نفرت پیدا کرتا ہے، دوسری طرف جہاں جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار اور حاکمانہ اثر و نفوذ قائم ہو، وہاں وہ ملکی قانون کے ذریعے سے اس کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ تمام سُودی معاہدوں کو کالعدم ٹھہراتا ہے۔ سُود لینے اور دینے اور اس کی دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ بننے کو فوجداری جرم قابلِ دست اندازی پولیس قرار دیتا ہے اور اگر کہیں یہ کاروبار معمولی سزاؤں سے بند نہ ہو تو اس کے مرتکبین کو قتل اور ضبطی جائداد تک کی سزائیں دیتا ہے۔ تیسری طرف وہ زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر اور حکومت کے ذریعے سے اس کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے ایک دوسرے نظام مالیات کی داغ بیل ڈالتا ہے۔"

اب تو ہمارا اجتماعی نظام ہر فرد کو "خوف دلاتا ہے کہ جمع کر، کیونکہ پُورے معاشرے میں کوئی نہیں ہے جو تیرے بُرے وقت پر کام آئے۔ وہ اسے لالچ دیتا ہے کہ جمع کر، کیونکہ اس کا اجر تجھے سُود کی شکل میں ملے گا۔ اس دوہری تحریک کی وجہ سے معاشرے کے وہ تمام

افراد جو قدرِ کفاف سے کچھ بھی زائد آمدنی رکھتے ہیں، خرچ روکنے اور جمع کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منڈیوں میں اموالِ تجارت کی کھپت امکانی حد سے بہت کم ہوتی ہے اور آمدنیاں جتنی کم ہوتی جاتی ہیں، صنعت و تجارت کی ترقی کے امکانات بھی اس کے مطابق کم، اور اجتماعِ سرمایہ کے مواقع کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح چند افراد کے اندوختوں کا بڑھنا اجتماعی معیشت کے گھٹنے کا موجب ہوتا ہے۔ ایک آدمی ایسے طریقہ سے اپنی پس اندازکی ہوئی رقموں میں اضافہ کرتا ہے، جس سے ہزار ہا آدمی سرے سے کچھ کمانے ہی کے قابل نہیں رہتے۔ کجا کہ کچھ پس انداز کر سکیں۔"

"اس کے برعکس جب سود بند کر دیا جائے گا اور زکوٰۃ کی تنظیم کر کے، ریاست کی طرف سے معاشرے کے ہر فرد کو اس امر کا اطمینان بھی دلا دیا جائے گا کہ بُرے وقت پر اس کی دست گیری کا انتظام موجود ہے تو بخل و زراندوزی کے غیر فطری اسباب و محرکات ختم ہو جائیں گے۔ لوگ دل کھول کر خود بھی خرچ کریں گے اور نادار افراد کو بھی زکوٰۃ کے ذریعہ سے اتنی قوتِ خریداری بہم پہنچا دیں گے کہ وہ خرچ کریں۔ اس سے صنعت و تجارت بڑھے گی۔ صنعت و تجارت کے بڑھنے سے روزگار بڑھے گا، روزگار بڑھنے سے آمدنیاں بڑھیں گی۔"

موجودہ نظام میں سرمایہ اکثر اس انتظار میں ٹھہرا رہتا ہے کہ زیادہ شرح سود ملے تو وہ کام میں لگے۔ "لیکن جب سود کا دروازہ از روئے قانون بند ہو جائے گا اور تمام جمع شدہ رقموں پر اُلٹی زکوٰۃ ڈھائی فی صدی سالانہ کے حساب سے لگنی شروع ہو گی تو سرمایہ کی یہ بدمزاجی ختم ہو جائے گی۔ وہ خود اس بات کا خواہش مند ہو گا کہ معقول شرائط پر جلدی سے جلدی کسی کاروبار میں لگ جائے اور ٹھہرنے کے بجائے ہمیشہ کاروبار میں لگا ہی رہے۔"

سُود کے بغیر بنک کاری

مجوزہ نظامِ معیشت میں کاروباری مالیات کیا شکل اختیار کریں گے؟

اس کے جواب میں سید صاحب لکھتے ہیں: "سُود کا انسداد لوگوں کے لیے یہ دروازہ

توقطعی بند کردے گا کہ وہ محنت اور خطرہ (Risk) دونوں چیزوں سے بچ کر اپنے سرمائے کو تحفظ اور متعین منافع کی ضمانت کے ساتھ کسی کام میں لگا سکیں اور اسی طرح زکوٰۃ ان کے لیے اس دروازے کو بھی بند کر دے گی کہ وہ اپنا سرمایہ روک رکھیں۔ اور اس پر مارِ زر بن کر بیٹھ جائیں۔ مزید برآں ایک حقیقی اسلامی حکومت کی موجودگی میں لوگوں کے لیے عیاشیوں اور فضول خرچیوں کا دروازہ بھی کھلا نہ رہے گا کہ ان کی فاضل آمدنیاں ادھر بہہ نکلیں۔ اس کے بعد لامحالہ ان تمام لوگوں کو جو ضرورت سے زائد آمدنی رکھتے ہوں، تین راستوں میں سے کوئی ایک راستہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔

الف: اگر وہ مزید آمدنی کے طالب نہ ہوں تو اپنی بچت کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کریں۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ وہ خود کسی کارِ خیر پر اسے وقف کریں، یا یہ ہو کہ قومی اداروں کو چندے اور عطیے دیں، یا پھر یہ ہو کہ بے غرضانہ و مخلصانہ طریقہ سے اسلامی حکومت کے حوالہ کر دیں، تاکہ وہ اسے امورِ نافعہ اور ترقیاتِ عامہ اور اصلاحِ خلق کے کاموں پر صرف کرے۔ بخصوصیت کے ساتھ آخری صورت کو لازماً ترجیح دی جائے گی، اگر حکومت کا نظم ونسق ایسے کارکنوں کے ہاتھوں میں ہو، جن کی دیانت اور فراست پر عموماً لوگوں کو بھروسہ ہو۔ اس طرح اجتماعی مصالح اور ترقی و بہبود کے کاموں کے لیے حکومت کو اور دوسرے اجتماعی اداروں کو سرمائے کی ایک کثیر مقدار ہمیشہ مفت ملتی رہے گی، جس کا سود یا منافع تو درکنار، اصل ادا کرنے کے لیے بھی عوام الناس پر ٹیکسوں کا کوئی بار نہ پڑے گا۔

ب: اگر وہ مزید آمدنی کے طالب تو نہ ہوں لیکن اپنی زائد از ضرورت دولت کو اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہوں تو اسے بنک میں جمع کرا دیں اور بنک اس کو امانت میں رکھنے کے بجائے اپنے ذمہ قرض قرار دے۔ اس صورت میں بنک اس بات کا ضامن ہوگا کہ ان کی جمع کردہ رقم عند الطلب یا طے شدہ وقت پر انہیں واپس کر دے اور اس کے ساتھ بنک کو یہ حق ہوگا کہ قرض کی اس رقم کو کاروبار میں لگائے اور اس کا منافع حاصل کرے۔ اس منافع میں سے کوئی حصہ اسے کھاتہ داروں کو دینا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ

کلیتہً بنک کا اپنا منافع ہوگا۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی تجارت بڑی حد تک اسی اسلامی اصول کی رہینِ منت تھی۔ ان کی دیانت اور غیر معمولی ساکھ کی وجہ سے لوگ اپنا روپیہ ان کے پاس حفاظت کے لیے رکھواتے تھے۔ امام صاحب اس روپے کو امانت میں رکھنے کے بجائے قرض کے طور پر لیتے اور اسے اپنے تجارتی کاروبار میں استعمال کرتے تھے۔ ان کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ ان کی وفات کے وقت جب حساب کیا گیا تو ان کی فرم میں پانچ کروڑ درہم کا سرمایہ اسی قاعدے کے مطابق لوگوں کی رکھوائی ہوئی رقوم کا لگا ہوا تھا۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے پاس امانت رکھوائے تو امین اسے استعمال نہیں کر سکتا، مگر امانت ضائع ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان عائد نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر وہی مال قرض کے طور پر دیا جائے تو مدیون اسے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے اور وقت پر قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ اسی قاعدے پر اب بھی بنک عمل کر سکتے ہیں۔

ج: اور اگر وہ اپنی پس انداز کردہ رقموں کو کسی نفع آور کام میں لگانے کے خواہش مند ہوں تو ان کے لیے اس چیز کے حصول کا صرف ایک راستہ کھلا ہوگا۔ یہ کہ اپنی بچائی ہوئی رقموں کو مضاربت (یعنی نفع اور نقصان میں متناسب شرکت) کے اصول پر نفع بخش کاموں میں لگائیں۔ خواہ حکومت کے توسط سے یا بنکوں کے توسط سے"۔ ——— یہاں سید مودودی صاحب نے اسلامی بنک کاری کی صورت پیش کی ہے۔

"دراصل بنکنگ بھی موجودہ تہذیب کی پرورش کی ہوئی بہت سی چیزوں کی طرح ایک ایسی اہم مفید چیز ہے جس کو صرف ایک شیطانی عنصر (سود) کی شمولیت نے گندہ کر رکھا ہے ——— جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انسدادِ سود کے بعد بنکوں میں سرمایہ اکٹھا ہونا ہی بند ہو جائے گا، وہ غلطی پر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب سُود ملنے کی توقع ہی نہ ہوگی تو لوگ کیوں اپنی فاضل آمدنیاں بنک میں رکھوائیں گے۔ حالانکہ اس وقت سود کی نہ سہی، نفع ملنے کی توقع تو ضرور ہوگی اور چونکہ نفع کا امکان غیر متعین اور غیر محدود ہوگا، اس لیے عام شرح سُود کی

بہ نسبت کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اسی قدر اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا۔ اس کے ساتھ بینک وہ تمام خدمات بدستور انجام دیتے رہیں گے، جن کی خاطر اب لوگ بینکوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل ایک یقینی بات ہے کہ جس مقدار میں اب سرمایہ بنکوں کے پاس آتا ہے، اسی مقدار میں انسدادِ سود کے بعد بھی آتا رہے گا۔

وہ سرمایہ، جس کے مالک اپنے مال کو بینکوں کے توسط سے کاروبار میں لگانا چاہتے ہوں، ان کے مال کو امانت میں رکھنے کے بجائے ہر بینک کو ان کے ساتھ ایک شراکت نامہ عام طے کرنا ہوگا۔ پھر بینک اس سرمایہ کو اپنے دوسرے سرمایوں سمیت مضاربت کے اصول پر تجارتی کاروبار میں، صنعتی سکیموں میں، زراعتی کاموں میں اور پبلک اداروں اور حکومتوں کے نفع آور کاموں میں لگا سکیں گے اور اس سے بحیثیت مجموعی دو عظیم الشان فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ساہوکار کا مفاد کاروبار کے مفاد کے ساتھ متحد ہو جائے گا، اس لیے کاروبار کی ضرورت کے مطابق سرمایہ اس کی پشتیبانی کرتا رہے گا۔ اور وہ اسباب قریب قریب ختم ہو جائیں گے، جن کی بنا پر موجودہ سُود خوار دنیا میں کساد بازاری کے دَورے پڑا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساہوکار کی مالیاتی بصیرت اور کاروباری لوگوں کی تجارتی و صنعتی بصیرت جو آج باہم نبرد آزمائی کرتی رہتی ہیں، اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ دستیاری اور تعاون کریں گی اور یہ سب ہی کے لیے مفید ہوگا۔

پھر جو منافع ان ذرائع سے بینکوں کو حاصل ہوں گے ان کو وہ اپنے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد، ایک مقرر تناسب کے مطابق، اپنے حصّہ داروں اور کھاتا داروں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس معاملہ میں فرق صرف یہ ہوگا کہ بحالتِ موجودہ منافع (Dividends) حصّہ داروں میں تقسیم ہوتے ہیں اور کھاتہ داروں کو سُود دے دیا جاتا ہے۔ اس وقت دونوں میں منافع ہی تقسیم ہوں گے۔ اب کھاتہ داروں کو ایک متعین شرح کے مطابق سود مِلا کرتا ہے اس وقت شرح کا تعین نہ ہوگا بلکہ جتنے بھی منافع ہوں گے، خواہ کم ہوں یا زیادہ، وہ سب ایک تناسب کے ساتھ تقسیم ہو جائیں گے۔ نقصان اور دیوالہ کا جتنا خطرہ اب ہے، اتنا ہی اس وقت بھی ہوگا۔ اب خطرہ اور اس کے بالمقابل غیر محدود نفع کا امکان دونوں، صرف بینک

کے حصّہ داروں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں کھاتہ داروں اور حصّہ داروں میں مشترک ہو جائیں گی۔

غیر سودی مالیات کا یہ مجمل نقشہ جو ہم نے پیش کیا ہے، کیا اسے دیکھنے کے بعد بھی اس شبہ کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سود کا انسداد قابلِ عمل نہیں ہے؟ ——— اگر آپ اس امر پر مطمئن ہو چکے ہوں کہ موجودہ نظام واقعی غلط ہے اور اصلاح کی تجویز بالکل معقول ہے، تو عمل کی طرف قدم اٹھائیے اور زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیجیے جو ایمان اور اجتہادی ذہانت رکھتے ہوں۔ پھر جو عملی مسئلہ جہاں پیدا ہوگا، اسی جگہ وہ حل ہو جائے گا۔ زمین پر کرنے کا کام آخر کاغذ پر کر کے کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟"

رہائی

لیگی حکومت نے کرسیٔ اقتدار سے چمٹے رہنے اور اپنے مخالفوں کو کچلنے کے لیے سیفٹی ایکٹ جیسے کالے قانون بنائے تھے۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ پاس کرتے ہوئے مسلم لیگی زعماء نے کہا تھا کہ حکومت جس شخص کو مفادِ عامہ کے لیے نقصان دہ سمجھتی ہو اسے چھ ماہ کے لیے جیل میں ڈال سکتی ہے، اگر چاہے تو میعادِ نظر بندی میں چھ ماہ کا اضافہ کر سکتی ہے اور اگر پھر چاہے تو پھر چھ ماہ کا اضافہ کر سکتی ہے۔ منشا تو یہ تھا کہ اس طرح، یعنی علیٰ ہذا القیاس جب تک جی چاہے گا، چھ چھ ماہ کی توسیع قیامت تک کرتی چلی جائے گی۔ اور یہی جماعتِ اسلامی کے ان معزز قیدیوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اب تیسری مرتبہ توسیع ہو چکی تھی اور وہ ڈیڑھ سال سے بھی دو ماہ زیادہ کی قید بھگت چکے تھے کہ لاہور ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلہ میں لکھا کہ اس قانون کے الفاظ صرف دو دفعہ توسیع پر دلالت کرتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے کسی قیدی کو اٹھارہ ماہ سے زیادہ نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کے دلائل ایسے وزنی تھے کہ اس فیصلے کو فیڈرل کورٹ میں بھی چیلنج کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان تینوں معزز قیدیوں کو اُمید ہو گئی کہ وہ اب رہا ہو جائیں گے۔ لیکن مسلم لیگی حکومت کے بارے میں یہ کسی خوش فہمی میں نہیں تھے، کیونکہ

ابھی پچھلے دنوں صوبہ سرحد کے ایک لیڈر خان غلام محمد لونڈ خور کو حکومت نے ایک قانون کے تحت رہا کیا اور وہ ابھی جیل کے دروازے پر ہی تھے کہ دوسرے قانون کے تحت گرفتار کر لیا۔

میاں صاحب کی زبانی "۲۸ مئی ۵۰ء کو صبح ۹ بجے کے قریب ہم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ جیل سپرنٹنڈنٹ صاحب خود تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ رہائی کے احکام آگئے ہیں۔ آپ حضرات اپنا سامان تیار کر لیں۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ہم دفتر میں پہنچ گئے اور وہاں تقریباً ایک گھنٹہ لکھا پڑھی میں صرف ہوا اور پونے بارہ بجے کے قریب ہم جیل سے باہر آگئے۔ ملتان کی جماعت کے بعض رفقا گیٹ کے باہر موجود تھے۔ ان سے مصافحوں اور معانقوں کے بعد تانگوں میں سوار ہو کر ملتان کی جماعت کے دفتر میں پہنچے اور وہاں جماعت اسلامی ملتان کے دوسرے ارکان اور کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ رات کوئٹہ پسنجر ٹرین میں سوار ہو کر اگلے روز صبح لاہور پہنچے۔"

باب ۲۴

اجتماع علمائے امت

بنیادی اصولوں کی رپورٹ

سید مودودی صاحب کی نظر بندی کے دوران عبدالجبار غازی صاحب جماعت اسلامی کے امیر تھے۔ مئی ۵۰ء میں انہوں نے بیماری کی وجہ سے امارت سے استعفیٰ دیا اور عارضی طور پر مولانا مسعود عالم ندوی صاحب امیر جماعت مقرر ہوئے انہی دنوں سید مودودی صاحب اور دونوں صاحبان رہا ہو کر آئے۔ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا اجلاس ۱۰ر جون ۵۰ء کو لاہور میں شروع ہوا۔ جو پانچ روز تک جاری رہا۔ اس میں امیر جماعت مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے سید مودودی صاحب۔ مولانا اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کو بطور خاص شرکت کے لیے دعوت دی۔ شوریٰ نے پھر سید مودودی صاحب کو امیر جماعت منتخب کر لیا۔ ملکی حالات کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لیے طریق کار طے کیا۔

مجلس شوریٰ نے مسلم لیگی حکومت کے کارناموں پہ ایک قرارداد کے ذریعے روشنی ڈالی "یہ ان سب پر مزید غیر جمہوری، غیر اخلاقی اور غیر آئینی تدبیریں ہیں، جو سیاسی طاقت پر

برسرِ اقتدار طبقہ کا اجارہ قائم رکھنے کے لیے اختیار کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف حکومت نے فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز اور پھر صوبوں اور مرکز میں سیفٹی ایکٹ جیسے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کر رکھا ہے، تاکہ جو شخص یا اخبار یا جماعت بھی اس کے جابرانہ استبداد کو چیلنج کرے اس کی سرکوبی کر دی جائے۔ دوسری طرف ملک میں آزاد صحافت کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح کی شرمناک ریشہ دوانیاں کی جا رہی ہیں اور خبر رسانی کے ذرائع پر سرکاری تسلط قائم کیا جا رہا ہے، تاکہ ٹھیک ٹھیک فسطائی طرز پر پبلک کے ذہن کو حکومت کے قبضہ میں لے لیا جائے۔ اس طرح سے ایسے حالات مہیا کیے جا رہے ہیں، جن میں پُرامن جمہوری نظام اور آئینی طریقوں سے حکومت کو تبدیل کرنا قطعی ناممکن ہو جائے گا۔ تغیر کے لیے صرف انقلابی طریقے ممکن العمل رہ جائیں گے، جن کا استعمال مشکل ہی سے کسی ملک کے لیے سببِ خیر ہو سکتا ہے۔"

۲۴ جولائی ۵۰ء کو مولانا اصلاحی صاحب نے لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے کو خطاب کیا۔ یہ تقریر "ہمیں کس مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا ہے" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے لیگی حکومت کی کارستانیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ برسرِ اقتدار گروہ کس طرح دستور سازی کے کام کو ٹالتا جا رہا ہے اور ملک میں استبدادی قوانین نافذ کر رہا ہے۔ سیّد مودودی صاحب نے ملک گیر دورے کا آغاز کیا اور ملک کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک عظیم الشان عوامی اجتماعات، طلبہ، وکیلوں اور معزز شہریوں کے خصوصی اجتماعات اور صحافیوں اور دانشوروں سے ملاقاتوں میں بتایا کہ ملک کیسے حالات سے دوچار ہے۔ حکمران طبقہ کس طرح قومی خزانے کو اپنی عیاشیوں پر صرف کر رہا ہے اور پھر بتایا کہ جماعت اسلامی پنجاب کے آنے والے انتخابات میں حصہ لے کر اپنی حد تک تبدیلی قیادت و حکومت کی کوشش کرے گی۔ اور ان تقریروں میں اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ ملک کے دستور کی تیاری میں تاخیر ہو رہی ہے۔

اور بات تشویش کی تھی بھی۔ کیونکہ لیگی قیادت نے قراردادِ مقاصد کو طوعاً و کرہاً منظور تو کر لیا تھا، لیکن اب لیگی اُٹھتے بیٹھتے اس قراردادِ مقاصد کی من مانی تشریحات فرمایا کرتے

تھے۔ کبھی کہتے کشمیر خطرے میں ہے، ہماری توجہ ادھر ہے، اس لیے دستور نہیں بن سکتا، کبھی کہا جاتا کہ پاکستان خطرے میں ہے، یہ دستور سازی کی بجائے جہاد کا وقت ہے۔ پھر ایک نواب زادہ کہہ دیتا کہ پاکستان میں مُلّاؤں کی حکومت نہیں ہوگی، مسلم عوام جیسی بھی حکومت بنا لیں وہ اسلامی ہوگی۔ پھر کوئی جاگیردار مسلم لیگی عہدے دار اوپر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیان داغ دیتا کہ دورِ جدید میں کسی ترقی پذیر ریاست کے لیے اسلام کے اصولِ سیاست کارآمد نہیں ہو سکتے۔ کبھی مذہبی جھگڑوں اور فقہی اختلافات کا سہارا لے کر اسلامی دستور چاہنے والوں کو کہا جاتا کہ تم یہاں کس کی فقہ کے مطابق حکومت چلانا چاہتے ہو؟

لیونارڈ بائینڈر نے لکھا ہے "اگرچہ مذہب وسیاست کی علیٰحدگی اور لادینی دستور کا خیال پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز بہت سے لوگوں کے دلوں میں اور ذہنوں پر اس عرصہ میں موجود رہا، لیکن قائداعظم کی دستور ساز اسمبلی میں پہلی تقریر کے علاوہ، دین وسیاست کو علیٰحدہ کرنے کی تجویز سامنے نہ لائی جا سکی۔ اب لادینی طرزِ فکر کے حامل طبقے نے اسلام کو دستور و قانون کے اعلیٰ مقام سے خالی خولی باتوں اور ذکر اذکار وغیرہ کی نچلی سطح پر لے آنا اپنا مطمحِ نظر بنا لیا۔ اس طریقِ عمل کا نمونہ انتھک وزیراعظم لیاقت علی خاں خود موجود تھے، چنانچہ انہوں نے اسلامی ریاست کی یوں تشریح شروع کر دی کہ جہاں اندرونی سازشیں نہ ہوں، پھر انہوں نے کہا کہ پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ ملّاؤں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔"

اور جب عوامی دباؤ اور اصرار سے مجبور ہو کر مسلم لیگی حکومت نے ستمبر ۵۰ء میں بنیادی اصولوں کی رپورٹ پیش کی، جو دستور ساز اسمبلی کے پچیس ارکان پر مشتمل کمیٹی نے اپنی ذیلی کمیٹیوں کی رپورٹوں سے، پاکستان کے آئندہ دستور کے لیے ایک خاکے کے طور پر مرتب کی تھی، تو وہ رپورٹ یا سفارشات، اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے اتنی مایوس کن تھیں کہ عوام نے انہیں اُٹھا کر حکومت کے منہ پر دے مارا۔ منظم رائے عامہ نے حکومت کو یہ سفارشات واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

دستوری سفارشات پر تنقید

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے وسط اپریل ۴۹ء میں جب ذیلی کمیٹیاں بنائیں تو قرار دادِ مقاصد سے پیدا ہونے والے مسائل پر تجاویز اور مشورے دینے کے لیے بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اس کام کے لیے اپنے ممبروں میں سے ایک ذیلی کمیٹی بنانے کے بجائے تعلیمات اسلامیہ کے ماہرین مشہور علماء کا بورڈ تشکیل دیا جائے۔ اس بورڈ میں مفتی محمد شفیع صاحب، ڈھاکہ کے پروفیسر عبدالخالق، مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو لیا گیا۔ مؤخر الذکر بین الاقوامی اسلامی قانون پر "مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ" نامی تحقیقی مقالہ لکھنے کی وجہ سے ایک معروف مسلم محقق ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کو اس بورڈ کا سیکرٹری بنایا گیا۔ اس بورڈ کی صدارت کے لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ہندوستان سے بلانے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ اواخر ۵۰ء تک پاکستان نہ آسکے۔

بائنڈر نے لکھا ہے کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات میں "ایک شرط یہ لگائی گئی تھی کہ سربراہِ مملکت مسلمان ہو۔ یہ بات زمانۂ وسطیٰ کے مسلمان مفتیوں کی تحریروں میں نہیں ملتی (اس خیال سے کہ قدیم علماء نے اس شرط کا کہیں ذکر نہیں کیا، سب کمیٹی نے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کو چیلنج کیا کہ آپ کے پاس اس شرط کا کیا ثبوت ہے، تو وہ قرآن پاک کی ایک غیر واضح آیت کی طرف اشارہ کر سکے)۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات اسلام کے ابتدائی نظریہ سے مختلف نہیں۔ دراصل پہلے مصنفین نے اسے واضح سمجھا، موجودہ علماء نے اسے الفاظ سے ادا کر دیا۔ سربراہِ مملکت کے مسلمان ہونے کی شرط کو واضح کرنے کی ضرورت اس ماحول میں پیش آئی، جہاں مغربی تصوراتِ مساوات اور مذہب و سیاست کی علیحدگی کا نظریہ پایا جاتا ہے اور اس اہلیت کا مطلوب ہونا اس خواہش کا اظہار تھا کہ وہ لوگ اسے ایک نظریاتی مملکت بنانا چاہتے تھے اور پرانی خلافت راشدہ کا احیا چاہتے تھے۔

علماء کے خیالات کا اندازہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی آراء سے ہو سکتا ہے حقیقت میں یہ ان کی دوسری پوزیشن تھی کیونکہ ان کا اصل مطالبہ اعلیٰ اختیارات کی حامل امورِ دینیات کی

وزارت تھا، اب وہ پوری حکومتِ پاکستان کو اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ اس موجودہ پوزیشن کا، احیاء شدہ قدیم نظریۂ خلافت سے تعلق دیکھ کر ہم اسے روحانیت پسند قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن شریعت کے اتنے زیادہ اصولوں کی تاکید اور اصرار۔ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہاں مولانا مودودی کا بیرونی غالب اثر کتنا زیادہ ہے۔

دستور سازی کی سب کمیٹی کے ممبروں کی کثیر تعداد ایسے افراد پر مشتمل تھی، جن کے رجحانات کے بارے میں پہلے سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بورڈ کے خیالات کو مشکل سے ہی قبول کریں گے۔ جب بورڈ نے اپنی دشواریوں (سید سلیمان ندویؒ کی عدم موجودگی، حوالے کی ضروری کتابوں کی کمی اور ریسرچ معاونین کی کمی۔) اور شکوک (کہ اسے بورڈ کی سفارشات سمجھنے کی بجائے انفرادی آراء اور خیالات سمجھا جائے) کی فہرست بنا کر خود ہی پیش کر دی، تو اس کمیٹی کی مخالفت مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ سب کمیٹی نے ان کی تمام تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے بڑی کمیٹی کو ان کی سفارشات پہنچا دیں۔ لیکن خود بورڈ کے خیالات کا صرف چار جگہ ذکر کیا اور کسی جگہ بھی انہوں نے بورڈ کی کسی تجویز کو شرفِ قبولیت نہ بخشا۔"

دستورِ پاکستان کے لیے پوری عبوری رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی تھیں ان کو ریاضی کی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ تین چیزوں کا مجموعہ تھا "قرارداد مقاصد + گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ + مشورہ: تمام مسلمانوں کو قرآن پاک پڑھنا چاہیئے۔"

بنیادی اصولوں کی رپورٹ نے حکمران طبقے کی نیتوں کو آشکارہ کر دیا۔ اسلام پسند طبقے، تنظیموں اور علماء نے جلد ہی ان کا نوٹس لیا، یہ رپورٹ جمہوری نقطۂ نظر سے بھی مایوس کن تھی۔ چنانچہ بہت سے سیاست دان بھی اس کے خلاف بیانات دینے لگے۔ اس رپورٹ کی تاخیر پر حکومت لوگوں کو بتایا کرتی تھی کہ تاخیر اس لیے ہو رہی ہے کہ ہر نکتہ علماء سے چیک کروانا پڑتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ہر نکتہ چیک کروانا تو ایک طرف رہا انہوں نے اپنے ہی تشکیل کردہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کو اُٹھا کر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ جب عبوری رپورٹ آئی تو بورڈ کے ارکان عجیب مخمصے میں پھنس گئے، وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کے لیے چاہتے تھے کہ ان کی سفارشات شائع کر دی جائیں،

لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ کیونکہ قانونِ اسمبلی کی رُو سے کمیٹیوں کی کارروائیاں خفیہ ہوتی ہیں، اس لیے انہیں شائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تعلیمات اِسلامیہ بورڈ کے رہے سہے وقار کو لیاقت علی خاں نے ۱۲ نومبر ۵۰ء والی تقریر میں سخت مجروح کیا اور عوام اور علماء سے اپیل کی کہ وہ اِسلامی دفعات کے لیے ٹھوس اور واضح سفارشات سامنے لائیں۔ ایک طرف بورڈ کی واضح سفارشات کو مسلسل نظرانداز کرنا، پھر بورڈ سے بالا ہی بالا پبلک سے ایسی اپیل کرنا، بالواسطہ بورڈ کی اہانت تھی۔ اگلے ہی روز ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بورڈ کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔

لیونارڈ بائنڈر رقم طراز ہے "عبوری رپورٹ کے پیش کرنے، اور اس پہ غور کو ملتوی کرنے کے درمیان دو ماہ گزر رہے۔ اس عرصے میں علماء کو آہستہ آہستہ اُبھارا گیا کہ رپورٹ اسلامی نہیں، لہذا اس کی مخالفت کی جانا چاہیئے۔ جن لوگوں نے علماء کو اس مخالفت پہ اُبھارا ان میں نمبر ایک سیاست دان تھے، دوسرے نمبر پہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ تھا، اور تیسری جماعت اِسلامی تھی۔ اس نے اپنی تنظیم کی مجتمع کوششوں کو عبوری رپورٹ کیخلاف مہم میں مرکوز کر دیا۔ اس کے ماہناموں نے عبوری رپورٹ کے خلاف لکھا۔ خصوصی کتابیں شائع کی گئیں، جن میں ایک اہم تالیف وہ تھی جس میں تمام مخالف آراء اور اداریوں کو جمع کرنے کے بعد رپورٹ کی ہر دفعہ اور شق پہ تنقید کی گئی تھی اور پھر ترامیم بھی تجویز کی گئی تھیں[1]۔"

صرف یہی نہیں عملی میدان میں بھی جماعت کافی سرگرم تھی۔ ۱۴ اکتوبر ۵۰ء کو سید مودودی صاحب نے موچی دروازہ لاہور کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں ان سفارشات پر بھرپور تنقید کی اور ان چور دروازوں کی نشان دہی کی جن کے ذریعہ حکومت رائے عامہ کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ اگرچہ حکومت نے ان سفارشات کو مقبول بنانے کے لیے اپنی تمام توتیں صرف کر دیں۔ لیکن سید صاحب کی تقریر، مخالفانہ لٹریچر کی توسیع اور

---

1. Ibid; P. 210.

علماء و عوام کی ناراضگی نے حکومت کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

انتخابات میں نیا تصوّر

جماعت اسلامی اس وقت ایک اور میدان میں سرگرم عمل تھی اور وہ پنجاب کے صوبائی انتخابات کا میدان تھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پنجاب میں نواب افتخار حسین ممدوٹ کی وزارت کو توڑ کر یہاں دفعہ ۹۲۔ الف لگادی تھی، یعنی گورنری راج قائم کر دیا تھا۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ مسلم لیگ کے جلسوں میں عوام کو خطاب کرتے تھے۔ ممدوٹ صاحب نے حسین شہید سہروردی کے ساتھ مل کر جناح مسلم لیگ اور عوامی لیگ کا مرکب جناح عوامی مسلم لیگ تیار کیا تھا تاکہ وہ دولتانہ کو چت کر سکیں۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی صاحب نے خاکسار تحریک کو اسلام لیگ کا نام دیا تھا کہ شاید لیگ کے نام سے کچھ بات بن سکے۔ مجلس احرار اور سابقہ جمعیت علمائے ہند نے اپنی پرانی غلطیوں کی تلافی کرنے کے لیے اپنی پوری وفاداریاں، غیر مشروط طور پر مسلم لیگ کو دے دیں کہ اس طرح یہ مسلم لیگ اور حکمران پارٹی کے منظورِ نظر بن جائیں۔ کمیونسٹ گروپ نے مسلم لیگ کو خیر باد کہہ کر "آزاد پاکستان پارٹی" کا بپتسمہ لے لیا تھا۔ جماعت اسلامی بھی اپنی قلیل قوت اور قدیم و جدید کے امتزاج سے میدانِ سیاست اور انتخابات میں پہلی دفعہ اُتری۔ مسلم لیگ کے علاوہ سبھی پارٹیوں کو انتخابات کے نتائج سے کم و بیش مایوسی ہوئی اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھی۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اقتدار کی، پولیس کی اور پٹواریوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ سول سروس نے اطاعت کا پورا ثبوت دیا اور پنجاب مسلم لیگ نے دھن، دھوکہ، دھمکی، دھونس اور دھاندلی کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ پھر ہر صوبائی الیکشن میں مسلم لیگ نے ان "زریں" اصولوں کو مضبوطی سے تھاما اور شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوتی رہی۔

۱۸، ۱۹ ستمبر ۵۰ء کو اوکاڑہ میں جماعت اسلامی پاکستان کے الیکشن بورڈ کے سولہ ممبران نے پنجاب کے انتخابات کے لیے پالیسی اور طریقۂ کار طے کیا۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے سیّد مودودی صاحب نے "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد، اس کے مقاصد اور طریق کار"

نامی پمفلٹ لکھا۔ آپ نے لکھا "جماعتِ اسلامی نے پنجاب کے آئندہ انتخابات میں حصّہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے، اس میں تین متعین مقصد جماعت کے پیشِ نظر ہیں۔

اوّل یہ کہ انتخابات کے غلط طریقوں کی اصلاح کی جائے اور ان صحیح طریقوں کا عملاً مظاہرہ کیا جائے جو اسلام کے احکام اور اس کی اخلاقی رُوح کے مطابق ہیں۔

دوّم یہ کہ بحالت موجودہ ہماری سوسائٹی میں سیرت اور قابلیت کے لحاظ سے جو زیادہ سے زیادہ صالح اور اہل افراد مِل سکتے ہوں، ان کو صوبے کا آئندہ نظم و نسق چلانے کے لیے منتخب کرایا جائے۔

سوّم یہ کہ ۱۹۳۵ء کے غیر جمہوری دستور میں صوبوں کی حکومتوں کو جو محدود اختیارات حاصل ہیں، ان کو استعمال کر کے کم از کم اس صوبے میں نظامِ اسلامی کی تعمیر، اجتماعی انصاف کے قیام اور نظم و نسق کی اصلاح کے ایک پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا جائے۔"

انتخاب کے غلط طریقوں کی اصلاح کے لیے جماعتِ اسلامی نے جو نئی چیز پیش کی جسے سیّد مودودی کی ذہنی اُپج کہنا چاہیئے، وہ یہ خیال تھا کہ جو شخص کسی عہدے یا منصب کے لیے کھڑا ہو اور خود امیدوار ہو وہ بے لوث نہیں ہو سکتا۔ سیّد صاحب نے لکھا:

"انتخاب کے جو طریقے ہم نے اپنے سابق مغربی آقاؤں اور استادوں سے سیکھے ہیں، ان میں فتنے کی جڑ امیدواری ہے۔ امیدواری اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے حکومت کی ہوس، طاقت کی حرص اور اقتدار کے لالچ کا دوسرا نام ہے۔ یہ چیز بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص یا گروہ امیدوار بن کر اُٹھ رہا ہے، وہ حکومت کی بھاری ذمّے داریوں کے بجائے اس کے فوائد و منافع پر نظر رکھتا ہے۔"

سیّد صاحب نے اپنے مؤقف کے لیے قرآن و حدیث سے استشہاد کیا اور مضبوط دلائل دیئے۔ ہمارے عوام تو خیر کالانعام ہیں، علمائے کرام بھی جو بیسویں صدی کی پوری سیاست میں حصّہ لیتے رہے تھے، اس اچھوتے خیال سے چونک سے گئے۔ وہ سیّد صاحب کے اجتہاد پہ ٹھٹھک سے گئے۔ انہوں نے انبیائے کرام اور صحابۂ کبار کی مثالیں دے کر امیدواری کو معیوب گرداننے سے احتراز کیا۔ سیّد مودودی صاحب نے کہ دلائل کے

بادشاہ ہیں ان کا بھی بڑا عالمانہ اور مدلل جواب دیا۔ لیکن تجربے نے جماعت اسلامی کو بتا دیا کہ نظریات کو جب ہمیں عملی دنیا میں نافذ کرنا ہو تو حالات کے مطابق خفیف سی لچک لانی پڑتی ہے۔

پنجاب کے انتخابات کے تجربہ کے بعد جماعت اس نتیجے پہ پہنچی کہ ابھی جماعت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ہر نشست کے لیے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں آدمی کھڑے کر سکے، اس لیے جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں یا تو لادینی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں یا اسلامی نظام کے قیام کے لیے غیر مخلص ہوتے ہیں، یا مخلص ہوتے ہیں لیکن امیدواری کی صفت سبھی میں ہوتی ہے۔ پھر بکثرت علماء کو فقہی حیثیت سے بھی اس طرح کی اُمیدواری کے ناجائز ہونے میں کلام ہے۔ اس لیے سیّد مودودی صاحب نے لکھا "ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے۔ مگر فاسد عناصر کے شر کو دفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لیے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی، ان کو ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔"

دوسری خاص بات جو جماعت اسلامی نے اپنے پہلے انتخابات میں روشناس کروائی، وہ صالح اُمیدوار کا ایک نیا تصور تھا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمان مذہبی طبقوں اور اداروں نے مختلف انداز فکر کی رہنمائی کرتے ہوئے کئی مرتبہ انتخابات میں حصہ لیا تھا لیکن ان کے پاس اس جدت وجودتِ طبع اور اسلامی نظریات کو عملی زندگی پہ منطبق کرنے کی اجتہادی قابلیت کا ایسا مظاہرہ غالباً کوئی نہیں۔ جماعت اسلامی نے صالح امیدوار کی چار شرائط متعین کیں۔ اول وہ اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں اسلام کا سچا پیرو ہو۔ دوم عوام نے اپنے تجربے سے اسے ایماندار اور کھرا آدمی پایا ہو۔ تیسرے وہ دینِ اسلام سے واقف ہو اور معاملاتِ دنیا کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔ چوتھے وہ اقتدار کا حریص نہ ہو۔ پھر ایسے صالح امیدواروں کو کس طرح منتخب کیا جائے؟ سیّد صاحب نے لکھا:

"ہمارے کارکن ہر جگہ عوام کو انتخاب کے لیے منظم کرنے کی کوشش کریں گے۔ واقعی اہل اور صالح آدمیوں کو چھانٹنے کے لیے ہم ہر حلقۂ انتخاب میں پورے اعلان کے ساتھ عام

اور کھلے جلسے کر کے لوگوں کو دعوت دیں گے کہ وہ اپنی محلہ وار اور قریہ وار انتخابی پنچائتیں بنائیں۔ ان میں باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر، تمام تعصبات اور اغراض سے دلوں کو پاک کر کے، پوری ایمانداری کے ساتھ یہ رائے قائم کریں کہ ان کے درمیان کون لوگ ایسے ہیں جو مذکورہ بالا شرائط کے مطابق صالح کہے جا سکتے ہیں۔ جتنے نام پیش کیے جائیں گے، ان کو عام لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور ہر ایک کو کھلی تنقید کا موقع دیا جائے گا۔ تاکہ جس کا جو کچھ بھی حسن و قبح ہے، کھل کر سامنے آ جائے۔ اس تنقید سے جو لوگ چھٹ کر نکل آئیں گے، ان سے درخواست کی جائے گی کہ وہ بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ اپنے اندر سے ایک مردِ صالح کو چھانٹ لیں اسے حلقۂ انتخاب کے عوام کی طرف سے کھڑا کیا جائے گا۔ وہ شخص خواہ جماعت اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو، یہ جماعت اسی کی تائید کرے گی۔ اس کو اپنا زرِ ضمانت خود ادا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ حلقۂ انتخاب کے لوگ اس کی طرف سے ادا کریں گے۔ وہ انتخاب کی مہم میں ایک پیسہ بھی اپنی جیب سے خرچ نہ کرے گا۔ سارا خرچ حلقہ کے لوگ کریں گے۔"

انتخابات میں یہ ایک نیا تصوّر تھا۔ ورنہ لوگ یہ جانتے تھے کہ سیاسی پارٹیاں علاقے کے مؤثر ترین اور امیر ترین، زمیندار یا جاگیردار کو اپنے ساتھ گانٹھ لیتی تھیں۔ وہ اپنے پیسے اور اثر و رسوخ سے کامیاب ہو جاتا تھا۔ اور کامیابی کا پَر سیاسی پارٹی کے تاج میں لگ جاتا تھا۔ اس طرزِ عمل کے قطعی برعکس جماعتِ اسلامی نے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ بے لوث اور اہل نمائندوں کا اگر انتخاب کرنا چاہتے ہو تو ——— ووٹ بھی دو اور نوٹ بھی دو۔ نوٹ اس لیے کہ اگر اہل نمائندے منتخب کرنا چاہتے ہو تو وہ لوگ تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں، شریف ہو سکتے ہیں، ایماندار ہو سکتے ہیں، یہ بہت مشکل ہے کہ وہ امیر بھی ہوں۔ اس لیے ان کے انتخابی اخراجات ادا کرنے کے لیے ہمیں مل جل کر کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ جماعت نے پورے مغربی پنجاب میں جن ۵۳ نشستوں پر انتخاب لڑا، ان سب نمائندوں کے کارکنوں میں جماعت اسلامی کے ہمدردوں، کارکنوں اور ارکان کی نوّے فی صدی اکثریت تھی، جو صرف اپنے جذبے سے کام کرنے کے لیے

آئے تھے۔ تقاریر، پوسٹر، پنچائتیں، ووٹروں کے عہد نامے، پولنگ سٹیشن کی ڈیوٹیاں، افسروں سے ملنا، زرِ ضمانت داخل کروانا وغیرہ سب بکھیڑے اور اخراجات جماعتِ اسلامی کے ارکان اور کارکنان کرتے تھے۔ امیدواران تمام بکھیڑوں سے آزاد تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جماعت نے جن لوگوں کو کھڑا کیا، ان میں سے بیشتر بی اے، ایم اے، ایل ایل بی یا عربی مدارس کے فارغ التحصیل جیّد علمائے کرام تھے۔ دوسری پارٹیاں انتخابات میں پرانے جاگیرداروں، وڈیروں، زمینداروں اور نئے صنعت کاروں کو لے آئی تھیں تو جماعت تعلیم یافتہ، نیک، ایمان دار اور قابلِ اعتماد اور نہ بکنے والے بے لوث نمائندوں کو سامنے لائی تھی۔

موسمِ انتخابات کے معترضین

جماعتِ اسلامی کے انتخابات میں حصّہ لینے سے حکومت کی ناراضگی تو قابلِ فہم ہے لیکن اس موقعے پر جس طرح دوسری پارٹیوں، اسلامی سیاسی پارٹیوں، مذہبی گروہوں اور خالص دین دار گروہوں نے جماعت کی مخالفت کی، عام قاری وقت کے اتنے فاصلے سے اس کا صحیح تصوّر نہیں کرسکتا۔ ہر فرقہ اور ہر مکتبۂ خیال اپنے فتووں، کتابچوں، کتابوں، پوسٹروں، نعروں اور تقریروں سے جماعتِ اسلامی کے خلاف زہر اُگلنے لگ گیا۔ مسلم لیگی حکومت کی شہ پاکر بہت سے جبہ و دستار مدرسے اور دارالافتاء پانی پی پی کر جماعتِ اسلامی کو کوسنے لگے۔ صریح غلط بیانیاں کرکے فتوے لگانے لگے۔ سیّد صاحب کی تحریروں کو سیاق و سباق سے نکال کر انہیں اُلٹ معانی پہنا کر بغلیں بجانے لگے۔ معمولی باتوں کو غلط عنوانات اور جلی سرخیوں کے ساتھ روزانہ اخبارات میں شائع کروایا جانے لگا۔ غلط الزامات اور جھوٹے بہتان شائع کرکے ہینڈبلوں کی شکل میں عوام میں پہنچائے جانے لگے۔

سیّد صاحب نے ۴۹ء میں کہیں لکھا تھا کہ "ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کرلیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔" دارالعلوم دیوبند کے مفتی مہدی حسن صاحب نے کمال

دیانت سے لفظ ناممکن کی جگہ خود ہی ممکن لگا دیا اور بیس بائیس دیوبندی علماء و اساتذہ سے جن میں مولانا حسین احمد مدنی ؒ جیسے بزرگ بھی شامل تھے، تصدیقی دستخط ثبت کروا کر فتویٰ شائع کر دیا۔ ایسے فتاویٰ جب پوسٹروں کی شکل میں آتے تو ان پر سنسنی خیز عنوانات ہوتے مثلاً "مودودی صاحب کا ایک خطرناک اصول ــــــــــ نقہ عورتوں کو بداخلاق اور مرتد بناتی ہے ــــــــــ رسول اللہ ؐ پر غلط بیانی کا الزام ــــــــــ توہینِ عثمان ؓ" اس آخری پوسٹر کی بات یوں ہے کہ سیّد مودودی صاحب نے حضرت عثمانِ غنی ؓ کے بارے میں ایک جگہ لکھا: "حضرت عثمان ؓ جن پر اس کارِ عظیم (اسلامی حکومت) کا بار رکھا گیا تھا ان خصوصیات کے حامل نہ تھے، جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لیے جاہلیت کو اِسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمان ؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ رُکا۔"

مولانا احمد علی لاہوری صاحب جیسے نیک بزرگ سے ان کے عقیدت مندوں نے جن میں ایسا بیان لینے کے لیے کمیونسٹ بھی شامل ہو گئے تھے، اس سابقہ تحریر پر جسے لکھے بارہ سال ہو چکے تھے، یہ بیان لے کر خوب خوب پھیلایا۔ حالانکہ سچ پوچھیں تو اس بیان سے توہینِ عثمان ؓ ہوتی جو لاہوری صاحب مرحوم نے دیا اور انہوں نے لکھا "مودودی صاحب کی سابقہ تحریریں دو چیزیں مذکور ہیں۔ پہلی حضرت عثمان ؓ نظامِ خلافت سنبھالنے کے قابل نہیں تھے۔ یعنی نعوذ باللہ نالائق تھے۔ دوسری یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ کے زمانۂ خلافت میں جاہلیت (مودودی صاحب کی اصطلاح میں جاہلیت سے مراد کُفر ہوتی ہے) کو اسلام میں گھس آنے کا راستہ مِل گیا" ــــــــــ قارئین غور فرمائیں، یہ نالائقی اور کُفر کی دونوں باتیں سیّد مودودی صاحب نے تو نہیں کہی ہیں۔ پھر توہینِ عثمان ؓ کا مرتکب کون ہوا؟

بھارت میں حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی صاحب نے جماعت کے خلاف ایک مضمون لکھ کر شائع کروایا جو ترجمان مارچ ۵۱ء میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے جواب کے ساتھ شائع ہوا۔ گنگوہی صاحب کی فردِ قراردادِ جرم جو چوبیس صفحات پر محیط ہے، اس

کی سب سے زوردار دلیل یہ ہے، جسے وہ رُوحِ مضمون سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی میں عوام شامل ہوتے ہیں، جن کی کوئی رائے نہیں۔ جو کالجوں یونیورسٹیوں سے نکلے ہیں۔ اگر عربی مدرسوں کے کچھ لوگ جماعت میں گئے ہیں تو وہ ایسے ہیں جو کندھوں پہ حدیث کی کتابیں اور ہاتھ میں کمیونزم کی کتابیں رکھتے تھے۔ علماء جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے۔ حالانکہ "مقبول عند اللہ کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچتی ہے نہ عکس"۔ اصلاحی صاحب نے ۴۰ صفحات میں انہیں مدلل اور مسکت جواب دیا اور کہا کہ اگرچہ ہمیں انبیاء کرام سے وہ نسبت بھی نہیں جو ذرّے کو آفتاب سے ہے۔ لیکن کیا یہی بات حضرت نوحؑ، حضرت عیسٰیؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، ان کے زمانوں کے اکابر اور علماء نے نہیں کہی تھی کہ تمہارے ساتھ یہ غریب ماہی گیر، رائے سے کورے، سر پھرے چھوکرے اور کچھ غلام ہیں اور تمہارے ساتھ خواص نہیں ہیں۔

الفرقان لکھنؤ کے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے ستمبر ۵۱ء میں جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے کے عنوان سے طویل مضمون تحریر کر کے اس "کارِ خیر" میں حصّہ لیا۔ اصلاحی صاحب نے نومبر ۵۱ء کے ترجمان میں "نئی فرد قرار داد جرم" کے عنوان سے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ۶۴ بڑے صفحات پہ مشتمل یہ مضمون پورے رسالے پہ محیط تھا اور اس میں نعمانی صاحب کے اس طرزِ فکر پہ گرفت کی تھی کہ اگر جماعت اسلامی میں کچھ بُرائیاں ہیں تو چلو کچھ مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کے ذریعے تھوڑا بہت خدا اور رسول کا پتہ بھی لگ رہا ہے۔

سیّد مودودی بھی معترضین کے جواب دیتے دیتے عاجز آ رہے تھے۔ یہ معترضین سب کے سب موسمِ انتخابات کی فصلِ بہار تھے۔ ان دنوں جو معقول اور نامعقول سوالات، فتوے اور اعتراضات سیّد صاحب سے پوچھے گئے، اس کے جوابات انہوں نے رسائل و مسائل میں دیئے اور اس نام کی کتاب میں "جماعت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی مہم ــــــ تحریک اقامتِ دین کے سرپرستوں کی مزید عنایات ــــــ اعتراضات بلا ادنیٰ تحقیق ــــــ چند دلچسپ سوالات" کے تحت دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر

تھوڑی تفصیل سے ایسے لوگوں کے اعتراضات کا جواب ستمبر ۱۵ء کے ترجمان میں "جماعت اسلامی اور علماء کرام" کے نام سے لکھا۔ لیکن جن لوگوں نے پہلے سے ہی ارادہ کر رکھا ہو کہ میں نہ مانوں، انہیں کون منوا سکتا ہے۔

یہ الزام حکومت اور مولویوں کی طرف سے بغیر کسی ثبوت اور پوری ڈھٹائی سے لگایا جاتا رہا کہ جماعت اسلامی کو امریکہ سے امداد ملتی ہے، کہ جماعت اسلامی والے صرف اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں، کہ مولانا مودودی اپنے آپ کو علمائے سلف سے افضل سمجھتے ہیں، متعہ کو حلال قرار دیتے ہیں، فلموں کے دیکھنے کی اجازت دی ہے، دو سگی بہنوں کو ایک ہی خاوند کی زوجیت میں دینے کا فتویٰ دیتے ہیں، نبی اکرمؐ کی طرف جھوٹ منسوب کرتے ہیں اور یہ کہ مہدی اور مجدد ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں ——— اس آخری الزام کے بارے میں "تجدید و احیائے دین" کے باب میں تفصیل آچکی ہے کہ ملتان کے ایک مولوی صاحب نے اس الزام پر "خطرے کی گھنٹی" نامی کتاب بھی لکھ ماری تھی۔

علمائے اُمّت کا اجتماع

سید مودودی صاحب ہمیشہ کی طرح خطرے کی گھنٹیوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ اسلامی دستور کے خدوخال واضح کر رہے تھے، عوامی اجتماعات کو خطاب کر کے رائے عامہ کو اسلامی دستور کے لیے ہموار کر رہے تھے، جماعت اسلامی کی انتخابی مہم کو مہمیز لگا رہے تھے۔ سید سلیمان ندوی صاحب بھی حکومت پاکستان کے بلاوے پر بالآخر پاکستان میں آگئے۔ منشی عبدالرحمان خاں نے "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" نامی کتاب میں ندوی صاحب مرحوم کی ایک پُرلطف بات لکھی ہے "مولانا سید سلیمان ندوی صاحب جب پاک حکومت کے اصرار پہ ہجرت کر کے ہندوستان سے لاہور پہنچے تو مولانا مودودی صاحب نے انہیں چائے پہ مدعو کیا۔ دوران گفتگو مودودی صاحب نے ندوی صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی صدارت کی پیش کش قبول کر لی ہے۔ ندوی صاحب نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ایجاب ہو چکا ہے۔ قبول باقی

ہے۔"

سید سلیمان ندوی صاحب کراچی میں اپنے داماد سید ابو عاصم ایڈووکیٹ کے ہاں ٹھہرے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء سے ملاقات ہوئی، تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے ممبران سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انہیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ حکومتِ وقت، اسلامی دستور کا محض نام لے رہی ہے، دل سے وہ اسلام کا نام بھی سُننے کی روادار نہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کا کیا حشر ہوا۔ انہیں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے استعفیٰ کا بھی پتہ چلا ہوگا اور لیاقت علی خاں صاحب کی اس تقریر کا بھی جس میں وزیرِ اعظم صاحب نے بورڈ سے بالا ہی بالا عوام اور علماء سے دستور کے لیے "ٹھوس تجاویز" مانگی تھیں۔

لیاقت علی خاں صاحب کا خیال تھا کہ مُلاّ کب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کیا جانیں دستور کس بلا کا نام ہے؟ اور ان سے دستوری تجاویز کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ ہر ہر فرقہ کے جیّد علماء جمع ہو گئے، وہ اکتیس علماء جن کا نام ہر محفل میں احترام سے لیا جاتا ہے اور پھر ان میں سیّد مودودی صاحب بھی شامل تھے، جنہوں نے حال ہی میں اسلامی دستور پہ قابلِ قدر کتب لکھی تھیں۔ پھر ان مختلف العقائد علماء نے اسلامی دستور کے بائیس ایسے اصول منضبط کر دیئے، جس سے ان لوگوں کی زبانیں ہمیشہ کے لیے گُنگ ہو گئیں جو کہتے تھے کون سا اسلامی قانون؟ شیعوں کا؟ دیوبندیوں کا؟ یا بریلویوں کا؟ جو کہتے تھے ہمیں قرآن سے اسلامی دستور لا کر دکھاؤ ———— انہیں مسکت اور ٹھوس تجاویز مہیا کر دی گئیں۔

۲۱ جنوری تا ۲۴ جنوری ۵۱ء کراچی میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں، جن چیدہ چیدہ علماء نے حصّہ لیا ان میں سے سید سلیمان ندویؒ نے کانفرنس کی صدارت کی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب اس کانفرنس کے محرک تھے۔ مولانا شمس الحق افغانی صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا احمد علیؒ صاحب، ملتان کے مولانا خیر محمد صاحب مرحوم، مفتی محمد حسن صاحب، مولانا یوسف بنوری صاحب اور مولانا ظفر احمد انصاری صاحب، یہ سب بزرگانِ ملّت علمی و دینی اعتبار سے مسلمہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مشرقی پاکستان سے سات علمائے دین آئے۔

پیر امین الحسنات مانکی شریف اور پیر مجددی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے ۔ اہلحدیث مسلک کی نمائندگی مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ کر رہے تھے ۔ شیعوں کے ممتاز عالم مفتی حافظ کفایت حسین اور جعفر حسین مجتہد بھی تشریف لائے ۔ بریلوی مدرسۂ فکر کی نمائندگی مولانا عبد الحامد بدایونی اور مولانا راغب احسن ڈھاکہ کر رہے تھے ۔ مجلس احرار اسلام کی طرف سے مولانا محمد علی جالندھری تھے ۔ پانچ شرکائے کانفرنس کا تعلق تعلیمات اسلامیہ بورڈ سے تھا ۔ جماعت اسلامی میں سے صرف سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو بلایا گیا ، لیکن کانفرنس کے کام اور نوعیت کے لحاظ سے ان کی قدر و قیمت الم نشرح تھی ، چنانچہ وہ پوری کارروائی پر چھائے رہے ۔

بائنڈر نے لکھا ہے " چونکہ شرکائے کانفرنس کے پاس پہلے سے کوئی ایجنڈا نہیں تھا ، جس پر بحث و تمحیص ہو سکتی ، اس لیے کانفرنس دوپہر کے کھانے کے بعد تک کے لیے ملتوی ہو گئی ، تاکہ اس دوران ہر شریک اپنے اپنے طور پر اسلامی ریاست کے اصولوں کو قلم بند کرے ۔ فنی تعریف کے لحاظ سے علماء اسلامی قانون کے ماہروں کو کہا جاتا ہے لیکن اسلامی ریاست کے بارے میں یہاں ہر ایک کے خانہ زاد خیالات تھے ۔ معدودے چند ایسے تھے جو ان اصولوں کا ایک خاکہ ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے تیار تھے ۔ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے ارکان نے ان سوالات پر سوچ بچار میں کافی وقت صرف کیا تھا ۔ جب کہ مولانا مودودی اس موضوع پر مسلسل لکھ رہے تھے اور عوامی اور علمی اجتماعات کو خطاب کر رہے تھے ۔ اس موقعے پر ظفر احمد انصاری سیکرٹری بورڈ تعلیمات اسلامیہ اور مولانا مودودی کی دوستی اور متحدہ کوشش بار آور ہوئی ۔ سب سے پہلے مولانا مودودی صاحب نے اپنے اصول پڑھ کر سنائے ۔ بورڈ کے ممبران نے ان کی تائید کی ، اور چند ترمیمات پیش کیں ۔ سید سلیمان ندوی اور ان کی وجہ سے احتشام الحق تھانوی بھی موافقت میں تھے ۔ ڈھاکہ کے مولانا راغب احسن صاحب کو قائل کرنے میں کانفرنس کا زیادہ وقت صرف ہو گیا ۔ جنہیں یہی دلیل دی جاتی رہی کہ ہمیں اس دعوے کو غلط ثابت کرنا ہے کہ علماء باہمی طور پر کبھی متحد نہیں ہو سکتے ۔[1] "

---

[1] Ibid; P. 215

چار دن کے غور و فکر کے بعد علمائے اُمّت کے اس بے مثال اجتماع میں جس کی نظیر مسلمانوں کی ماضیٔ قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی، بائیس اصول طے کیے گئے، جو ان کے نزدیک اسلامی مملکت کے بنیادی اصول ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

نمبر۲ "ملک کا قانون قرآن و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی قانون ایسا نہ بنایا جا سکے گا جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو۔

نمبر۳ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصوّر پر نہیں، بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

نمبر۴ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سُنت کے بتاتے ہوئے معروفات کو قائم کرے منکرات کو مٹاتے اور شعائرِ اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

نمبر۷ باشندگان ملک کو شریعت اسلامیہ کے عطا کردہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ مذہب و مسلک، عبادت، اظہار رائے، نقل و حرکت، اجتماع اور اکتسابِ رزق کی آزادی حاصل ہوگی۔ جان و مال و آبرو کا تحفّظ حاصل ہوگا۔

نمبر۹ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، اپنے پیروؤں کو تعلیم دینے، اشاعتِ خیالات اور اپنے فقہی مذہب کے مطابق فیصلے لینے کا حق ہوگا۔

نمبر۱۰ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنی شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

نمبر۱۲، ۱۴، ۱۷- رئیسِ مملکت مسلمان مرد ہوگا۔ اس کی حکومت شورائی ہوگی، شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا، اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

نمبر۱۹- عدلیہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگی تاکہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں متاثر

نہ ہو۔"

اتنے مختلف الخیال اور مختلف العقائد علماء اُمت کا ایک جگہ جمع ہو جانا ہی نیک شگون تھا، پھر انہوں نے اسلامی مملکت کے بنیادی اصول وضع کر کے اجماعِ اُمت کا ٹھوس ثبوت دیا۔ جس کے بعد لادینی ریاست کے خواہش مندوں کے لیے حیلے بہانے کرنے کے سب چور دروازے بند کر دیئے گئے۔ دستور ساز اسمبلی کی سیکرٹریٹ میں عوام کی طرف سے دستوری سفارشات ۳۱ر جنوری ۵۱ء تک پہنچ جانی چاہیئے تھیں، علماء کی یہ تجاویز اس تاریخ کے بعد پہنچیں تاہم پہنچ گئیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب نے ان بائیس اصولوں کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر شائع کر دیا۔ جماعتِ اسلامی نے ان بائیس اصولوں کو شائع کر کے خوب پھیلایا اور عوام کو سید مودودی صاحب کی پہلی دستوری تقریروں اور تحریروں کے بعد جب معلوم ہوا کہ سید صاحب نے ہی ان اصولوں کا اصل خاکہ علماء کی کانفرنس میں پیش کیا تھا تو انہیں یوں معلوم ہوا کہ اس کارنامے کے پیچھے جماعتِ اسلامی ہی سرگرم رہی ہے۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ایک حد تک ضرور صحیح ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ تمام گروہوں کے علماء کے اتفاق کے بغیر اجماعِ اُمت کا یہ اہم اجتماع کبھی منعقد نہ ہو سکتا اور نہ وہ اتنے ٹھوس نتائج پیدا کرتا۔

باب ۲۵

انتخابات

منشورِ جماعتِ اسلامی

۵۰ء میں پنجاب میں انتخابات ہونے والے تھے تو جماعت اسلامی نے اپنا منشور تیار کیا۔ یہی منشور صوبہ سرحد اور پھر بہاولپور کے انتخابات میں کام آیا۔ ۵۸ء میں عام انتخابات ہونے والے تھے جسے سکندر مرزا اور ایوب خاں کے مارشل لاء نے تلپٹ کر دیا، اس وقت اس منشور میں چند ترامیم اور اضافے کیے گئے۔ منشور میں تازہ ترین اضافے دسمبر ۶۹ء میں کیے گئے جب کہ ملک ۷ دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ بنیادی طور پر منشور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسے مرتب کرتے ہوئے جنوری ۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء کے اسلامی دستور کے لیے تجویز کیے ہوئے ۲۲ نکات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ منشور گویا قرآنِ پاک کی اس آیت (الحج: ۴۱) کی، عہدِ جدید میں تفصیل ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ———

"جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم کریں گے۔ اور بدی سے روکیں گے۔"

منشور میں لکھا ہے کہ جماعت اسلامی پُرامن، آئینی اور جمہوری طریقوں سے نظامِ حکومت کو بدلنا چاہتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو:

"قرآن و سنت کے اتباع کی پابند اور خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیرو ہو۔ جس میں اسلام کے اصول و احکام پوری طرح کارفرما ہوں۔ بُرائی کو مٹائے، نیکی کو پروان چڑھائے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرے۔ ظلم، ناجائز استحصال اور اخلاقی بے راہ روی کی ہر شکل کو مٹائے۔ اسلامی اقدار کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیرِ نو کرے اور زندگی کے ہر پہلو میں عدل قائم کرے۔ خادمِ خلق ریاست ہو، ہر شہری کو اس کی بنیادی ضروریات (غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج) کی فراہمی کی ضمانت دے۔ رزقِ حلال کے دروازے کھولے، کسبِ حرام کے دروازے بند کرے۔ تمام جائز ذرائع سے ملک کی دولت بڑھائے اور اس دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔ صحیح معنوں میں ایک جمہوری حکومت ہو۔ عوام اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو اس کا اقتدار سونپنا چاہیں، وہی انتخابات کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آئیں۔"

جماعت اسلامی کا انتخابی منشور ایک اہم علمی و سیاسی اور دینی دستاویز ہے۔ عمدہ کتابت اور آفسٹ پہ چھپی ہوئی چالیس صفحات کی یہ ننھی سی کتاب جماعت اسلامی کے طرزِ فکر، تہذیب و شائستگی، نظر کی وسعت و گہرائی اور جدت و ندرت کی عکاس ہے۔ گو اسے جماعتِ اسلامی کی منشور کمیٹی نے مرتب کیا اور مجلسِ شوریٰ نے ہر بار اس میں ترامیم کیں، لیکن یہ جاننا کچھ مشکل نہیں کہ اس دستاویز کے پیچھے سید مودودی صاحب کا ذہن کام کر رہا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے اسلامی انقلاب اور اسلامی ریاست کی تعمیرِ نو کا کتنا صاف اور واضح تصوّر ہے اور ان کی نگاہ معاملات کی باریک باریک جزئیات تک پر ہے اور یہ لوگ مستقبل کی اسلامی ریاست کی کس طرح بتدریج اٹھان کریں گے۔

منشور میں بتایا گیا ہے کہ مملکتِ پاکستان کو کن بنیادی اصولوں پہ چلایا جانا چاہیے۔ جماعت اسلامی اس ملک میں کون سی آئینی، قانونی، مذہبی اور اخلاقی، تعلیمی، انتظامی اور معاشی اصلاحات نافذ کرے گی۔ غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ اور مشرقی پاکستان کی ترقی

کے لیے کیا کچھ کرے گی ۔ اس کی پارلیمانی پالیسی کیا ہو گی اور خارجہ پالیسی کیا ہو گی۔ پورا منشور ۴۸ صفحات پہ مشتمل ہے جو پھر ۱۰ اشقوں میں تقسیم ہیں ۔ اس طرح یہ ننھی سی کتاب جماعتِ اسلامی کے ہزاروں ارکان اور کارکنان اور لاکھوں متاثرین و موافقین کی ذہنی آبیاری اور تیاری کے لیے ہے کہ مستقبل کی جس اِسلامی ریاست کی تشکیل کا خواب وہ دیکھتے ہیں، اس کی تعمیر کا مکمل نقشہ اپنے ذہن میں رکھیں کہ کن امور کو عوام کی تبلیغ و تلقین سے بدلنا ہے ، کون سی بُرائیوں کو ختم کرنے کے لیے معاشرتی دباؤ منظم کرنا ہو گا اور کن دُور رس تبدیلیوں کے لیے قوت ، طاقت ، قانون اور پولیس کی مدد لینی ہو گی ۔ اگر جماعتِ اِسلامی کو کبھی بزمِ اقتدار میں داخل ہونے کا موقع مِلا تو یہ کتاب مُلک کی رہنما کتاب ہو گی ۔

اِنتخابی جلسے

منشور تو خیر خواص کے پڑھنے کی چیز ہے ، عوام کے لیے جماعتِ اِسلامی کے جلسہ ہائے عام تھے جو پنجاب کے اس کونے سے دوسرے کونے تک منعقد ہوتے ۔ یہ جلسے حُسنِ انتظام کا مُنہ بولتا شاہکار ہوتے تھے ۔ اس میں وہی سلیقہ اور نظم و ضبط ، تحمل اور صبر و سکون ، سیدھی روشیں ، عمدہ نشستیں اور وقار و متانت ہوتی جو جماعتِ اسلامی کا طُرۂ امتیاز بن چکی ہیں ۔ سیّد مودودی صاحب ان اجتماعات سے خطاب کرتے ۔ اکثر اوقات یُوں ہوتا کہ پنڈال میں سیّد صاحب ہی نمازِ جمعہ پڑھاتے اور اس کے بعد ان کی تقریر ہوتی ، جو عام طور پر ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کی تقریر ہوتی جو عصر تک رہتی ۔ اور سیّد صاحب بتاتے کہ جماعت اسلامی کی غرض و غایت کیا ہے ؟ ہمارا طریقِ کار کیا ہے ؟ ہم کیوں اور کس طرح انتخابات میں حصّہ لے رہے ہیں ؟

ہم لوگ تو ایسے جلسے سُننے کے عادی ہیں جس کے مقرر اچھے بھلے آدمی ہوتے ہیں ، لیکن سٹیج پر آتے ہی ان کی کیفیت بدل جاتی ہے ۔ اُونچی آواز میں تیز تیز تقریر کرتے ہیں ، ابھی ترنم سے گا گا کر شعر پڑھ رہے ہیں ، اور ابھی مغلوب الغضب ہو کر لاؤڈ سپیکر کو ہی پھاڑے دے رہے ہیں ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی بات اُتارنا نہیں

چاہتے، ان کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑ رہے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے جلسوں میں ایسی کوئی بات نہ ہوتی، نہ سٹیج پہ مداری کے کرتب ہوتے، نہ طنز و استہزا کے تیر چلتے، نہ لطیفے اور چٹکلے ہوتے، نہ ہنسانے اور رُلانے والی کہانیاں ہوتیں، نہ شور و غوغا ہوتا، نہ مردہ باد کے نعرے لگتے اور نہ پٹاخے دار اور چٹخارے دار تقریریں ہوتیں۔ اس کے باوجود ہزارہا افراد کے عظیم اجتماعات بھی سیّد صاحب کی اتنی لمبی تقریر کو بڑے غور، تحمل اور توجہ سے سنتے اور اس کا دلوں پہ اثر لے کے جاتے۔

ہاں ایک چیز ضرور ہوتی جو سیّد مودودی کی مقالہ ایسی تقریر کے بعد بڑی پُر لطف ثابت ہوتی۔ یہ لوگوں کے سوالات کے جوابات تھے۔ سیّد صاحب جوابات دینے میں منفرد اور یکتا ہیں۔ ان کا جواب مختصر، جامع، مدلل اور بھرپور ہوتا۔ جس میں ہلکا پھلکا مزاح اور کبھی کبھار کوئی چٹکی ایسی ہوتی، جس سے چہرے کھل جاتے، اور ہونٹوں پہ تبسم نمودار ہو جاتا۔ مثلاً ایک انتخابی جلسے میں کسی نے سوال کیا کہ کیا کانا دجّال جس کے متعلق آنے کی خبر دی گئی ہے آئے گا یا نہیں۔ سیّد صاحب نے جواب دیا ——— "یہ ہے پنجاب کے انتخابات کے متعلق نہایت اہم مسئلہ، جو ہمارے علمائے کرام نے پیش فرما دیا ہے۔ اس کا جواب ترجمان میں دیا جا چکا ہے، احادیث میں اس کا آنا ثابت ہے، میں خود ہر نماز میں اس فتنے سے پناہ کی دُعا کرتا ہوں۔"

کسی نے سوال کیا آپ دوسری اپوزیشن پارٹیوں سے مل جاتے، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بناتے ہیں۔ سیّد صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اپوزیشن کا متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی لیکن نہ بن سکا۔ لیکن جواب کے ابتدائی فقرات دل موہ لیتے ہیں ——— "ہمیں ڈیڑھ اینٹ میسّر آئی ہے ہم نے اس سے مسجد بنانا شروع کر دی۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس ڈیڑھ اینٹ کو بھی کسی بُت کدے کی تعمیر پر صرف کر دیں۔"

کسی منچلے نے پوچھا کہ جماعت اسلامی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کیا سب ملازمتیں مولویوں کو ہی ملیں گی، یا ہم کالجیٹ لوگوں کو بھی چپڑاسیوں کی کوئی جگہ مل جائے گی۔ سیّد صاحب نے جواب دیا ——— "جماعت اسلامی کے برسرِ اقتدار آنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ البتہ پنچائتوں

کے چُننے جانے والے نمائندوں میں سے بارہ عالم ہیں تو بیس گریجوایٹ۔ اس لیے وہ آپ کے طبقے کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کریں گے۔"

کئی ایک سوالات ہر جگہ بار بار دہرائے جاتے۔ مثلاً یہ سوال پوچھا جاتا کہ آپ اپنی جماعت کو جماعتِ اسلامی کہتے ہیں۔ کیا باقی جماعتیں غیر اسلامی ہیں؟ سیّد صاحب نے جواب دیا ______ "اگر کوئی جماعت اِسلام کا کام کرنے اُٹھے تو کیا وہ اپنے آپ کو کافرانہ جماعت کہے گی۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص اپنا نام عبداللہ رکھے تو دوسرے اس سے نتیجہ نکال لیں کہ وہ ان کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتا ______ یہ غلط فہمیاں تو زبردستی پھیلائی جارہی ہیں۔"

کچھ سوالات بڑے تیکھے ہوتے مثلاً آپ کو کسی پنچایت نے نہیں چُنا، کیا آپ کے حلقے کے لوگ آپ کو صالح نمائندہ نہیں سمجھتے؟ یا یہ سامان جو آپ کے جلسے میں ہے فضول خرچی نہیں ہے؟ یا آپ تو مساوات کے علمبردار ہیں پھر جلسے میں کُرسی پر کیوں بیٹھتے ہیں؟ سیّد صاحب نے جواب دیا ______ "ہر ملک کی تہذیب یہی ہے کہ جلسے کا صدر کسی ایسی جگہ ہو جہاں سے وہ نظر آسکے۔ مقرر کے لیے بھی ضروری ہے کہ پُورا مجمع اس کے سامنے رہے اور وہ حاضرین کو ہر وقت اور ہر سمت میں دیکھ سکے۔ اسلام کے بھی یہ خلاف نہیں ہے۔ آخر ہمارا خطیب مسجد میں منبر پر بیٹھتا ہے اور اس کا منبر پر بیٹھنا کسی صورت بھی مساوات کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔"

اِنتخاباتِ پنجاب

حقیقت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی اس وقت ایسی قوت نہیں تھی جس سے حکومت کو یہ خطرہ ہوتا کہ یہ لوگ برسرِ اقتدار آجائیں گے۔ پھر جماعتِ اسلامی نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے پنجاب میں ۵۳ نشستوں پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر کے اپنے کارکنوں، اپنے وسائل اور اپنی قوت کو منتشر کر لیا تھا۔ اسی تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اپنی قوت کو مجتمع رکھتے ہوئے ۵۸ء کے اوائل میں کراچی میونسپل کارپوریشن کا انتخاب لڑا تو ۲۶ نشستوں میں سے

۲۳ پر کامیابی حاصل ہوئی جس سے مخالفین دم بخود رہ گئے۔ اس کے باوجود حکومت خائف تھی کہ یہ نہ بکنے والے لوگ دو چار کی تعداد میں بھی اسمبلی میں آ گئے، تو ہمارا ناک میں دم کر دیں گے۔ اس لیے حکومت نے پورا زور لگایا کہ جماعت اسلامی کا کوئی نمائندہ کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ ۵ اگست ۵۰ء کو مصباح الاسلام فاروقی صاحب اور ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر ۵۰ء کو روزنامہ تسنیم اور قاصد کو ایک ایک سال کے لیے بند کر دیا گیا، اور جس پریس میں یہ اخبارات شائع ہوتے تھے ان سے ضمانت طلب کر لی گئی، جس سے جماعت کو بارہ تیرہ ہزار روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

حکومت نے اگر قانون اور طاقت سے جماعت اسلامی کی مخالفت کی تو کچھ مولویوں نے فتووں، تقریروں، کتابوں اور پیشین گویوں سے جماعت اسلامی کے خلاف فضا سازگار کی۔ سید صاحب نے اس مخالفت کے بارے میں اجتماع کراچی ۵۱ء میں ارکان کو ہدایات دیتے ہوئے کہا ——— "اس مخالفت نے آپ کی تحریک کے لیے بڑھنے اور ابھرنے کا جو ایک غیر معمولی موقع فراہم کر دیا ہے، اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے۔ یہ اللہ نے آپ کے رفع ذکر کا سامان کیا ہے۔ اس سے گھبرائیے نہیں بلکہ اس سے کام لیجیے۔ عرب میں اسی نوعیت کے پروپیگنڈے کا طوفان جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اٹھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشخبری دی تھی کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ہمیں تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایک طرف ایک گروہ سرکلر پہ سرکلر بھیج بھیج کر ملازمین سے ہمارا تعارف اور بڑا وزنی تعارف کرا رہا ہے۔ دوسری طرف تمام گمراہ گروہ اپنے اپنے حلقوں میں ہم کو روشناس کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔"

سید مودودی صاحب نے مومن کو جوئے رواں سے تشبیہ دی ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آتی ہے تو وہ پہلو سے راستہ بنا کر آگے نکل جاتی ہے۔ پھر کوئی چٹان راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے تو دوسری سمت سے آگے بڑھتی ہے۔ غرض وہ رکنا تو جانتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جب حکومت نے پنجاب کے انتخابات کے موقعہ پر جماعت سے پریس کی طاقت چھین لی تو جماعت نے پنجابی عوامی شاعری کا محاذ کھول دیا۔ شہر قصور کے جناب عبد اللہ شاکر صاحب نے پنجابی نظموں کا ایک سلسلہ شروع کیا، جو تحریک اسلامی کی تاریخ کا

ایک حصہ بن گئیں۔ ان کی پہلی نظم " ووٹ دا حق دار" تھی۔ اس کے بعد " پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ " اسلامی نظام دیاں برکتاں، مودودی دا گناہ، دیہو جواب، شیطانی وحی، رحمانی الیکشن تے شیطانی الیکشن۔ نامی نظمیں لکھیں۔ لیکن حکومت ان میں نظموں کو برداشت نہ کر سکی اور انہیں ضبط کر لیا۔" جماعت دی دعوت، سیفٹی ایکٹ، جنگل دا قانون "

مارچ ۵۱ء میں دس روز تک مغربی پنجاب اسمبلی کا معرکۂ انتخاب گرم رہا۔ دوسری پارٹیوں کے صنعت کاروں، زمینداروں اور جاگیرداروں کے پاس دھن، دھوکا اور دھاندلی کے ہتھیار تھے۔ جماعت اسلامی نے ۳۵ نشستوں کے پورے انتخابات پر صرف ایک لاکھ بائیس ہزار روپے خرچ کیے، حالانکہ دوسری پارٹیوں کے ایک ایک امیدوار نے اس سے زیادہ خرچ کیا۔ دھاندلی کی حد یہ تھی کہ بہت سے لوگ ووٹ دینے کے لیے پہنچے تو دوسری پارٹیوں کے آدمی ان کا ووٹ پہلے ہی ڈال چکے ہوتے۔ پھر بقول نوائے وقت سرکاری پارٹی نے جھرلو بھی استعمال کیا، جس سے غیر سرکاری امیدوار کے بیلٹ بکس سے ووٹ سرکاری امیدوار کے بکس میں چلے جاتے تھے۔ جناح عوامی مسلم لیگ کے کارکن بھی حسبِ توفیق مسلم لیگ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ وہ جماعتِ اسلامی والوں کا مذاق اُڑاتے اور کبھی ہمدردی سے سمجھاتے کہ اگر کامیاب ہونا ہے تو جعلی ووٹ اور بوگس کام تو کرنا ہی ہوگا۔ سیّد مودودی صاحب نے اس بارے میں دوٹوک ہدایت دے رکھی تھی ——— " ہم جعل سازوں میں ایک اور جعل ساز کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ایمانداروں میں اضافہ ہو "

جماعتِ اسلامی پہلی دفعہ انتخابات کے میدان میں اُتری تھی۔ اسے ہر قسم کی جعل سازی اور بداخلاقی کے مقابلے میں اسلامی اخلاق کا عَلم بلند رکھنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جھوٹے وعدوں، منافقت، ڈپلومیسی اور دھوکے سے پوری طرح اجتناب کیا۔ پھر اس کے نمائندے تعلیمیافتہ اور با اخلاق تھے، کارکنوں نے پوری لگن اور جذبے سے کام کیا، اس کا عوام پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ لیکن لوگ ابھی تک جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار سے اُوپرائے ہوئے تھے جو کہتی تھی پہلے ووٹر کا عہد نامہ پُر کرو، پھر پنچائتیں بناؤ، پھر صالح نمائندہ چُنو، پھر اسے کامیاب کرنے

کے لیے ووٹ بھی دو اور نوٹ بھی دو، ایسے نمائندے جب اسمبلی میں جائیں گے تو وہ بے لوث، بے باک اور صحیح نمائندے ہونگے چنانچہ قریبًا پچاس ہزار آدمیوں نے جماعت اِسلامی کے ووٹر کے عہد نامہ پر دستخط کیے کہ ہم اہل آدمیوں کو ووٹ دیں گے، قریبًا چودہ سو بستیوں میں نیک لوگوں نے مقامی پنچائتیں بنائیں تاکہ وہ نیک، تعلیم یافتہ اور اہل آدمیوں کو منتخب کریں۔

نہ صرف حکومت نے جماعت اِسلامی کو پریس کی طاقت سے محروم کر رکھا تھا۔ بلکہ پورے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے جماعت کی خبروں کا عملًا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ برادریوں کے تعصب، حکومت کے دباؤ اور دھن دھونس کے ماحول میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے وسیع پیمانہ پہ معرکۂ انتخاب میں سرگرم حصّہ لیا۔ عام پبلک میں سے سترہ سو نیئے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے تمام پابندیوں کے ساتھ جماعت کی انتخابی جدوجہد میں کام کیا۔ چنانچہ جماعت کو پورے پنجاب میں قریبًا دو لاکھ اٹھارہ ہزار ووٹ ملے۔ اگر ملکی دستور ایسا ہوتا کہ ووٹ امیدواروں کی بجائے سیاسی پارٹیوں کو دیتے جاتے، جیسا کچھ مغربی ممالک میں ہوتا ہے تو جماعت اسلامی اپنے ووٹوں کی نسبت سے اپنے ۲۵ نمائندے اسمبلی میں بھیجتی۔ لیکن اب قصور سے مولوی محی الدین لکھوی صاحب منتخب ہوئے جو خدا رسیدہ اہلحدیث بزرگ تھے اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ پورے پنجاب میں سے جماعت اِسلامی کا صرف یہی ایک نمائندہ کامیاب ہوا۔

اِنتخاباتِ سرحد

یہی حال صوبہ سرحد کے انتخابات کا ہوا جو نومبر ۵۱ء میں منعقد ہوئے یہاں کے مردِ آہن خان عبدالقیوم خاں وزیرِ اعلیٰ تھے۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جمہوریت کُشی میں وہ کسی طرح سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سرحد میں جو انتخابات ہوئے وہ سرکاری پارٹی کی پیشانی پر ایک دھبّہ بن گئے۔ اگرچہ اس کا ایک ضمنی اثر یہ ضرور ہوا کہ لوگ پنجاب کے

انتخابات کی دھاندلیوں اور جھرلو کو بھول گئے۔

۸؍اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سیّد مودودی صاحب پشاور پہنچے تاکہ کننگھم پارک میں جلسۂ عام سے خطاب کریں تو شام سے پہلے پہلے دفعہ ۱۴۴ لگ گئی۔ سیر کے لئے بھابھڑہ میں سیّد صاحب نے تقریر کی تو دونوں میزبانوں یعنی خان سردار علی اور ارباب نعمت اللہ خاں کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ بھابھڑہ وہ جگہ ہے جہاں کچھ عرصہ پہلے چار پانچ سو سرخ پوش ہلاک کیے گئے تھے۔ سیّد صاحب کے جلسے کے بارے میں بھی افواہ تھی کہ پھر گولی چلے گی۔ اس افواہ کے باوجود تین چار ہزار لوگ جلسے میں موجود تھے۔ نوشہرہ، پبی اور جمکنی کے جلسے بہت کامیاب رہے۔ اس لیے یہاں کے ارکان و متفقین کو انتخابات تک کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۶؍اکتوبر کو وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے اچانک قتل کی وجہ سے سیّد صاحب نے اپنا دورۂ سرحد ملتوی کر دیا۔ قتلِ لیاقت علی خاں سے بھی قیوم خاں صاحب نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، جہاں کسی شخص پر شبہ ہوا کہ یہ سرکاری پارٹی کا مقابلہ کرے گا، اسے اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ یہ لیاقت علی خاں کی موت سے خوش ہوا ہے۔

"دینی حمیت" والے لوگ یہاں بھی سیّد صاحب کے تعاقب میں رہے۔ ایک سرکاری مولوی صاحب تو چار پانچ روز تک سیّد صاحب کے ساتھ رہے۔ سیّد صاحب جہاں جاتے، یہ حضرت بھی ساتھ پہنچ جاتے۔ اور اپنے سوالات سے زیر کرنے کی کوشش کرتے، ایسا "بلند اور عالمانہ" مسئلہ بھی یہاں پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنی ماں کو بیوی بنا لے تو باپ کی وراثت کیسے تقسیم ہو گی۔ بہاول پور کے ایک صاحب جو صوبہ سرحد میں آ کر "مہاجر" بن گئے تھے، جنہوں نے کافی زمین الاٹ کرا رکھی تھی اور ان کے مریدوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا، انہوں نے ان دنوں "فتنۂ مودودیت" نامی کتاب لکھی اور سرحد کے تمام علماء کو مفت بذریعہ رجسٹری بھیجی۔"

۹؍نومبر ۱۹۵۱ء کو سرحد اسمبلی کے امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی کی پڑتال ہوئی تو آزادانہ انتخابات کا یہ عالم تھا کہ قیوم خاں کے ایک مدِّمقابل کے کاغذ اس لیے مسترد کر دیئے گئے کہ قیوم خاں نے پہلے ہی انہیں جیل میں بھیج رکھا تھا۔ غلام محمد لونڈ خور چونکہ صوبہ بدر تھے، اس لیے

ان کے دستخط جعلی ہی ہوں گے، لہٰذا کاغذات مسترد۔ ارباب نعمت اللہ خاں کی عمر ۴۶ سال نہیں ۲۴ سال ہے، کاغذات مسترد۔ خاں سردار علی خاں کے پتہ میں ایضاً لکھ دیا گیا ہے، کاغذات مسترد۔ اور مولانا معین الدین صاحب کے مجوز کمرۂ عدالت میں فوراً داخل نہیں ہوئے، کاغذات مسترد۔ اس کے باوجود سرکاری پارٹی کا مقابلہ کرنے والے باقی رہ گئے تھے، ان میں سے بیشتر کو دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان کی الاٹ شدہ زمین کی الاٹمنٹ منسوخ کر دی گئی۔ اس طرح بارہ امیدواروں کو دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس سے سرکاری پارٹی کے اکثر امیدوار "بلا مقابلہ" منتخب ہو گئے۔

یوسف خٹک اور ان کی پارٹی ڈٹ کر قیوم خاں کا مقابلہ کر رہی تھی، لیکن قیوم خاں صاحب نے ان کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ مہینہ بھر بیشتر پولنگ سٹیشنوں کا اعلان ہوتا رہا اور جب پولنگ شروع ہوا تو پولنگ اسٹیشن اور ہی مقامات پر تھے۔ غیر سرکاری امیدواروں کے بکس اُلٹے رکھ دیئے گئے، بعض امیدواروں اور ان کے ایجنٹوں کو پولنگ سٹیشن کے اندر گھسنے تک نہ دیا گیا۔ اسلحہ رکھنے کی اجازت صرف سرکاری امیدواروں کو تھی، بعض مقامات پر پولیس کا سپاہی پرچی ڈالنے میں رہنمائی کرتا، سب سے بڑا جادو یہ تھا کہ بیلٹ پیپر کی پوری کی پوری کاپیاں، سرکاری امیدوار کے بکس میں پہنچ جاتی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود مردِ آہن قیوم خان نہ جیتتے تو اور کون جیت سکتا تھا۔

کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

سال بھر کی دوڑ دھوپ، کوششوں اور ہزاروں کارکنوں کی تگ و دو اور محنت کے بعد جب پنجاب کے انتخابات میں صرف ایک نمائندہ کامیاب ہوا اور وہ ایک نمائندہ بھی غیر مؤثر ثابت ہوا۔ تو جماعت اسلامی کے حلقے میں امیدوں کے تمام قلعے زمین بوس ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے سوچا کہ ہم نیکی، شرافت اور ایمانداری سے کبھی کامیاب ہو ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ جو لوگ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر الگ ہوئے اور وہ جماعت اسلامی کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ جماعت کو چاہیئے کہ وہ سیاست کو چھوڑ دے۔

اور صرف علمی و دینی کام کرے، ان میں سے بیشتر لوگ وہ ہیں جو انتخابات کے نتائج سے مایوس ہوئے اور ان کی مایوسی انہیں جماعت سے بھی دور لے گئی۔

اس کے برعکس سیّد مودودی صاحب مایوسی کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ وہ تو کسان کی طرح صبر و تحمل سے کام کرتے رہنے کے عادی ہیں اور نتائج کو جلدی سے حاصل کرنے کے کبھی متمنی نہیں رہے۔ وہ نہ صرف ایک عالم، ایک مفکر اور ایک سیاست دان ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ عوام کی نفسیات سے بھی آگاہ ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت ارکان اور کارکنوں کے دلوں پہ مایوسی اور بددلی کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بہی خواہوں، ساتھیوں اور کارکنوں کو مایوسی کی اس دلدل سے نکالنے اور منزلِ مادّو رنیست کے جذبے سے گرمانے کے لیے مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کیا، جو ۱۵ اپریل سے ۱۸ اپریل ۱۵ء تک ہوتا رہا۔

شوریٰ نے انتخاباتِ پنجاب کا جائزہ لیا اور اپنے تاثرات کو ایک قرارداد کے ذریعے محفوظ کیا اور کہا کہ جماعت کے ارکان پہلی مرتبہ انتخابات میں اُترے تھے۔ پریس نے ساتھ نہیں دیا، ہمارے کارکن اخلاقی اصولوں پہ کاربند رہے حتیٰ کہ جتنی خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لیے کام کیا، انہوں نے ہر جگہ شرعی پردے کی پابندی کی، اتنے ہزار کارکن، ووٹر اور ووٹ ملے، حلقۂ تعارف بہت وسیع ہو گیا اور جن لوگوں نے بھی ووٹ دیا ہر قسم کی دھمکی اور لالچ کو نظر انداز کر کے خالص اصول کی خاطر اپنا ووٹ دیا۔ لہٰذا ——— "مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ اگر ہم رائے عام کی تربیت اور کارکنوں کی تیاری اور باشندگانِ ملک کی اخلاقی اصلاح کے لیے پیہم کوشش کرتے چلے جائیں تو آخر کار پُرامن آئینی ذرائع ہی سے یہاں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انتخابات کے بارے میں جماعت کی پالیسی کو حسبِ سابق جاری رہنا چاہیئے اور جہاں کہیں ملک میں انتخابات ہوں ان میں حصّہ لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

انتخابات کے ہنگاموں سے فارغ ہونے کے بعد سیّد مودودی صاحب نے ترجمان القرآن کے اشارات میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا جسے "جماعتِ اسلامی، اس کا

مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل" کے نام سے بعد ازیں شائع کیا گیا۔ اس میں جماعتِ اسلامی کے اس وقت تک کے کام کا تعارف کروایا گیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ نویسی کا شگفتہ اندازِ بیان لیے ہوئے ہے۔ اس میں انتخابی جدوجہد کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ یہ اس کتاب کے آخری حروف ہیں جو نہ صرف دماغ کو اپیل کرتے ہیں، بلکہ جذبات کو بھی انگیخت کرتے ہیں:

"انتخابی جدوجہد کے بارے میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طریقے پر مسلسل کام کیا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ عوام کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ بھی دُور ہو گی، ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے عناصر کا زور بھی ٹوٹے گا، حکومت کے نظم و نسق میں جس قدر صاحبِ ضمیر اور فرض شناس عناصر موجود ہیں، ان کی ہمدردیاں بھی ایمان دار لوگوں کے ساتھ شامل ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی مدد اور رائے عام کی تائید سے بالآخران بے ایمانوں کا سدِّباب بھی کیا جا سکے گا جو انتخابات میں فساق کے سر کامیابی کا سہرا باندھا کرتی ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس امر کا امکان پیدا ہو گا کہ یہاں اقتدار کی باگیں ان صالح انسانوں کے ہاتھ میں آئیں جو پورے اسلام کو اس کی اصلی شان کے ساتھ اس ملک میں نافذ کرنے والے ہوں۔

کوئی اللہ کا بندہ آنکھیں رکھتا ہو اور دیکھنا چاہتا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ دراصل ہمارا یہ آخری قدم نظامِ فسق و ضلال کے قلعے کی طرف براہِ راست پیش قدمی ہے اور ایک فیصلہ کن ضرب ہے، جو ٹھیک اس کی فصیلوں پر جا کر پڑتی ہے۔ اگر ہم اپنے مقاصد میں سے صرف پہلے تین مقاصد کے لیے کام کریں، یا چوتھے مقصد کو بھی اپنے لائحۂ عمل میں لے تو لیں، مگر اسے حاصل کرنے کے لیے انتخابات میں عملی حصّہ نہ لیں، تو نہ قیادتِ فاسقہ کبھی ہٹ سکتی ہے اور نہ وہ قیادتِ صالحہ کبھی قائم ہو سکتی ہے، جس کے قیام پر نظامِ اسلامی کا قیام منحصر ہے۔ یہ عملی انقلاب اگر رونما ہو سکتا ہے تو اسی آخری قدم سے ہو سکتا ہے جو ہم نے اب اُٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ قدم نہ اٹھایا تھا کسی نہ کسی طرح ہمیں برداشت کیا جا رہا تھا۔ مگر جونہی کہ یہ قدم ہم نے اٹھایا، قیادتِ فاسقہ اور اس کے مددگار سب کے سب

یک لخت بھڑک اُٹھے۔ پاکستان سے لے کر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی، پُرانے پُرانے دشمن جو کبھی جمع نہ ہو سکتے تھے اس خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہو گئے، دیوبند اور بریلی گلے مِل گئے، پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہو گیا، اہلِ حدیث اور منکرینِ حدیث متفق ہو گئے، قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا، ہماری دس دس بارہ بارہ برس کی پُرانی تحریریں میں سے وہ گمراہیاں ٹپکنی شروع ہو گئیں جو پہلے کبھی نظر نہ آئی تھیں، یا دین کے لیے خطرہ نہ سمجھی گئی تھیں، ہندوستان کے کانگریسی علماء تک دینی حمیتوں کے تقاضوں سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں۔

حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شانِ تواضع کے ساتھ جماعتِ اسلامی کی وہ ساری بُرائیاں گنوا دیں، جو ان کے خیالِ مبارک میں تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے کہ یہ قدم ہم نے ٹھیک صحیح رُخ پہ اُٹھایا ہے، تو نہ معلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے۔ ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی اس گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں، جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتے دیکھ کر اس پر طاری ہوا کرتی ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا ہے:

ے یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زبان ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

باب ۲۶

مطالبۂ دستورِ اسلامی

اِجتماع کراچی

گھڑی کی سوئیوں نے عین خطِ مستقیم میں آ کر شام کے چھ بجائے!

اور اس کے ساتھ ہی سید مودودی صاحب نے حمد و ثنا کے ساتھ لنگری گراؤنڈ میں منعقد ہونے والے اجتماعِ کراچی کا افتتاح کیا۔ لیگی حکومت نے جماعتِ اسلامی کو سالانہ اجتماع کے لیے اس غیر معروف گراؤنڈ کی اجازت اس لیے مرحمت فرمائی تھی کہ اس کا خیال تھا کہ اس گراؤنڈ سے قریب ترین بس رُوٹ بھی نصف میل دُور ضرور تھا۔ اس لیے لوگ ان کی بات سُننے کے لیے نہیں آئیں گے۔ لیکن ۱۰ نومبر ۱۵ء کی اس رات کو اس کوشش کے باوجود جگمگاتے پنڈال میں تیس پینتیس ہزار افراد موجود تھے۔ ماہنامہ فاران کے مدیر اور برِّصغیر کے مشہور شاعر ماہر القادری صاحب نے اجتماع کے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ آیئے ان کی رفاقت میں اجتماع کراچی ۱۵ء میں چلیں۔

"حاضرین کی نظریں ڈائیس پر لگی ہوئی ہیں ٹھیک وقت پر امیرِ جماعتِ اسلامی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر نہ کوئی کھڑا ہوا اور نہ جماعت کے کسی کارکن نے زندہ باد کے نعرے لگائے۔ تلاوتِ قرآن شریف کے بعد مولانا موصوف نے تقریر شروع کر دی۔ اتنا بڑا اجتماع اور ہر مکتبۂ فکر و خیال کے آدمی موجود ہیں۔ مگر پورا مجمع ساکت و متوجہ ——————

ع اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

مولانا مودودی کی تقریر میں نہ چٹکلے نہ لطیفے ہیں نہ شعر اور نہ کہاوتیں ہیں مگر لوگ کس قدر دلچسپی اور خاموشی کے ساتھ ان کی تقریر سُن رہے ہیں۔ سادہ جملے، کوثر میں ڈھلی ہوئی قلعہ معلّیٰ کی زبان، باوقار لہجہ۔ کسی قسم کی ایکٹنگ نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ ہاتھ کو جُنبش دیتے ہیں، وہ بھی بڑی متانت کے ساتھ۔ دلیلیں اتنی زیادہ وزنی، زوردار، مسکت اور مطمئن کرنے والی کہ ہر بات دل میں اُترتی جاتی ہے۔ اور بڑے سے بڑا مخالف سوچنے اور غور کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ ان کی تقریر دل، دماغ اور ضمیر پر اپنے نقش چھوڑتی جاتی ہے۔ جس کا جتنا ظرف، یافت، ذوق اور استعداد ہے اسی کے بقدر تقریر سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"

ماہؔر صاحب جلسہ گاہ کے انتظام کے بارے میں بتا رہے ہیں "جماعتِ اسلامی اپنے اجتماعات کی پبلسٹی اس حسن و خوبی اور قرینہ کے ساتھ کرتی ہے کہ پوری آبادی اس طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اور لوگ چونک جاتے ہیں کہ کوئی غیر معمولی اجلاس ہوا چاہتا ہے۔ اخبارات میں اعلان و اشتہار کے علاوہ اجلاس کے پوسٹر شہر میں چسپاں کیے جاتے ہیں۔ جلی، نمایاں اور دیدہ زیب رسم الخط، عبارت مختصر سے مختصر کہ ایک نگاہ میں پورا پوسٹر پڑھ لیا جائے۔ جس طرح دوسری جماعتوں کے علماء اور رہنماؤں کے ناموں کے ساتھ شیخ العلماء، قدوۃ السالکین، مجاہدِ ملّت، زبدۃ الاصفیاء، امام الکل، فخرِ قوم، خطیبِ پاکستان، قبلہ مدظلہ العالی وغیرہ القاب لکھے جاتے ہیں، اس قسم کا کوئی لقب جماعت کے کسی رہنما کے ساتھ نہیں لکھا جاتا۔ ایک آدھ پوسٹر میں مولانا مودودی کے نام کے ساتھ مفکرِ اسلام کا لقب البتہ دیکھا گیا ہے۔ ان پوسٹروں کی سادگی اور پُرکاری پڑھنے والوں کی توجہ کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے۔"

"جماعتِ اسلامی کے کارکن اپنی خدمت کا صلہ اور اجر اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں دُنیا والوں سے داد و ستائش کی کوئی تمنا نہیں رکھتے۔ جماعت کا ایک کارکن یونیورسٹی کا اعلیٰ

تعلیم یافتہ ہے اور اس کے ذمہ سائیکلوں کی نگہرانی کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ دوسرے صاحب موٹر نشین ہیں اور بنگلہ میں رہتے ہیں، ان سے وضوخانہ اور بیت الخلاء کی صفائی وغیرہ کا کام متعلق ہے۔ اس کے باوجود ہر کوئی رضا و رغبت اور خوش دلی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے، کسی قسم کی ناگواری نہیں۔ آپس میں کام کرنے پر تُو تُو مَیں مَیں نہیں۔ سب لوگ ایک ہی مشین کے کل پرزوں کی طرح حرکت میں ہیں اور مصروفِ کار ہیں۔"

"لیجئے لاؤڈ سپیکر سے اذان کی صدا بلند ہوئی اور سب لوگ نماز کی تیاریاں کرنے لگے اور قریباً نصف گھنٹہ کے بعد چشمِ فلک نے یہ منظر دیکھا کہ لمبے چوڑے شامیانے کے نیچے سینکڑوں نمازی خشوع و خضوع کے ساتھ امیرِ جماعت کی امامت میں اللہ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ جماعت کے ارکان کے علاوہ دوسرے لوگوں کی شمولیت نے نمازیوں کی تعداد کئی ہزار تک بڑھادی ہے۔ ان نمازیوں میں بعض خدا کے بندے اشراق اور چاشت کی نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور شب میں نماز تہجد ادا کرنے والوں کی تو خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ نماز کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا ذکر و تسبیح کرنے والے بھی ان میں موجود ہیں، مگر یہ نہ ضربیں لگاتے ہیں نہ پاس انفاس کرتے ہیں، اور نہ ان کے ہاتھوں میں ہزار دانے والی تسبیحیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ لوگ اوراد و وظائف اور عباداتِ نافلہ میں سنتِ رسول اور صحابہ کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا مزاج خانقاہی نہیں بننے پایا۔ دوسروں کے نزدیک یہ جماعت اسلامی والوں کی کمزوری ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ خوبی ہے۔"

"مولانا مودودی کی تقریر کی، جلسۂ عام کے نظم وضبط کی اور سالانہ اجلاس کے حسنِ اہتمام کی، سارے شہر میں دھوم ہے۔ سلیقہ اور قرینہ ہو اور بے دینی ہو اس کا کوئی وزن نہیں۔ دینداری ہو مگر ساتھ ہی سلیقہ اور قرینہ نہ ہو، اس سے بھی اس متمدن دور میں دینی طبقہ کی بدنامی ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی کے یہاں دین کے ساتھ سلیقہ، قرینہ اور نظم وضبط کی جو خوبی پائی جاتی ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کے دل کہتے ہیں کہ جو لوگ چھوٹے پیمانے پر نظم وضبط کا اتنا سلیقہ رکھتے ہیں، اگر ان پر ملک وملت کی بڑی ذمہ داریاں آن پڑیں تو وہ ان ذمہ داریوں کو بھی اسی اخلاص اور فرض شناسی کے ساتھ پورا کریں گے (انشاء اللہ العزیز)۔ ———

مری آواز مکّے اور مدینے ہ"۔ [1]

انہی تاثرات کو ماہر القادری صاحب نے شعر کی زبان میں قلمبند کیا ہے۔ اس طویل نظم کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

یہ خیمہ گاہ، یہ طغرے، یہ دفتروں کی قطار
اِک انجمن ہے مگر کتنی سادہ و پُرکار
روش روش سے نمایاں فراستِ مومن
قدم قدم پہ ہے دینی شعور کا اظہار
مجاہدوں کے سے انداز، غازیوں کی سی چال
یہی تو حق و صداقت کے ہیں علمبردار
لیے ہوئے ہیں مہ و کہکشاں جبینوں میں
یہ آفتاب چھپائے ہوئے ہیں سینوں میں

ہدایات

۱۰ نومبر ۱۹۵۱ء کی رات کو سیّد صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں ملکی مسائل پہ سیر حاصل تبصرہ کیا۔ لیاقت علی مرحوم کے قتل پہ اپنے اور جماعت کے دلی رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ شمالی افریقہ، مصر اور ایران کے واقعات کے بارے میں روس اور اینگلو امریکن بلاک دونوں کی مذمت کی اور ملک میں دستور سازی کو چار سال تک ٹالنے پہ تشویش کا اظہار کیا۔ پھر بڑے واضح الفاظ میں کہا ——— "ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی شکل اور روح میں از سرِ نو قائم کیا جائے۔ یہ کام آپ کریں تو ہم آپ کے لیے ایک ادنیٰ چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ لیکن اگر اس کے برعکس کوئی دُوسرا نظام یہاں لانا چاہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہاں کچھ لوگ ہیں کے جتنے موجود ہیں جنہیں چبانے کی کوشش میں دانت

---

[1] چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ۲۲۵ تا ۲۳۰۔

تو ٹوٹ سکتے ہیں مگر وہ چپ نہیں سکتے۔"

سید صاحب کی تقریر کے بعد قیم جماعت طفیل محمد صاحب نے جماعت اسلامی کی سابقہ کارگزاری پڑھ کر سنائی۔ دوسرے روز صبح اجتماع میں مسعود عالم ندوی صاحب کا مقالہ "برِ صغیر ہند و پاک میں اسلامی تحریک کی تاریخ" پڑھا گیا۔ جس کے بعد نعیم صدیقی صاحب نے "اسلامی تحریک اور دوسری تحریکوں کا فرق" کے عنوان پر تقریر کی۔ پھر ندوی صاحب کا مقالہ "دنیائے اسلام کی موجودہ اسلامی تحریکیں" پڑھ کر سنایا گیا۔ نماز مغرب کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے "ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں" کے موضوع پر تقریر کی۔ جس کے بعد سید مودودی صاحب نے اجتماعِ عام میں اختتامی تقریر کی جو "مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

جس وقت کراچی میں جماعت اسلامی کا یہ اجتماع ہو رہا تھا، انہی دنوں صوبہ سرحد میں صوبائی انتخابات ہو رہے تھے، جن کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ اس لیے صوبہ سرحد کے ارکان و متفقین نہ آسکے، اس کے باوجود پورے مغربی پاکستان سے ایک ہزار کے لگ بھگ ارکان و متفقین نے کراچی کے اجتماع میں حصہ لیا۔ ۱۲ اور ۱۳ نومبر کو شرکاء اجتماع کے خصوصی اجلاس تھے۔ کراچی کی جماعت نے اپنے حسنِ انتظام اور سلیقے سے شرکاء کو بہت متاثر کیا، جو چیز اجتماع کے بعد بھی شرکاء کو عرصہ دراز تک یاد رہی، وہ نمائش گاہ تھی اس کا حال بھی محترم ماہر القادری صاحب کی زبان سے سنتے ہیں:

"یہاں نقشوں اور چارٹوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں خلافت کس دور تک رہی اور ملوکیت کا آغاز کب ہوا۔ دنیا میں آج مسلمانوں کی کتنی تعداد ہے، کس کس خطے میں کتنے مسلمان رہتے ہیں، مسلمانوں کی آزاد حکومتیں کہاں قائم ہیں۔ پاکستان میں تحریکِ اسلامی کی رفتار اب تک کیا رہی ہے۔ وہ کون سی برائیاں ہیں جو معاشرے کو تباہ کرتی ہیں۔ وہ کیا کیا اچھائیاں ہیں جن سے معاشرے کو صالح زندگی میسر آتی ہے۔ مسلمان کا کردار کیسا ہونا چاہیئے۔ یہ نمائش نہیں ہے، اسلامی افکار کا دبستان کھلا ہوا ہے، جہاں سے آدمی اسلام کے بارے میں خاص تاثر لے کر رخصت ہوتا ہے اور بڑے سے

بڑے کمیونسٹ اور دہریئے کی پیشانی پر تھوڑی دیر کے لیے پسینہ آجاتا ہے۔ طُغرے، چارٹ، نقشے اور مخطوطے کتنے دیدہ زیب اور حسین ہیں، جن کے دیکھنے سے سچ مچ آنکھوں کو نُور اور دل کو سرور ملتا ہے۔ نمائش کو دیکھنے سے اس کا اندازہ ہوا کہ مردِ مومن کا جمالیاتی ذوق کس قدر پاکیزہ اور لطیف ہوتا ہے۔ نمائش میں تماشائیوں کا خاصا جمگھٹا ہے مگر کس قدر سکون سکوت اور وقار پایا جاتا ہے۔[1]

۱۲ نومبر کی شام چھ بجے سیّد صاحب نے ارکان و حاضرین کے سامنے آخری تقریر کی۔ جو حرفِ آخر قسم کی تقریر تھی اور "ہدایات" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں اصلاح و تربیت کے لیے دل نشین انداز میں بڑی عمدہ باتیں کہیں۔ اسلامی تزکیۂ نفس کے رہنما اصول بتلائے۔ تعلق باللہ قائم کرنے پر زور دیا۔ اس تعلق کو بڑھانے کے طریقے بتائے۔ کہ نہ صرف فرض عبادات ادا کی جائیں بلکہ چھپا کر نفل نماز، نفلی روزے اور انفاق فی سبیل اللہ کریں۔ ذکر الٰہی کرتے ہوئے ان کے معانی کو یاد کرنے کی کوشش کریں۔ فکرِ آخرت کی نشو و نما کے لیے قرآن، حدیث اور سیرت النبی کا مطالعہ مفید ہوتا ہے۔ پھر سیّد صاحب نے اس تقریر میں اجتماعی تنقید کا طریقہ بتلایا۔ بے جا پندار سے بچنے کی نصیحت کی اور کہا کہ جماعت کے مخالفین کے ساتھ تحمل و احترام سے پیش آنا چاہیئے۔

ان ہدایات میں یہ بھی فرمایا "کمال ایک لامتناہی چیز ہے جس کی آخری حد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ پیہم اس کی بلندیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہے اور کسی مقام پر بھی پہنچ کر یہ گمان نہ کرے کہ وہ کامل ہو گیا ہے..... اسلام نے ہمارے سامنے انسانیت کا اتنا بلند معیار رکھا ہے جس کی ابتدائی منزلیں بھی غیر اسلامی مذاہب و ادیان کے معیارِ کمال سے اُونچی ہیں۔ اور یہ کوئی خیالی معیار نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں انبیائے کرام اور اکابر صحابہ اور صلحائے امت کی پاکیزہ زندگیاں اس کی بلندیوں کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ اس معیار کو آپ ہمیشہ نگاہ میں رکھیں۔ یہ آپ کو کاملیت کی غلط فہمی

---

[1] چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر ۲۲۸

سے بچائے گا، اپنی پستی کا احساس دلائے گا، اور ترقی کی کوششوں کے لیے ہر وقت اتنی بلندیاں آپ کے سامنے پیش کرتا رہے گا کہ عمر بھر کی جدّوجہد کے بعد بھی آپ یہی محسوس کریں گے کہ ابھی بہت سی منزلیں چڑھنے کے لیے باقی ہیں۔

فی الواقع ہم نے اب تک اپنے اندر جو خوبیاں پیدا کی ہیں وہ بس اس لیے خوب ہیں کہ ہمارے گردوپیش کا بگاڑ حد سے بڑھا ہوا ہے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ذرا سا دیا بھی جسے روشن کرنے کی توفیق لوگوں کو نصیب ہو گئی، نمایاں نظر آنے لگا۔ ورنہ سچّی بات یہ ہے کہ اسلام کے کم سے کم معیارِ مطلوب کو بھی سامنے رکھ کر جب اپنا جائزہ لیں تو ہر پہلو سے اپنی ذات میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ پس اگر ہم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کریں تو یہ محض ایک انکسار کے طور پر نہ ہو، بلکہ ایک حقیقی اعتراف ہونا چاہیئے اور اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی ایک ایک کوتاہی کو سمجھیں اور اسے دُور کرنے کی کوشش کریں۔"

اور اس کے ساتھ ہی کراچی کا اجتماع ختم ہوا۔

لادینی دستور کی کوشش

سیّد صاحب نے اجتماعِ کراچی میں دستور سازی کو چار سال تک تعویق میں ڈالے رکھنے پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ادھر دستور ساز اسمبلی کے اندرون خانہ کیا ہو رہا تھا؟ اور اتنی قربانیوں کے بعد بنائے ہوئے پاکستان کو اسلام کی طرف لے جانے کے بجائے لادینی مملکت بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی تھیں اس راز کا نقاب ملک عمر حیات صاحب نے اُٹھا یا ہے۔ یہ نیک دل بزرگ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قرار دادِ مقاصد پاس کرنے کے وقت دستور ساز اسمبلی کا کیا حال تھا:

"قرارداد کا خیال آتے ہی ہمارے دستور ساز اراکین تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک وہ جو اس کی حمایت کر رہا تھا، اس کی قیادت علاّمہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کر رہے تھے،

یہ طبقہ بہت منتشر تھا۔ دوسرا گروہ اس کا شدت سے مخالف تھا، اس کی قیادت غلام محمد کے ہاتھ تھی، یہ گروہ کھلم کھلا کہتا تھا کہ پاکستان کا دستور لادینی بنیادوں پر مرتب ہونا چاہیئے۔ تیسرا طبقہ کم ہمتوں اور مصلحت بینوں کا تھا، وہ یہ چاہتا تھا کہ قرارداد کی مخالفت نہ کی جائے لیکن اسے طاقت ور اور مؤثر بھی نہ بننے دیا جائے۔"

پاکستان کا مطلب کیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے نعرے پہ بننے والی مملکت کی دستور ساز اسمبلی پہ اب کیسے لوگوں کا قبضہ تھا، اس کی مثال دیتے ہوئے ملک عمر حیات صاحب نے فرمایا ________ "جب قرارداد مقاصد پہ کمیٹی میں بحث شروع ہوئی تو اعتراض کا سلسلہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم سے شروع ہوا۔ ہم نے بسم اللہ کا انگریزی ترجمہ کیا تھا (In the Name of Allab) تو ایک صاحب نے کہا کہ اللہ کی بجائے (God) آنا چاہیئے ہم نے کہا گاڈ میں خدا کا وہ تصور نہیں آتا جو اسلام نے ہمیں دیا ہے اور جو تقدس اور ہمہ گیری اللہ میں پائی جاتی ہے، وہ گاڈ میں کہاں۔ دوسری طرف ہم سے کہا گیا کہ اللہ کے لکھنے سے غیر مسلم ناراض ہو جائیں گے، عرض کیا گیا ہم نے پاکستان غیر مسلموں کو خوش رکھنے کے لیے نہیں بنایا بلکہ ہم تو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ صرف اسی بات پر کئی گھنٹے بحث ہوئی اور آخر کار دوسرے دونوں گروہوں کو اللہ کا لفظ برداشت کر لینا پڑا[1]"

یہ صورتِ حالات تو قراردادِ مقاصد کے وقت تھی۔ اب یہی غلام محمد پاکستان کا گورنر جنرل تھا۔ جو آہستہ آہستہ اپنے پنجے جما رہا تھا اور شرافت مجسم وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو آہستہ آہستہ غیر مؤثر بنا تا جا رہا تھا۔ ان غلام محمد صاحب کے کیا ارادے تھے؟ وہ ملک کو کس قسم کا دستور دینا چاہتے تھے؟ اور تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کی اُس کی نظروں میں کیا وقعت تھی؟ جس کی صدارت آخر کار سید سلیمان ندوی صاحب نے اگست ۵۲ء میں سنبھال لی تھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:

---

[1] اردو ڈائجسٹ مارچ ۶۷ء

"یہاں پاکستان کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے جو انہوں (سیّد سلیمان ندوی صاحب) نے مصباح الدین عبدالرحمان کے نام خط میں لکھا ——— حکومت کو میرے نام کی ضرورت ہے، کام مطلوب نہیں۔ اور یہ کہ یہاں کا ماحول، مصالحانہ خدمت کے لیے سازگار نہیں بلکہ مخالفانہ جدّوجہد کی ضرورت ہے[1]"

سید سلیمان ندوی صاحب نے حالات کا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ لیکن مخالفانہ جدوجہد کی ضرورت کا احساس انہیں تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے اندر آنے کے بعد ہوا۔ یہ سیّد مودودی صاحب کے تدبر، دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کی دلیل ہے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد کے حالات کو دیکھ کر انہیں یہی احساس ہو گیا تھا کہ یہاں مخالفانہ جدّوجہد کی ضرورت ہے اور پھر وہ صرف یہ احساس کر کے چپ نہیں ہو رہے یا گوشۂ عزلت میں نہیں چلے گئے۔ بلکہ اپنی خداداد تنظیمی صلاحیتوں سے جتنی کچھ بھی طاقت ان کے پاس تھی، اسے پوری فراست سے بروئے کار لائے۔ چار نکاتی مطالبہ پیش کیا، ملک گیر جلسے کیے، رائے عامہ ہموار کی، حتیٰ کہ دستور ساز اسمبلی کو قراردادِ مقاصد پاس کرتے ہی بنی۔

سیّد مودودی صاحب نے لیگی حکومت کے قبل از پاکستان کے دعووں اور وعدوں اور پاکستان بننے کے بعد ان پر عمل کرنے کا جائزہ لیا۔ پھر جس طرح قرارداد مقاصد پاس ہوئی اور لادینی دستور لانے کے لیے سفارشات کی گئیں اور اسلامی دستور کو ٹالنے کے لیے مختلف حیلے بہانے کیے گئے اور اسلامی دستور کو چیلنج کرنے والوں کو ارفع درجات سے نوازا گیا۔ اسے ایک خوبصورت تمثیل سے بیان کیا جس میں افسانے اور تاریخ کو ہم آہنگ کر کے دو آتشہ کر دیا:

"ایک شخص نے اُٹھ کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کیا کہ آؤ، میرے پیچھے چلو، مَیں دین کا جھنڈا بلند کر دوں گا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے ان کے سامنے دُھواں دھار تقریر کی اور پورے زور کے ساتھ اس ارادے کا اظہار کیا کہ

---

[1] ماہنامہ معارف سلیمان نمبر

صدیوں سے دینِ حق کی جو عمارت ویران پڑی ہے اب انشاءاللہ وہ میرے ہاتھوں از سرِنو اپنی اصلی شان میں قائم ہوگی۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا، لوگ انتظار کرنے لگے کہ اب یہ تجدیدِ دین کا مدعی خود آگے بڑھ کر اذان دے گا اور ہمیں مسجد کی طرف لے چلے گا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہؤا۔ آخر لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ حضرت اب دین کے پہلے ستون کو قائم کرنے کا وقت آگیا ہے، حضور صدائے اذان بلند فرمائیں۔ لیکن ہر تقاضے کو وہ ایک کان سُن کر دوسرے کان اڑاتا رہا اور جس نے بہت تنگ کیا اسے طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے ٹال دیا۔ آخر کار جب نماز کا وقت تنگ ہونے لگا تو سارا مجمع چیخ اٹھا۔ ہر طرف سے مطالبہ ہؤا کہ اذان دی جائے۔ مجبور ہو کر بے چارے نے بادلِ ناخواستہ اذان دی۔ مگر زبان کی لُکنت اور لہجے کی ہچکچاہٹ خبر دیتی رہی کہ یہ اذان کس جذبے سے دی جا رہی ہے۔ جوں توں کر کے اذان کا مرحلہ ختم ہؤا۔

لوگ ابھی دعا ہی مانگ رہے تھے کہ داعیٔ دین سیدھا اپنے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ لوگ سمجھے کہ حضرت وضو کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر وہ یکایک سُوٹ اور ہیٹ پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں لیے برآمد ہوئے اور موٹر میں بیٹھ کر سیدھے کلب کی جانب چل پڑے۔ یہ عجیب حرکت دیکھ کر مجمع میں پھر ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ موٹر کے پیچھے دوڑے، کچھ اس کے آگے آن کھڑے ہوئے اور کلب کا راستہ روک لیا، داعیٔ دین نے برافروختہ ہو کر لوگوں کو بہت گالیاں دیں اور چاہا کہ راستہ روکنے والوں کو کچلتا ہؤا آگے بڑھ جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً رک جانا پڑا۔ اب مجمع اصرار کر رہا ہے کہ موٹر مسجد کی طرف چلے اور داعیٔ اسلام صاحب اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ ذرا نکل بھاگنے کا راستہ ملے تو سیدھے کلب کی راہ لیں۔ اس کشمکش کے دوران میں کبھی وہ خود اپنی زبان سے نہیں فرماتے کہ مَیں نماز کا قائل نہیں ہوں، یا مسجد میں جانے کے لیے راضی نہیں ہوں، مگر حال یہ ہے کہ مجمع میں جو دس بیس منافق اِدھر اُدھر بکھرے کھڑے ہیں ان میں سے ہر ایک کو حضرت اس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، جیسے کہ یہی تنکا انہیں ڈوبنے سے بچا لے گا۔

کوئی مسلمانوں میں پھُوٹ ڈالنے کے لیے پکار کر کہتا ہے کہ میاں کس مسجد کی طرف

چلیں ؟ اہلحدیث کی ؟ حنفیوں کی ؟ یا شیعوں کی ؟ ۔ تمہاری کوئی ایک مسجد ہو تو اس کی طرف چلیں ۔ یہ آواز سنتے ہی حضرت داعیٔ اسلام کی جان میں جان آجاتی ہے اور وہ نظریں بچا کر نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف پھینکتے ہیں ۔ کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ کوئی قرآن سے نماز کا طریقہ بتا دے تو میں اسے انعام دوں ۔ داعیٔ اسلام صاحب فوراً اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور داد بھرے لہجے میں فرماتے ہیں کہ حضرت آپ جیسا قیمتی آدمی وہاں کہاں کھڑا ہے ۔ آیئے میری موٹر میں تشریف رکھیے ۔ اس طرح یہ تجدید دین کا نیک ارادہ رکھنے والے بزرگ ہر طرف سے منافقین کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں تاکہ ان کا بھی ایک جتھہ بن جائے اور اس کی مدد سے موٹر کو کلب کی طرف لے بھاگنے کا موقع مل جائے ۔ لیکن یہ تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ اگر یہ سب جمع بھی ہو جائیں تو مجمع عام کے مقابلے میں کچھ نہیں بنا سکتے ۔[1]"

تمثیل دینے کے بعد واضح الفاظ میں لیگی حکومت کی لادینی دستور لانے کی کوشش کا ذکر کیا ——— " زبان سے وہ اسلام ہی اسلام پکارتی رہی ہے ۔ مگر عملاً اس نے ملک بھر سے چن چن کر منافقوں کو اکٹھا کیا ہے ۔ تاکہ وہ اسلام اور اس کے دستور اور قانون کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائیں ۔ روپے دے دے کر دینی حکومت کے خلاف اور لادینی حکومت کے حق میں مضامین لکھوائے ہیں ۔ ہر اس شخص کی پیٹھ ٹھونکی ہے جو مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو ابھار ابھار کر سامنے لاتے اور اسلامی ریاست کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکاتے ۔ پرانے پرانے بدنام کمیونسٹوں تک کو اس نے اسلام کے خلاف استعمال کرنے میں باک نہیں کیا ہے ۔ جس شخص کو بھی اس کے دربار میں اعزاز حاصل کرنا ہوتا ہے وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اٹھ کر اسلامی دستور کے مطالبے کو چیلنج کر دیتا ہے اور اس کے چند ہی روز بعد ہم سنتے ہیں کہ اسے کوئی بڑی تنخواہ یا کوئی اونچی کرسی پیش کر دی گئی ہے ۔"

---

[1] ترجمان القرآن اکتوبر ۵۲ء

مطالبۂ دستورِ اسلامی

سید مودودی صاحب ان حالات میں خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ اگر حکومت لادینی دستور لانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہی تھی تو یہ بھی رائے عامہ کو منظم کر رہے تھے۔ مخالفوں کے دلائل کا مسکت جواب دے رہے تھے اور اسلامی دستور کے مطالبہ کو ہمہ گیر کر کے عوامی دباؤ مہیا کر رہے تھے، جس کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔ انہوں نے ۵ مئی ۵۲ء کو آرام باغ کراچی میں ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا۔ حکومت پر زور دیا کہ دستور کے بارے میں اب مزید ٹال مٹول سے کام نہ لے۔ ۵۲ء ختم ہونے سے پہلے پہلے دستور بنا دے اور اس دستور کی بنیاد لازماً وہ ۲۲۔ اصول ہونے چاہئیں جو علمائے امت نے طے کر دیئے ہیں۔ پھر سید صاحب نے ۲۲۔ اصولوں کو مختصر کر کے آٹھ نکات میں سمو دیا تاکہ عام انسان اسے آسانی سے سمجھ سکے۔

اس تقریر کے ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کے ہزاروں کارکن حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے گاؤں گاؤں، قریہ قریہ پہنچ کر در و دیوار پہ جگہ جگہ "ہمارا مطالبہ اسلامی دستور" کے الفاظ نمایاں کر کے لکھ دیئے۔ جماعت اسلامی نے لاکھوں کی تعداد میں پوسٹ کارڈ چھپوائے جن میں آٹھ نکاتی مطالبہ شائع کیا ہوا تھا، اسے لوگوں میں وسیع پیمانے پہ پھیلا دیا گیا۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ خریدتے، دستخط کر کے صدر مجلسِ دستور ساز اسمبلی اور وزیر اعظم پاکستان کو ارسال کر دیتے۔ جماعت اسلامی جگہ جگہ جلسے کرتی، آٹھ نکاتی مطالبے کی ضرورت اور اہمیت بیان کرتی، لوگوں کے سامنے محضر نامہ پیش کیا جاتا، جن کے اوپر آٹھ نکاتی مطالبہ شائع ہوتا اور نیچے لوگوں کے دستخطوں کے لیے لمبی جگہ ہوتی، لوگ دستخط کر دیتے۔ ادھر لوگ، نمازِ جمعہ پڑھ کر باہر نکلتے، ادھر جماعتِ اسلامی کے ارکان اور کارکنان محضر نامے لے کر ان کے سامنے جا پہنچتے، لوگ بخوشی دستخط کرتے اور رکھتے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا لیکن حیرت اور افسوس ہے کہ اپنے ہی مسلمان حاکموں سے اسلامی دستور کا مطالبہ کرنا پڑ رہا ہے اور اس کے لیے عوامی دباؤ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

جماعت اسلامی نے ان محضر ناموں کو جوڑ جوڑ کر میلوں لمبا ایک محضر نامہ (Scroll) بنایا۔ جسے دستور ساز اسمبلی کو بھیجا گیا۔ اس نے جہاں عوام کو اسلامی دستور کا شعور دلایا اور انہیں اس مطالبے پر کمربستہ کیا وہیں حکمرانوں کو بھی جھنجھوڑا۔ آٹھ نکاتی مطالبہ کے پوسٹ کارڈ گھر گھر پہنچ گئے اور اسلامی دستور، اخبارات اور عوامی گفتگوؤں کا موضوع بن گیا۔ آپ جس شہر اور گاؤں میں ان دنوں جاتے، درودیوار پہ جلی حروف میں "اسلامی دستور بناؤ" کے الفاظ لکھے ہوئے پاتے۔ لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں دستور ساز اسمبلی کو تار بھیجے کہ ہمیں صرف اسلامی دستور ہی قابلِ قبول ہوگا۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماعات، جلسہ ہائے عام اور خاموش جلوس لادینی گروپ کے لیے مخالفانہ جدوجہد کا عملی مظہر تھے۔

سندھ کے ایک وکیل نے اخبارات میں یہ بیان چھپوا کر گویا علماء کے محاذ پر توپ داغ دی تھی کہ وہ اس شخص کو پانچ ہزار روپے انعام دیں گے جو ثابت کرے گا کہ قرآن میں اسلامی دستور ہے۔ لیگی حکومت نے اسے کے برو ہی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دنوں میں مرکزی حکومت میں وزیر قانون بنا دیا۔ سید مودودی صاحب "اسلامی دستور کی بنیادیں" لکھ چکے تھے۔ اب انہوں نے اس چیلنج کا جواب دیا اور کہا کہ اسلامی دستور برطانوی دستور کی طرح تحریری شکل میں نہیں ہے۔ برطانوی دستور کو کسی دستور ساز اسمبلی نے بیٹھ کر مرتب نہیں کیا ہے۔ برطانوی دستور کی بنیادیں اس کی روایات، اسمبلی کے قوانین اور فیصلے اور عدالتی فیصلے ہیں اور غیر تحریری دستور دنیا میں کوئی انوکھی اور نرالی چیز نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی تک دنیا کی ساری حکومتوں کے نظام غیر تحریری دستوروں پہ چلتے رہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست کا دستور بھی مرتب، مدوّن اور تحریری شکل میں موجود نہیں۔ اب اگر ہم اسے تحریری صورت میں مرتب کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید، سنتِ رسول، خلافتِ راشدہ کے تعامل اور مجتہدینِ امت کے فیصلوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ سید صاحب نے "اسلامی دستور کی بنیادیں" میں چوبیس قرآنی آیات اور اٹھائیس احادیث سے اسلامی دستور کے بنیادی اصول واضح کیے۔

پھر سید صاحب نے ۲۴ نومبر ۵۲ء کو بار ایسوسی ایشن کراچی کے صدر کی دعوت پر ایک اجتماع میں مفصل تقریر سے اس چیلنج کا جواب دیا۔ یہ تقریر "اسلامی دستور کی تدوین" کے

نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلامی دستور کے مآخذ کیا ہیں۔ اس تحریر کو دستور میں لانے کی راہ میں کون سی مشکلات ہیں اور انہیں کیسے دُور کیا جا سکتا ہے۔ پھر بتایا کہ اسلامی دستور کی رُو سے حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ریاست کے حدود عمل کیا ہیں؟ ریاست کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ اور نظامِ حکومت چلانے والوں میں کیا صفات ضروری ہیں۔ اس عالمانہ تقریر کے مطالعہ سے ہر غیر جانب دار قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ سید صاحب کو نہ صرف اسلامی علوم پہ گہری بصیرت حاصل ہے بلکہ وہ جدید علوم اور عصرِ حاضر کی تاریخ سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہیں اور وہ خیالات کی دنیا میں رہنے والے مفکر ہی نہیں بلکہ عملی انسان بھی ہیں، جنہیں نہ صرف اپنی منزل کا واضح طور پر علم ہے بلکہ انہیں راستے کی مشکلات کا بھی پُورا پُورا اندازہ ہے۔

چوہدری غلام محمد صاحب مرحوم و مغفور نے جنہیں سندھ کراچی میں جماعت اسلامی کا بانی کہنا بجا ہو گا، بروہی صاحب سے تعلق پیدا کیا۔ پھر جب بروہی صاحب نے اسلام کا اس نئے زاویہ سے مطالعہ کیا کہ یہ تو پورا نظامِ زندگی ہے اور قرآن و سنّت سے، با سیاست کے لیے بھی اصول ملتے ہیں تو چونکہ وہ اہلِ علم تھے، پیشہ ور سیاست دان نہیں تھے، اس لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ پوری فراخدلی سے صداقت کو قبول کر لیا بلکہ اسی شخص نے جو کل اسلامی دستور کے ثبوت کے لیے پانچ ہزار روپے کا اعلان کر رہا تھا، وزیر قانون کی حیثیت سے ۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی میں دستور کی اسلامی دفعات پیش کیں۔ ۶۴ء میں جماعت اسلامی کے اکابر کو اور جنوری ۶۷ء میں سید مودودی صاحب کو ایوب شاہی نے گرفتار کیا تو دونوں مرتبہ بروہی صاحب نے ان کے مقدمے کی پیروی کی اور ۳۰ جنوری ۷۰ء کو چوہدری غلام محمد صاحب نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو بروہی صاحب کی آنکھیں مرحوم کیلیے اشکبار تھیں۔

اور اب بروہی صاحب کے دل میں سید مودودی صاحب کے لیے کیا جذبات ہیں؟ اس کا اندازہ اس تقریر کے آخری حصہ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۲۸ نومبر ۶۴ء کو ڈھاکہ کے شاہ باغ ہوٹل کے استقبالیہ میں کی اور کہا ——— "میں جماعت اسلامی کا رکن نہیں ہوں مگر اس کے باوجود مجھے مولانا مودودی سے زبردست عقیدت ہے۔ انہوں نے اس

ملک میں وہ کام کیا ہے جو اب تک یہاں کوئی پارٹی نہیں کر سکی تھی۔ انہوں نے ایسے کارکنوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے جو صرف اصولوں کی خاطر کام کرتی ہے۔ بے غرض ہے اور اخلاقی اصولوں کی زبردست پابند ہے۔ اس کے سامنے ظاہری فتح و شکست کے مقابلے میں اصولوں کی پیروی زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے لیے پوری قوم کو مولانا مودودی کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ میری نظر میں مولانا کی یہی زبردست کامیابی ہے اور ان کی عظیم الشان فتح۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ آج اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا دس ہزار سال بعد۔ قوم کے لیے جس متاع کی ضرورت تھی وہ مولانا مودودی نے اسے فراہم کر دی ہے۔"

۲۱ر نومبر کا مظاہرہ کراچی

حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ۲۲ر نومبر ۵۲ء کو دستوری سفارشات پیش کر رہی ہے تو جماعت اسلامی نے پورے پاکستان میں اس سے پیشتر ہفتۂ دستور منایا۔ سید مودودی جانتے تھے کہ دستور ساز اسمبلی اونچا سنتی ہے اور جب تک ہزاروں لاکھوں افراد مل کر مطالبہ نہ کریں اور عوامی دباؤ نہ ڈالیں، اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اس لیے اعلان کردہ روز سے ایک دن پہلے، ۲۱ر نومبر ۵۲ء کو جماعت اسلامی نے کراچی میں اسلامی دستور کے حق میں ایک عظیم الشان اور فقید المثال جلوس نکالا۔ اس مظاہرے کی تیاری کئی روز سے ہو رہی تھی۔ جماعت اسلامی کی دستوری مطالبے کی مہم پورے جوبن پر تھی۔ کراچی میں جو مظاہرہ ہوا وہ گویا اس مہم کا نقطۂ عروج تھا۔

دستور ساز اسمبلی کے عین سر پر یعنی کراچی میں جو جلوس نکالا گیا، وہ اس لحاظ سے واقعی فقید المثال تھا کہ اس میں لوگ قطاروں میں، پورے نظم و ضبط اور سکون و وقار کے ساتھ چل رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے کتبے اُٹھائے ہوئے تھے، جن پر ایسے ماٹو لکھے ہوئے تھے" اسلامی دستور بناؤ ——— ہمارا مطالبہ اسلامی دستور ——— پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ ——— ۵۲ء ختم ہونے سے پہلے دستور بناؤ"۔ آپ

بندر روڈ پر واقع کسی تیسری منزل والے مکان سے دیکھتے تو آپ کو دُور تک ایک لانبا جلوس نظر آتا، جس میں دسیوں ہزار افراد شامل تھے، کلغیوں کی ایک فصل اُگی نظر آتی، ان لوگوں میں سے بیشتر کوٹ پتلون یا شیروانی شلوار پہنے نظر آتے۔ اور نوجوانوں اور صحت مند چہروں پر بھی داڑھیاں نظر آتیں۔ ایسا منظر کسی ایسے ملک میں تو متوقع تھا جہاں کی آبادی سو فیصدی تعلیم یافتہ ہو، لیکن پاکستان میں یہ واقعی نقید المثال تھا۔ اس لحاظ سے بھی، کہ لوگوں میں جلوس کے باوجود جوش کی بجائے ہوش کارفرما تھا۔ پھر یہاں کوئی زندہ باد اور مردہ باد نہیں تھا۔ کوئی اپنی لائن سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا، اس کے ڈسپلن پر عوامی جلوس کی بجائے فوجیوں کی پریڈ کا گمان ہوتا تھا۔

پھر یہ اس لحاظ سے بھی نقید المثال جلوس تھا کہ اس بارات کا دولہا یعنی سیّد مودودی صاحب کسی چمکتی، کشتی کی طرح لمبی اور سبک کیڈلک کار میں نقرئی اور طلائی ہار پہنے نہیں کھڑے تھے، اور مسکراتے ہوئے شانِ بے نیازی سے لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے نہیں گزر رہے تھے، بلکہ وہ فٹ پاتھ پہ ایک طرف اپنے رفیقوں کے درمیان کھڑے گزرتے ہوئے جلوس سے مطمئن نظر آتے تھے۔ جیسے وہ بھی اپنے آپ کو اس کارواں کا راہی سمجھتے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ اور ممتاز نہ سمجھتے ہوں۔ بس وہ اتنا سا ہٹ کر آگے کھڑے تھے جیسے نمازی اپنے درمیان میں سے ایک کو تھوڑا سا آگے کرکے امامت کے لیے کھڑا کر دیتے ہیں۔ لیکن سبھی جانتے تھے جلوس والے بھی، اور جلوس کے وقار اور تاثر سے مسحور ہونے والے لاکھوں باشندگان کراچی بھی جانتے تھے کہ اس عظیم الشان مظاہرے کے پیچھے اسی انسان کا ذہن کام کر رہا ہے جو مفکرِ اسلام ہے، جو جدید علوم پہ سب سے بڑھ کر دسترس رکھتا ہے، جو منفرد ریاست دان ہے، جس کے افکار نے عالمِ اسلام کے کروڑوں فرزندانِ توحید کے سینوں میں احیائے اسلام کی تڑپ پیدا کر دی ہے، جس کے ذہنی مرید لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور جس نے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کا نصب العین بدل کر اور انہیں منظم کرکے ایک قوت بنا دیا ہے اور جس کی مٹھی بھر جماعت سے ایوانِ حکومت کے کنگرے

لرزتے رہے ہیں۔

اور ۲۱، ۲۲ نومبر ۵۲ء کی درمیانی رات کو یہ کنگرے بہت بُری طرح لرزے۔ پاکستان کے پہلے دارالحکومت کراچی نے ۲۱ نومبر کو ایسا بھرپور مظاہرہ دیکھا تھا کہ مسلم لیگی حکومت بوکھلا گئی کہ اگر اگلے ہی روز ہم نے یہاں لادینی دستور کے اصول پیش کر دیئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ناظم الدین صاحب ویسے بھی شریف الطبع انسان تھے۔ لادینی دستور کے بڑے بڑے حامیوں اور طُرّے بازوں تک کی ہمت ٹوٹ گئی اور اگلے روز اعلان ہو گیا کہ دستوری سفارشات میں معمولی ردّوبدل کا کام رہ گیا ہے اسے مکمل کرنے کے بعد دستور کو پیش کر دیا جائے گا۔

یہ عوامی دباؤ کی بہت بڑی فتح تھی!

اور اس کے ساتھ ساتھ لادینی دستور کو مملکتِ پاکستان پہ چپکانے والے گروہ کی بہت بڑی ہزیمت تھی۔ جس کے بعد انہیں آج تک پاکستان میں لادینی دستور کو لانے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ اگرچہ اس گروہ کی نیتیں ہمیشہ ہی آشکارا ہوتی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعد ازیں بھی سابق چیف جسٹس جناب منیر صاحب قائداعظم کا واسطہ دے کر سیکولر دستور کی دہائی دیتے رہے ہیں[1] تاہم یہ نہیں بھولا جا سکتا کہ جماعتِ اسلامی اور سیّد مودودی کا مہیا کیا ہوا یہ عوامی دباؤ نہ ہوتا، تو یہ لوگ قراردادِ مقاصد کے باوجود یہاں اسی وقت ایک لادینی دستور لے آتے۔ کیونکہ اس بات کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ قراردادِ مقاصد دستور کا دیباچہ تو ہے، اس کا ایک لازمی حصّہ نہیں ہے اور یہیں ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ اگر جماعت اسلامی عملی سیاست میں حصّہ نہ لیتی یا سیّد مودودی اور جماعتِ اسلامی پاکستان میں نہ ہوتے تو کیا باقی تمام علماء کا غیر منظم طبقہ حکومت کو اسلامی دستور پہ مجبور کر سکتا تھا؟ اور ہزاروں عصمتوں اور لاکھوں جانوں کی قربانی سے بنائے ہوئے پاکستان کو لادینی کی منزل پہ گامزن ہونے سے روکا جا سکتا تھا؟

سیّد مودودی صاحب نے دستوری جدوجہد کے بارے میں ایک تقریر میں کہا کہ جب،

---

[1] پاکستان ٹائمز ۱۳ اکتوبر ۷۶ء، ۲۳ فروری ۷۰ء وغیرہ۔

اسلامی دستور کی ــــــــ " آواز یک لخت سارے ملک سے اٹھنی شروع ہوئی۔ تب اربابِ اقتدار کے ہاتھ پاؤں پھولے اور آخری مرتبہ انہوں نے یہ کوشش بھی کر ڈالی کہ کچھ علماء ایسے ان کے ہاتھ آجائیں جو ان کے ساتھ اتفاق کر کے سفارشات پر دستخط کر دیں۔ تاکہ وہ انہیں اسلامی سفارشات کے طور پر پیش کر دیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس ملک میں ایک عالمِ دین بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوا کہ جو چیز اربابِ اقتدار نے مرتب کی تھی اس پر دستخط کرتا۔ آخر کار جب اس طرف سے مایوس ہو گئے تو ۲۲ نومبر ۵۲ء کو دستوری سفارشات پیش کرنے کے بجائے انہوں نے اعلان کر دیا کہ کچھ وجوہ کی بنا پر ابھی انہیں پیش نہیں کیا جائے گا اور انہیں دوبارہ مرتب کیا جائے گا۔ چنانچہ اس ایک مہینے کے اندر پوری سفارشات کے اندر بہت کچھ ردّ و بدل کیا گیا اور پھر انہیں ۲۲ دسمبر کو پیش کیا گیا۔"

گرفتاری

۲۲ دسمبر ۵۲ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں دستوری سفارشات پیش ہوئیں تو جن علمائے کرام نے دو سال قبل کراچی میں اسلامی ریاست کے بنیادی ۲۲۔ اصول طے کیے تھے، انہوں نے آپس میں طے کیا کہ وہ ان دستوری سفارشات کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے اور نہ ہی کوئی بیان دیں گے۔ اس کی بجائے دوبارہ انہی علماء کا اجتماع کراچی میں ہوا اور ۱۱ جنوری ۵۳ء سے ۱۸ جنوری تک اس اجتماع کے نو اجلاس ہوئے۔ ایک ایک شق کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ان پر تبصرہ کیا گیا اور مدلّل ترمیمات پیش کی گئیں۔ اس میں نہ صرف مذہبی مسائل زیرِ بحث آئے بلکہ دونوں بازوؤں کی مساوات، زبان، حبسِ امتناعی، فوجی عدالتیں اور نظامِ انتخاب وغیرہ پر بھی محبِ وطن پاکستانی کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی۔

چنانچہ ۲۰ جنوری ۵۳ء کو سیّد مودودی صاحب نے لاہور میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے تقریر کی جس میں دستوری سفارشات پر علماء کی تجاویز و ترمیمات کی تشریح کی۔ سیّد صاحب نے کہا "آپ نے بالاتفاق جو دباؤ ڈالا تھا اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان زبانوں پر وہ چیزیں آئی ہیں جن کا اقرار کرنے کے لیے پہلے یہ زبانیں خوشی سے کبھی تیار نہیں

تھیں۔"

پھر علماء کی ترمیمات کی تشریح کرتے ہوئے کہا ——— "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ان لوگوں نے یہاں تک تجویز کر دیا کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون بننے نہ پائے اور جب انہوں نے یہ بھی تجویز کر دیا کہ صدر ریاست مسلمان ہوگا اور جب انہوں نے حلف نامہ میں یہ شق بھی رکھ دی ہے کہ پبلک اور پرائیویٹ زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی جائے، یہ سب کچھ اقرار کر لینے کے بعد آخر اس کو اسلامی جمہوریہ کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے۔ کیوں نہ اس کا نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان رکھا جائے تاکہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ یہ حکومت اسلام کے اصولوں پر قائم ہے۔"

دستوری سفارشات میں کہا گیا تھا کہ جہاں تک مالی مسودات کا تعلق ہے ان پر یہ دفعہ نافذ نہیں ہوگی کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ سید صاحب نے کہا ——— "ان کی رائے میں معاذ اللہ خدا اور اس کے رسول مالیات کی سمجھ نہیں رکھتے اور دوسرے تمام معاملات مثلاً نکاح، طلاق، خلع، دیوانی، فوجداری وغیرہ میں تو ہم ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ معاذ اللہ وہ مالی معاملات کو نہیں سمجھتے، اس وجہ سے مالی معاملات کی حد تک ہم ان کی نہیں سُنیں گے .... اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے دستور میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بے اعتمادی کا ووٹ پاس کر رہے ہیں کہ وہ مالی معاملات میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ چیز اس کے اندر رہ گئی تو چاہے دوسری تمام چیزیں مان لی جائیں ہمارے نزدیک یہ رپورٹ ماننے کے قابل نہیں ہوگی۔ یہ یقیناً اُٹھا کر پھینک دی جائے گی کیونکہ یہ صریح کُفر ہے۔"

سیّد مودودی صاحب اس وقت قوم کو دستور اور دستوری مسائل کی طرف توجہ دلا رہے تھے حالانکہ قوم کا موڈ اس وقت ان باتوں کے سُننے کا نہیں رہا تھا۔ اس وقت تک اخبارات اور سٹیج سے قوم کے جذبات کو خوب گرما دیا گیا تھا اور پوری قوم بیک آواز ہو کر کہہ رہی تھی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ پورے پنجاب میں جلسے، جلوس، نعروں، تقریروں، اجتماعات اور مظاہروں وغیرہ کی ہمہ قسم کی سرگرمیاں اسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

سیّد صاحب نے "قادیانی مسئلہ" نامی کتاب لکھ کر حکومتِ وقت کو اس مسئلے کو معقولیت

سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ کتاب، دو ماہ کے اندر اندر ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئی اور یہی ننھی سی کتاب تھی جس کا بہانہ بنا کر سید صاحب کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔ سید صاحب نے اپنے آٹھ نکاتی دستوری مطالبے میں نویں نکتے کا اضافہ بھی کر دیا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے تاکہ تحریک ختم نبوت پُرامن رہتے ہوئے نتیجہ خیز ثابت ہو۔ دوسرے قوم کی توجہ اسلامی دستور سے نہ ہٹ سکے اور اسلامی قوتیں دو محاذوں پہ بٹ کر کمزور نہ ہو جائیں۔ لیکن اس سے صورتِ حال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ملک کے حالات پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔

سید صاحب نے اپنی ۳۰ جنوری ۵۳ء والی تقریر میں عوام و خواص کے جذبات کو حکومت تک پہنچانے کے لیے کہا کہ ہماری حکومت کا حال ـــــــ "انگریز کا سا ہے جسے ہندو مسلم مسئلے کی موجودگی کا اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک سارے ملک میں آگ نہ لگ گئی۔ اس طرح یہ لوگ بھی آگ لگنے کے منتظر ہیں۔ اس سے پہلے یہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس سے قادیانی مسئلہ حل ہو۔ ہم ان سے کہہ رہے ہیں اور آج سے بیس برس پہلے علامہ اقبال مرحوم بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ ان لوگوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیدیا جائے۔"

اور اسی تقریر میں سید صاحب کے یہ الفاظ حالات کے صحیح تجزیے پر ان کی قدرت، ان کی معاملہ فہمی اور بصیرت پہ دلالت کرتے ہیں اور یہ پیشین گوئی صرف ایک ماہ چھ دن بعد ہی پوری ثابت ہوئی ـــــــ "میرا یہ اندازہ ہے اور دوسرے لوگ بھی جو حالات کو براہِ راست جانتے ہیں اس امر کا سخت اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال یونہی جاری رہی اور جلدی اس کا تدارک نہ کیا گیا تو یقیناً اس ملک میں قادیانی مسلم فسادات شروع ہو جائیں گے۔"

پنجاب کی حکومت نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کے بجائے خاموش تماشائی بننا پسند کیا۔ اس کا خیال تھا کہ آتش فشاں تیار ہو جائے گا تو اس کا دہانہ کراچی میں مرکزی حکومت کے سر پہ پھٹے گا۔ لیکن مرکزی حکومت نے تحریکِ ختمِ نبوت کے سرکردہ لیڈروں کو ۲۶ فروری ۵۳ء کو کراچی میں گرفتار کر لیا تو آتش فشاں پنجاب میں پھٹ پڑا اور ۶ مارچ کو لاہور پہ جنرل اعظم خاں کے مارشل لاء اور بےشمار فرزندانِ توحید کی قربانی کے بعد ملک کے دس کروڑ انسانوں کے ہونٹ سِل گئے۔

اس خوف و ہراس کی فضا میں لادینی دستور کے سرخیل اور پاکستان کے اوّلین ڈکٹیٹر غلام محمد کو یاد آیا کہ لادینی دستور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سیّد مودودی کی ذات ہے۔ اب سے بہتر کوئی وقت نہیں ہوگا کہ اس کانٹے کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ وہ صبح طلوع ہوئی جس کا پہلے باب میں تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ اور پھانسی کی سزا سنانے اور پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچانے کے لیے

۲۸ مارچ ۵۳ء کی صبح منہ اندھیرے سید مودودی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا!

کتابیات

الف : سیّد مودودی صاحب کی کُتب

۱۔ جماعت اِسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل

۲۔ تحریکِ اِسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل

۳۔ الجہاد فی الاسلام

۴۔ تفہیم القرآن

۵۔ تجدید و احیائے دین

۶۔ تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

۷۔ مسئلۂ قومیت

۸۔ پردہ

۹۔ اسلام اور ضبطِ ولادت

۱۰۔ تنقیحات

۱۱۔ تفہیمات حصّہ اوّل تا سوم

۱۲۔ رسائل و مسائل حصّہ اوّل تا چہارم

۱۳۔ خطبات

۱۴۔ اسلامی قانون اور اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

۱۵۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات

۱۶۔ سُود

۱۷- ہدایات

۱۸- تعلیمات

۱۹- اسلام کا سرچشمۂ قوت

ب: دیگر اُردو کتب

۱- رُوداد جماعت اسلامی حصّہ اوّل تا پنجم

۲- چراغِ راہ تحریکِ اسلامی نمبر اکتوبر ۶۳ء

۳- چراغِ راہ احتجاج نمبر اکتوبر ۵۳ء

۴- چراغِ راہ شمارہ جنوری ۶۴ء

۵- محمد یوسف: مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں

۶- نعیم صدیقی: مولانا مودودی ایک تعارف

۷- علی سفیان آفاقی: ابُوالاعلیٰ مودودی

۸- اسعد گیلانی: چوہدری علی احمد خاں

۹- پروفیسر خورشید احمد: تذکرۂ زنداں

۱۰- محمد عاصم: سفرنامہ ارض القرآن

۱۱- محمد سرور: مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی

۱۲- ڈاکٹر اسرار احمد: تحریک جماعت اسلامی، ایک تنقیدی مطالعہ

۱۳- رئیس احمد جعفری: علی برادران

۱۴- رئیس احمد جعفری: قائداعظم محمد علی جناح

۱۵- رئیس احمد جعفری: دید و شُنید

۱۶- غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید

۱۷- مولوی عبدالحق: سرسیّد احمد خاں

۱۸- شورش کاشمیری: چہرے

۱۹۔ مولانا ظفر احمد انصاری: تحریکِ پاکستان اور علماء
۲۰۔ رُوداد اجتماع ۶۳ء
۲۱۔ مولانا مودُودی کی گرفتاری کیوں؟
۲۲۔ حکیم محمد شریف: مکاتیبِ زنداں
۲۳۔ منشور جماعت اسلامی
۲۴۔ کرنل الٰہی بخش: قائداعظم کے آخری ایام
۲۵۔ سیّد حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا
۲۶۔ عاشق حسین بٹالوی: ہماری قومی جدّوجہد ۳۸ء
۲۷۔ ایم اے ملک: ہاتھ کی زبان
۲۸۔ شبلی نعمانی: الفاروق
۲۹۔ اسعد گیلانی: مولانا مودودی سے ملیئے۔
۳۰۔ منشی عبدالرحمان خاں: تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی
۳۱۔ عاصم نعمانی: مقامِ صحابہ
۳۲۔ عاصم نعمانی: مولانا مودودی پر جھوٹے الزامات

ج:۔ رسائل و جرائد

۱۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور
۲۔ روزنامہ تسنیم لاہور
۳۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور
۴۔ ہفت روزہ آئین لاہور
۵۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور
۶۔ ہفت روزہ چٹان لاہور
۷۔ ہفت روزہ جہانِ نو کراچی

۸۔ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۹۔ ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

۱۰۔ ماہنامہ تجلّی دیوبند

۱۱۔ ماہنامہ سیّارہ لاہور

۱۲۔ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور

۱۳۔ ماہنامہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر

۱۴۔ ماہنامہ معارف سلیمان نمبر

ENGLISH BOOKS

1. Leonard Binder: "Religion and Politics in Pakistan"
2. "History of Freedom Movement."
3. Misbah-ul-Islam Farooqi: "Introducing Maududi"
4. Ian Stefen: "Pakistan Young Nation, Old Country".
5. Hector Bolitho: "Jinnah"